اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد 19

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

تفسیر نمونہ

جلد ۱۹

پارہ ـــــــــ ۲۳

سورۂ صافات کے آغاز سے

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوئی ـــــــــ

ـــــــــ اسکی ۱۸۲ آیات ہیں

آغاز ـــــــــ

جمعۃ المبارک

یکم رمضان المبارک ۱۴۰۴ ہجری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُورۂ صافات کے مطالب

یہ سُورہ بھی چونکہ مکی سورتوں میں سے ہے لہٰذا مکی سورتوں کی تمام صفات اس میں موجود ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ مبدأ و معاد کے اسلامی عقائد و معارف کو بیان کیا گیا ہے۔ قاطع تعبیرات اور مختصر و زوردار آیات کے ذریعے مشرکین کو سرزنش کی گئی ہے۔ نیز واضح اور روشن دلائل کے ذریعے ان کے عقائد کا بطلان ظاہر کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر اس سورہ کے مطالب کا پانچ حصّوں میں خلاصہ ہوتا ہے:۔

پہلا حصّہ: خدا کے فرشتوں کے مختلف گروہوں کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور ان کے مقابلے میں سرکش شیطانوں کے گروہوں اور ان کے انجام کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا حصّہ: کافروں، نبوّت و معاد کے بارے میں ان کے انکار اور قیامت میں ان کے انجام کو بیان کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ مربوط قیامت میں ان کی آپس کی بحث اور گناہ کو ایک دوسرے کی گردن میں ڈالنے اور ان سب کے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں بہشت کی بڑی بڑی نعمتوں اور بہشتیوں کے لیے خوشیوں، لذّتوں اور زیبائیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا حصّہ: بزرگ انبیاء مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت الیاسؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت یونسؑ کی تاریخ کے ایک حصّے کو مختصر اور مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اسی میں بُت شکن بہادر پیرو ابراہیمؑ کے بارے میں بحث اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اصلی مقصد یہ ہے کہ گزشتہ بیانات اور انبیاء کی تاریخ کے عینی شواہد کچھ محسوس و ملموس صورت میں بیان کیے جائیں اور کلی عقلی حقائق محسوس قالب میں مجسم ہو جائیں۔

چوتھا حصّہ: شرک کی ایک بدترین قسم کا ذکر ہے۔ یعنی جنّوں اور خدا یا فرشتوں اور خدا کے درمیان رشتہ داری کا اعتقاد۔ مختصر جملوں میں اس بے ہودہ عقیدے کی اس طرح دھجیاں بکھیری گئی ہیں کہ اس کی معمولی سی قدر و قیمت بھی باقی نہیں رہتی۔

پانچواں حصّہ: یہ اس سورہ کا آخری حصّہ ہے۔ چند مختصر آیات ہیں۔ لشکرِ حق کی کفر و شرک و نفاق کے لشکر پر فتح و پیروزی کا ذکر ہے۔ اہلِ شرک و نفاق کے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے کا تذکرہ ہے۔ ان نارَوا نسبتوں سے، جو مشرکین پروردگار کے بارے دیتے ہیں، تنزیہ و تقدیس بیان کی گئی ہے اور سُورہ پروردگار کی حمد و ستائش کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

❖ ❖ ❖

سورۂ صافات کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے:

من قرأ سورۃ صافات اعطی من الاجر عشر حسنات، بعدد کل جن وشیطان، وتباعدت عنہ مردۃ الشیاطین وبرء من الشرک، وشھد لہ حافظاہ یوم القیامۃ انہ کان مؤمنا بالمرسلین

جو شخص سورۂ صافات کو پڑھے اسے تمام جنوں اور شیطانوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں دی جاتی ہیں اور سرکش شیطان اس سے دُور رہتے ہیں اور وہ شرک سے پاک رہتا ہے اور وہ دونوں فرشتے جو اس کی حفاظت پر مامور ہیں قیامت میں اس کے لیے گواہی دیں گے کہ یہ خدا کے رسولوں پر ایمان رکھتا تھا۔[1]

ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے اس طرح منقول ہے:

من قرأ سورۃ صافات فی کل جمعۃ لم یزل محفوظا من کل آفۃ، مدفوعا عنہ کل بلیۃ فی حیاتہ الدنیا، مرزوقا فی الدنیا باوسع مایکون من الرزق ولم یصبہ اللہ فی مالہ ولا ولدہ ولا بدنہ بسوء من شیطان رجیم، ولا جبار عنید، وان مات فی یومہ او لیلتہ بعثہ اللہ شھیدا، واماتہ شھیدا، وادخلہ الجنۃ مع الشھداء فی درجۃ من الجنۃ

جو شخص سورۂ صافات ہر جمعہ کو پڑھے گا وہ ہر آفت سے محفوظ رہے گا اور دنیا کی زندگی میں ہر بلا اس سے دُور رہے گی۔ خداوند تعالیٰ اس کے رزق میں کشادگی کرے گا اور اس کے مال واولاد اور بدن پر شیطانِ رجیم اور جابر دشمن کو مسلط نہیں ہونے دے گا اور اگر اس دن یا رات کو دنیا سے کوچ کر جائے تو خدا اسے شہید اٹھائے گا اور شہید کی موت دے گا اور اسے بہشت میں شہداء کے درجے میں جگہ عطا فرمائے گا۔[2]

اس سُورہ کے مطالب پر توجہ کرتے ہوئے اس کی تلاوت پر ان تمام عظیم ثوابوں کی وجہ واضح وروشن ہو جاتی ہے

---

[1] مجمع البیان، آغاز سورۂ صافات

[2] تفسیر مجمع البیان، آغاز سورۂ صافات۔ تفسیر برھان میں بھی یہ حدیث مختصر فرق کے ساتھ مرحوم صدوق رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوئی ہے۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تلاوت کا مقصد غور وفکر کرنا ہے۔ اس کے بعد اس پر اعتقاد رکھنا اور پھر اس پر عمل کرنا ہے اور بلاشک وشبہ جو شخص اس سُورہ کی اس طریقہ سے تلاوت کرے گا وہ شیاطین کے شر سے بھی محفوظ رہے گا اور شرک سے بھی پاک ہوجائے گا اور صحیح اور محکم اعتقاد رکھنے اور اعمالِ صالح بجالانے اور انبیاء کی سرگزشت اور سابقہ اقوام کے واقعات سے نصیحت حاصل کرنے سے شہیدوں کے زُمرے میں بھی قرار پائے گا۔

ضمنی طور پر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اس سورہ کا نام "صافات" اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۱۔ وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ○

۲۔ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ○

۳۔ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ○

۴۔ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ○

۵۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ قسم ہے صف باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی (جو اپنی صفوں کو منظم رکھے ہوئے ہیں)

۲۔ پھر قسم ہے اُن کی جو سختی کے ساتھ منع کرتے ہیں (اور روک دیتے ہیں)

۳۔ وہی کہ جو پے در پے ذکر (الٰہی) کی تلاوت کرتے ہیں۔

۴۔ تمہارا معبود یقیناً یکتا ہے۔

۵۔ وہ آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا بھی اور وہ مشارق کا رب ہے۔

تفسیر

وہ فرشتے جو انجامِ اُمور کے لیے آمادہ رہتے ہیں

یہ قرآن مجید کی وہ پہلی سُورہ ہے جس کا آغاز قسم سے ہوتا ہے۔ اس کی پُرمعنی اور فکر انگیز قسمیں انسان کی فکر کو اپنے ساتھ اس جہان کے مختلف گوشوں کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں اور حقائق قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ خدا سب سے بڑھ کر راست گو ہے اور اسے قسم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں

اگر قسم مومنین کے لیے ہو تو وہ قسم کے بغیر بھی سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور اگر منکرین کے لیے ہے تو وہ خدا کی قسموں پر التفات ہی نہیں رکھتے۔

لیکن قرآن کی تمام آیات میں جن سے اس کے بعد ہمیں کبھی کبھی واسطہ پڑے گا، دو نکات کی طرف توجہ سے قسم کا مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

پہلا یہ کہ قسم ہمیشہ قابل قدر اور اہم امور کے بارے میں کھائی جاتی ہے۔ اس بناء پر قرآنی قسمیں ان امور کی عظمت اور اہمیت کی دلیل ہیں کہ جن کی قسم کھائی گئی ہے اور یہی امر "مقسم بہ" یعنی وہ چیز جس کی قسم کھائی گئی ہے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کا سبب بنتا ہے۔ ایسا غور و فکر جو انسان کو نئے حقائق سے آشنا کرتا ہے۔

دوسرا یہ کہ قسم ہمیشہ تاکید کے لیے ہوتی ہے اور اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ امور جن کے لیے قسم کھائی جا رہی ہے ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں تاکید شدید ہے۔

اس سے قطع نظر جس وقت کہنے والا اپنی بات کو دو ٹوک طریقے سے بیان کرے تو نفسیاتی طور پر سننے والے کے دل پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن کی ہر قسم مومنین کو زیادہ قوی اور منکرین کو زیادہ نرم کر دیتی ہے۔

بہر حال اس سورہ کی ابتداء میں ہمیں تین نام ملتے ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہے[1]

پہلے فرماتا ہے: قسم ہے ان کی جو صف باندھے ہوئے ہیں اور جنھوں نے اپنی صفوں کو منظم کیا ہوا ہے۔ (والصافات صفًّا)۔

وہی جو پوری قوت کے ساتھ روکتے ہیں (فالزاجرات زجرًا)۔

اور وہ جو پے در پے ذکر الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں (فالتالیات ذکرًا)۔

یہ تین گروہ کون ہیں؟ اور یہ کن افراد کی صفات ہیں؟ اور ان کا اصلی ہدف و مقصد کیا ہے؟ مفسرین نے یہاں بہت سی باتیں کی ہیں لیکن معروف و مشہور یہی ہے کہ یہ فرشتوں کے مختلف گروہوں کے اوصاف ہیں۔

ایسے گروہ جو فرمان الٰہی کو انجام دینے کے لیے عالم ہستی میں صف باندھے ہوئے آمادۂ تعمیل ہیں۔

فرشتوں کے ایسے گروہ جو انسانوں کو گناہ سے روکتے ہیں اور شیطانوں کے وسوسوں کو ان کے دلوں میں بے اثر کرتے ہیں یا آسمان کے بادلوں پر مامور ہیں اور انھیں ادھر ادھر دھکیلتے ہیں اور انھیں خشک سرزمینوں کی سیرابی کے لیے لے جاتے ہیں۔

اور آخر میں فرشتوں کے وہ گروہ جو آسمانی کتابوں کی آیات نزول وحی کے وقت پیغمبروں کے سامنے پڑھتے ہیں[2]

---

[1] یہ تین ہیں ایک معنی کے لحاظ سے تین قسمیں ہیں اور ایک معنی کے لحاظ سے ایک قسم ہے تین اوصاف کے ساتھ۔

[2] مذکورہ بالا آیات کی تفسیر کے بارے میں دوسرے احتمالات بھی بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ میدان جہاد میں مجاہدین اسلام کی صفوں کی طرف اشارہ ہے اور وہ میدان جنگ میں دشمنوں کے حملوں پر جھپٹتے ہیں اور وہ انھیں حریم اسلام اور قرآن سے جہاد کرنے سے روکتے ہیں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "صافات" "صافۃ" کی جمع ہے اور خود صافۃ بھی اپنی جگہ پر جمع کا مفہوم رکھتا ہے اور ایسے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو صف باندھے ہوئے ہے۔ اس بنا پر "صافات" متعدد صفوں کے معنی میں ہے[1]

"زاجرات" بنیادی طور پر "زجر" کے مادہ سے کسی چیز کو بلند آواز کے ساتھ ہانکنے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ وسیع معنی میں استعمال ہونے لگا جو ہر طرح سے دھتکارنے روکنے اور منع کرنے کا مفہوم دیتا ہے۔

اس بنا پر "زاجرات" ان گروہوں کے معنی میں ہے جو دوسروں کو روکتے، دھتکارتے اور جھڑکتے ہیں۔

اور "تالیات" "تلاوت" کے مادہ سے "تالی" کی جمع ہے جو ان گروہوں کے معنی میں ہے جو کسی چیز کی تلاوت کرتے ہیں[2]

ان الفاظ کے مفاہیم کی وسعت اور پھیلاؤ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کوئی تعجب کی بات نہیں لگتی کہ ان کے لیے مفسرین نے گوناگوں تفاسیر بیان کی ہیں۔ جو مختلف ہونے کے باوجود متضاد نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ سب کی سب ان آیات کے مفہوم میں جمع ہوں۔ مثلاً "صافات" سے فرشتوں کی وہ تمام صفوف مراد ہوں جو عالمِ آفرینش میں اوامرِ الٰہی کے اجراء کے لیے آمادہ ہیں اور وہ فرشتے بھی مراد ہوں جو عالمِ تشریع میں پیغمبروں پر نزولِ وحی پر مامور ہیں۔ اسی طرح راہِ خدا میں لڑنے والے اور مجاہدین کی صفیں یا نماز گزاروں اور عبادت کرنے والوں کی صفیں۔

اگرچہ قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ تر مراد فرشتے ہی ہیں اور بعض روایات میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہوا ہے[3]

(بقیہ حاشیہ) اور وہ جو ہمیشہ ذکرِ تلاوتِ الٰہی کرتے ہیں اور اپنے قلب و روح کو اس کے نور سے روشن کرتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان تین اوصاف کے ایک حصہ کا اشارہ ان فرشتوں کی طرف ہے جو منظم صفوں کی صورت میں ہوتے ہیں اور ایک حصہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ ہے جو لوگوں کو برائیوں سے روکتی ہیں اور ایک حصہ مومنین کی طرف اشارہ ہے جو نماز میں یا نماز کے علاوہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں لیکن ان اوصاف کے درمیان جو ربط بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ "فاء" کے ساتھ ان کا عطف اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سب اوصاف ایک ہی گروہ کے ہیں۔

علامہ طباطبائی نے "المیزان" میں یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ تینوں اوصاف ان فرشتوں کے ہوں جو وحی الٰہی کی تبلیغ پر مامور ہیں، وہ منظم صفوں میں وحی کی حفاظت کرتے ہیں اور شیطانوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں اور سرانجام آیاتِ الٰہی کی پیغمبروں کے لیے تلاوت کرتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ھذا)

[1] اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان اوصاف کا "جمع مؤنث" کی شکل میں ذکر کرنا اس بنا پر ہے کہ ان کا مفرد خود جماعت کا معنی رکھتا ہے جو مؤنث لفظی ہے۔

[2] یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بعض اربابِ لغت کے کہنے کے مطابق "تالی" کی جمع "تالیات" ہے اور "تالیۃ" کی جمع "توالی" ہے۔

[3] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۱۵ الدر المنثور جلد ۵ ص ۲۷۱

ان میں سے ایک گروہ ایسی صفوں میں موجود ہے جو ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں وہ ہمیشہ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ ان کی آنکھوں میں کبھی نیند طاری نہیں ہوتی۔ سہو و نسیان میں گرفتار نہیں ہوتے۔ بدن کی سستی انھیں دامن گیر نہیں ہوتی اور نسیان کی غفلت انھیں عارض نہیں ہوتی۔ ان کا ایک گروہ وحی کے امناء ہیں اور وہ پیغمبروں کے لیے خدا کی زبانیں ہیں [1]

ان تینوں آیات کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ بعض یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ان آیات میں خدا کی پاک ذات کی قسم کھائی گئی ہے اور ان سب میں لفظ "رب" مقدر ہے اور حقیقت میں اس طرح تھا:

ورب الصافات صفًّا ورب الزاجرات زجرًا ورب التالیات ذکرًا

صف باندھ کر کھڑے ہوئے ان گروہوں کے پروردگار کی قسم جنھوں نے اپنی صفوں کو منظم کیا ہوا ہے اور جھڑک کر روک دینے والوں کے پروردگار کی قسم، اور پے در پے ذکر خدا کی تلاوت کرنے والوں کے پروردگار کی قسم۔

جن لوگوں نے آیات کی اس طرح تفسیر کی ہے ان کا خیال یہ ہے کہ چونکہ خدا نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ غیر خدا کی قسم نہ کھائیں۔ پس خدا بھی اپنی ذات کے علاوہ کسی کی قسم نہیں کھاتا، علاوہ ازیں قسم کسی اہم امر کی کھانا چاہیے اور زیادہ اہم اس کی پاک ذات ہے۔

لیکن وہ اس نکتے سے غافل ہیں کہ خدا کا حساب اس کے بندوں سے الگ ہے۔ وہ انسانوں کو متوجہ کرنے کے لیے "آفاقی" اور "انفسی" آیات اور آسمان و زمین میں اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ہمیشہ مختلف موجودات کی قسمیں کھاتا ہے تاکہ وہ انھیں ان آیات میں غور و فکر کرنے پر آمادہ کرے اور وہ اُسے اس راستے سے پہچانیں۔

اس سے قطع نظر قرآن مجید کی کئی آیات ہیں ـــــ جیسے سورۂ الشمس کی آیات میں ـــــ خدا نے موجوداتِ عالم کی اپنی پاک ذات کے ساتھ قسم کھائی ہے اور وہاں کسی چیز کو مقدر کرنا ممکن نہیں ہے، فرماتا ہے:

والسماء وما بناها والارض وما طحاها ونفس وما سوّاها

قسم ہے آسمان کی اور جس نے اسے بنایا، قسم ہے زمین کی اور جس نے اسے بچھایا ہے اور قسم ہے انسان کی جان کی اور جس نے اُسے منظم کیا ہے [2]

بہر حال زیر بحث آیات کا ظاہر یہی ہے کہ ان ہی تینوں گروہوں کی قسم کھائی گئی ہے اور کسی چیز کو مقدر ماننا خلافِ ظاہر ہے اور دلیل کے بغیر اُسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱

[2] سورۂ "الشمس" (آیات ۵ تا ۷)

آئیے اب یہ دیکھتے ہیں کہ ملائکہ اور انسانوں کی صفوں کی یہ پرمعنی قسمیں کس مقصد کے لیے کھائی گئی ہیں؟
بعد والی آیت اس مقصد کو واضح کرتے ہوئے کہتی ہے:
تمھارا معبود یقیناً یکتا ہے (ان الھکم لو احد)۔
قسم ہے ان مقدسات کی جو بیان کیے گئے ہیں، کہ تمام بُت تباہ و برباد ہیں اور پروردگار کا کوئی کسی قسم کا شریک و شبیہ و نظیر نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: وہی جو آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا بھی اور سب مشرقوں کا پروردگار وہی ہے۔ (رب السماوات والارض و ما بینھما و رب المشارق)۔
یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں:۔
۱۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کا ذکر کرنے کے بعد "مشارق" کے ذکر کی کیا ضرورت تھی، کیونکہ یہ بھی تو انھیں کا ایک جزء ہے۔
اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ "مشارق" چاہے سال کے دنوں میں سورج کے مشارق کی طرف اشارہ ہو یا آسمان کے مختلف ستاروں کے مشارق کی طرف، سب کے سب ایک مخصوص نظم اور پروگرام رکھتے ہیں کہ جو آسمانوں اور زمین کے نظام کے علاوہ ان کے پیدا کرنے والے اور مدبّر کے قدرت و علم پر دلالت کرتا ہے۔
آسمان کا سورج سال بھر میں روزانہ ایک نئے نقطے سے طلوع کرتا ہے اور ان نقاط کا ایک دوسرے سے فاصلہ اس قدر منظم اور دقیق ہے کہ ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصّہ بھی کم یا زیادہ نہیں ہوتا اور لاکھوں سال گزر چکے ہیں مگر "سورج کے مشارق" کا نظم و ضبط اسی طرح قائم و برقرار ہے۔
دوسرے ستاروں کے طلوع و غروب میں بھی یہی نظام کارفرما ہے۔
علاوہ ازیں اگر سورج سال بھر کے اندر اس تدریجی راستے کو طے نہ کرتا تو چاروں فصلیں اور مختلف برکتیں جو اس سے ہمیں حاصل ہوتی ہیں نہ ہوسکتیں اور یہ بات خود اس کی عظمت و تدبیر کی ایک اور نشانی ہے۔
اس کے علاوہ "مشارق" کا ایک دوسرا معنی یہ ہے کہ زمین کے گول ہونے کی بنا پر اس کا ہر نقطہ دوسرے نقطے کی نسبت مشرق یا مغرب شمار ہوتا ہے اور اس طرح سے زیر بحث آیت ہمیں زمین کے کروی ہونے اور اس کی مشرقوں اور مغربوں کی طرف توجہ دلاتی ہے۔
(اس آیت سے دونوں معانی مراد ہونے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے)۔
۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ "مشارق" کے مقابلے میں یہاں "مغارب" کے بارے میں کیوں گفتگو نہیں ہوئی، جیسا کہ سورۂ معارج کی آیہ ۴۰ میں آیا ہے:۔
فلا اقسم برب المشارق والمغارب

۶۔ اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ ِۨالْکَوَاکِبِ ۙ
۷۔ وَحِفْظًا مِّنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ
۸۔ لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ ۖ
۹۔ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ
۱۰۔ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝

ترجمہ

۶۔ ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کے ساتھ زینت بخشی۔
۷۔ اور اس کی ہر سرکش شیطانِ خبیث سے حفاظت کی۔
۸۔ وہ عالمِ بالا کے فرشتوں کی (باتوں کو) نہیں سُن سکتے (اور جس وقت وہ سننا چاہتے ہیں) تو ہر طرف سے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں۔
۹۔ وہ شدت کے ساتھ پیچھے کی طرف دھکیلے جاتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔
۱۰۔ مگر جو مختصر سے لمحے کے لیے اچٹتی سی بات سننے کے لیے آسمان کے نزدیک ہوتے ہیں تو "شہابِ ثاقب" ان کا تعاقب کرتے ہیں۔

تفسیر

شیاطین کے نفوذ سے آسمان کی حفاظت

گزشتہ آیات میں فرشتوں کی مختلف صفوں کے بارے میں گفتگو تھی، جن کی بہت بڑی بڑی ذمہ داریاں ہیں اور زیرِ بحث آیات میں ان کے مدمقابل یعنی شیاطین کے مختلف گروہوں اور ان کے انجام کے بارے میں گفتگو ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مشرکین کی اس جماعت کے اعتقاد کو باطل کرنے کے لیے ایک مقدمہ ہو، جو شیاطین اور جنوں کو اپنا معبود قرار دیتے ہیں ضمنی طور پر اس میں توحید کا ایک درس بھی پوشیدہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے نزدیکی آسمان (نچلے آسمان) کو ستاروں سے مزین کیا ہے (انا زینا السماء

الدنیا بزینۃ الکواکب)[1]۔

سچ مچ تاریک اور ستاروں بھری رات میں صفحۂ آسمان پر ایک نگاہ سے اس قسم کا خوبصورت منظر انسان کے سامنے مجسم ہوتا ہے کہ وہ مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔

گویا تاروں بھری رات زبان بے زبانی سے ہم سے گفتگو کر رہی ہے اور خلقت کے راز ہم سے بیان کر رہی ہے۔

گویا سب کے سب تارے شاعر ہیں جو پئے در پئے عشق و عرفان میں ڈوبی ہوئی خوبصورت غزلیں گا رہے ہیں۔

ان کا ٹمٹمانا اور پلکیں جھپکنا ایسے رازوں کو بیان کرتا ہے کہ جو سوائے عاشق و معشوق کے اور کہیں نہیں ہوتے۔

واقعاً آسمان کے ستاروں کا منظر اس قدر خوبصورت ہے کہ ہرگز آنکھ اس کے دیکھنے سے نہیں تھکتی، بلکہ انسانی وجود سے ساری خستگی کو دُور کر دیتا ہے (اگرچہ یہ مسائل، ہمارے زمانے میں شہروں کے رہنے والوں کے لیے کچھ مفہوم نہیں رکھتے کیونکہ وہ کارخانوں کے دھوئیں میں ڈوبے رہتے ہیں اور ان پر ایک سیاہ و تاریک آسمان ہوتا ہے، لیکن دیہاتوں کے رہنے والے اب بھی قرآن کے اس ارشاد کی عملی صورت یعنی آسمان کا درخشاں ستاروں سے مزین ہونا دیکھ سکتے ہیں)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ "ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں سے مزین کیا ہے"۔ حالانکہ جو مفروضہ اس زمانے کے افکار اور دانش مندوں میں تسلیم کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ صرف اوپر والا آسمان ثوابت ستاروں کا آسمان ہے (بطلیموس کے مفروضہ کے مطابق آٹھواں آسمان)۔

لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اس مفروضہ کا باطل ہونا ثابت ہو چکا ہے اور قرآن کا اس زمانے کے غیر صحیح مفروضہ کی پیروی نہ کرنا اس آسمانی کتاب کا زندہ معجزہ ہے۔

دوسرا قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ موجودہ سائنس کی رُو سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ستاروں کا خوبصورتی کے ساتھ ٹمٹمانا اور پلکیں جھپکنا اس کرۂ ہوائی کی بنا پر ہے جس نے اطرافِ زمین کو گھیر رکھا ہے اور اسی کی بنا پر یوں دکھائی دیتا ہے اور یہ بات "السماء الدنیا" (نچلے آسمان) کی تعبیر کے ساتھ بہت ہی مناسب ہے۔ فضائے زمین سے باہر ستارے دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں اور ان میں یہ چمک دمک نہیں ہوتی۔

بعد والی آیت میں آسمان کے منظر کے شیاطین کے نفوذ سے محفوظ رہنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے ہر خبیث اور خیر و نیکی سے عاری شیطان سے محفوظ رکھا ہے (وحفظاً من کل شیطان مارد)[2]۔

---

[1] ترکیب کے لحاظ سے "الکواکب" "زینت" کا بدل ہے اور یہ استعمال بھی ہے کہ عطف بیان ہو اور زینت یہاں پر اسم مصدری کا معنی رکھتا ہو نہ کہ مصدری معنی کا۔ ادبی کتب میں ہے کہ جس وقت نکرہ معرفہ سے بدل جائے تو اس کے ساتھ ایک صفت ہونی چاہیے لیکن اس کے برعکس ضروری نہیں ہے (غور کیجیے گا)

[2] "حفظاً" بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق فعلِ مقدر کے لیے "مفعول مطلق" ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:

وحفظناها حفظاً

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

"مارد" "مرد" (بروزن "سرد") کے مادہ سے اصل میں اس بلند سرزمین کے معنی میں ہے جو کسی بھی قسم کے سبزے سے خالی ہو، وہ درخت جس کے پتے جھڑ جائیں اسے "امرد" کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس نوجوان پر جس کے چہرے پر بال نہ اُگے ہوں اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے یہاں "مارد" سے مراد وہ شخص ہے جو ہر قسم کی خیر و برکت سے عاری ہو۔ ہماری تعبیر کے مطابق "جس کے پاس کچھ نہ ہو" ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ شیطانوں کے اوپر چڑھنے سے آسمانوں کو محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ستاروں کا ایک گروہ ہے اور انھیں "شہب" کہا جاتا ہے۔ جس کی طرف بعد کی آیات میں اشارہ ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ عالم بالا کے فرشتوں کی باتوں کو نہیں سُن سکتے اور غیب کے اسرار ان سے نہیں معلوم کر سکتے اور اگر ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہر طرف سے شہاب کے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں۔ (لا یسمعون الی الملا الاعلیٰ و یقذفون من کل جانب)۔

ہاں انھیں شدّت کے ساتھ پیچھے کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے اور انھیں آسمان کے منظر سے نکال دیا جاتا ہے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے (دحورًا و لھم عذاب واصب)۔

"لا یسمعون" (جو لایتسمعون کے معنی میں ہے) اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ "ملا اعلیٰ" کی خبریں سُن لیں لیکن انھیں اجازت نہیں دی جاتی۔

"ملا اعلیٰ" عالم بالا کے فرشتوں کے معنی میں ہے کیونکہ "ملا" اصل میں اس جماعت اور گروہ کو کہا جاتا ہے جو ایک نظریہ پر اتفاق رکھنے والوں پر مشتمل ہو اور دوسروں کی آنکھ کو اس ہم آہنگی و وحدت سے پُر کر دیں اور مسند اقتدار کے گرد موجود افراد اور اشراف و اعیان کو بھی "ملا" کہتے ہیں کیونکہ ان کی ظاہری وضع قطع آنکھ کو پُر کرتی ہے لیکن جب اس کی "اعلیٰ" کے ساتھ توصیف ہو تو پھر حق تعالیٰ کے ملائکہ کرام اور فرشتگان والا مقام کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

"یقذفون" "قذف" کے مادہ سے پھینکنے اور دور کی جگہ پر تیر مارنے کے معنی میں ہے اور یہاں مراد "شہب" کے ذریعے "شیاطین" کو بھگانا اور دور دھکیلنا ہے جس کی تشریح ہم بعد میں بیان کریں گے اور یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ انھیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ملا اعلیٰ کی قلمرو کے قریب جا سکیں۔

"دحورًا" "دحر" (بروزن دَہر) کے مادہ سے دھکیلنے اور دور کرنے کے معنی میں ہے اور "واصب" اصل میں پرانی بیماریوں کے معنی میں ہے لیکن کلی طور پر دائم و مسلسل کے معنی میں ہے اور کبھی یہ لفظ خالص کے معنی میں بھی آیا ہے۔[1]

(بقیہ حاشیہ) بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "بزینۃ" کے محل پر عطف ہو جو "مفعول لہ" ہے اور یہ تقدیر میں اس طرح ہوگا:۔

انا خلقنا الکواکب زینۃ للسماء وحفظًا

[1] "واصب" کے معنی کے بارے میں جلد ۱۱ میں سورۂ نحل کی آیہ ۵۲ کے ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شیاطین نہ صرف آسمان تک پہنچنے سے روک دیئے جاتے اور بھگائے جاتے ہیں بلکہ آخر کار دائمی عذاب میں بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں سرکشی اور جسارت کرنے والے شیطانوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو آسمان کی بلندی کی طرف جانے کا ارادہ کرتے ہیں، قرآن فرماتا ہے: مگر وہ جو مختصر سے لمحے کے لیے چوری چھپے اچٹتی سی بات سننے کے لیے آسمان کے نزدیک ہو جائیں تو شہابِ ثاقب ان کا پیچھا کرتے ہیں اور انھیں جلا دیتے ہیں۔ (الا من خطف الخطفة فاتبعه شهاب ثاقب)۔

"خطفة" یعنی کسی چیز کو جلدی سے اچک لینا۔

"شہاب" اصل میں اس شعلہ کے معنی میں ہے جو جلتی ہوئی آگ سے بلند ہوتا ہے اور وہ آتشیں شعلے جو آسمان میں ایک لمبے خط کی صورت میں ابھرتے ہیں انھیں بھی "شہاب" کہتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ ستارے نہیں ہیں بلکہ ستاروں کے مانند پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جو فضا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ زمین کی کشش کی حدود میں آجاتے ہیں تو پھر زمین کی طرف دوڑتے ہیں اور زمین کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوا کے ساتھ تیزی اور شدت سے ٹکرانے کی وجہ سے شعلہ ور ہو جاتے ہیں۔

"ثاقب" نفوذ کرنے والے اور سوراخ کرنے والے کے معنی میں ہے۔ گویا شدید نور کے زیر اثر آنکھوں میں سوراخ کر کے انسان کی آنکھ کے اندر نفوذ کر جاتا ہے اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جس چیز سے ٹکراتا ہے اس میں سوراخ کر کے آگ لگا دیتا ہے۔

اس طرح شیاطین کے آسمانوں میں نفوذ کرنے میں دو طرح کی رکاوٹیں موجود ہیں۔

پہلی رکاوٹ تو ہر طرف سے دھتکارا جانا اور بھگایا جانا ہے۔ اور وہ بھی ظاہری طور پر شہب ہی کے ذریعہ صورت پذیر ہوتا ہے۔

دوسری رکاوٹ شہاب کی ایک خاص قسم ہے جس کا نام "شہابِ ثاقب" ہے اور وہ ان کے انتظار میں رہتے ہیں۔ وقت بے وقت جب کبھی وہ چوری چھپے کوئی بات سننے کے لیے آسمان پر ملا اعلیٰ کے نزدیک ہوتے ہیں تو وہ ان سے ٹکرا جاتے ہیں۔

اسی طرح کی بات سورۂ حجر کی آیہ ۱۷ اور ۱۸ میں کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وحفظناها من كل شيطان رجيم الا من استرق السمع فاتبعه شهاب مبين

ہم آسمانی برجوں کی ہر راندۂ درگاہ شیطان سے حفاظت کرتے ہیں، مگر جو چوری چھپے باتیں سننے لگے تو شہابِ مبین اس کے پیچھے لگ جاتا ہے (انھیں بھگا دیتا ہے اور جلا دیتا ہے)۔

اس تعبیر کی نظیر سورۂ ملک کی آیہ ۵ میں بھی آئی ہے۔

ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وجعلناها رجومًا للشیاطین

ہم نے نچلے آسمان کو چراغوں کے ساتھ مزین کیا ہے اور ان (میں سے ایک حصہ) کو شیطانوں کو دور کرنے اور بھگانے کے لیے قرار دیا ہے۔

توضیح و تکمیل

ان الفاظ کے ظاہری کو پیش نظر رکھنا چاہیے یا ایسے قرائن موجود ہیں کہ جن کی وجہ سے ظاہر کے خلاف تفسیر کرنی چاہیے اور انھیں تمثیل و تشبیہ و کنایہ جاننا چاہیے اس بارے میں مفسرین کے درمیان مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔

بعض نے ان آیات کے ظاہر کو انھیں معانی پر جو پہلی نظر میں دکھائی دیتے ہیں، محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ آسمانوں میں نزدیک اور دور دراز مقامات پر فرشتوں کے کچھ گروہ ساکن ہیں اور وہ اس جہان کے حوادث کی خبریں اس سے پہلے کہ وہ زمین میں صورت پذیر ہوں وہاں منعکس ہوتی ہیں۔

شیاطین کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ آسمانوں پر چڑھ جائے اور چوری چھپے ان خبروں میں سے کوئی بات معلوم کر لے اور کاہنوں یعنی انسانوں میں سے اپنے ساتھ مربوط لوگوں کو منتقل کر دیں۔ اس موقع پر شہاب جو ستاروں کی طرح متحرک ہیں ان کی طرف دوڑتے ہیں اور انھیں پیچھے کی طرف دھکیل دیتے ہیں یا انھیں نابود کر دیتے ہیں۔

یہ مفسرین کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے ہم موجودہ زمانے میں ان تعبیرات کے مفاہیم کو صحیح طور پر معلوم نہ کر سکیں لیکن ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ ہم ان ظاہری مطالب کی حفاظت کرتے ہوئے مزید معلومات کو آئندہ پر چھوڑ دیں۔

اس تفسیر کو مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں، آلوسی نے "روح المعانی" میں، سید قطب نے "فی ظلال" میں اور بعض دوسرے مفسرین نے انتخاب کیا ہے۔

جبکہ بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ زیر بحث آیات ان آیات کے مشابہ ہیں جو "لوح" "قلم" "عرش" اور "کرسی" کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور تمثیل و کنایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان کا عقیدہ ہے کہ یہ آیات "معقول" کو "محسوس" سے تشبیہ دینے کے قبیل سے ہیں اور سورۂ عنکبوت کی آیہ ۴۳ کی مصداق ہیں جس میں قرآن فرماتا ہے:

وتلك الامثال نضربها للناس وما یعقلها الا العالمون

یہ وہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور اہل علم کے سوا انھیں کوئی نہیں سمجھتا۔

ان مفسرین نے مزید کہا ہے کہ جن آسمانوں میں ملائکہ ساکن ہیں ان سے مراد عوالم ملکوت ہیں جن کا افق اس محسوس عالم سے برتر ہے اور شیاطین کے آسمانوں سے نزدیک ہونے اور "چوری چھپے" سننے اور "شہب" کے ذریعہ انھیں بھگانے سے مراد یہ ہے کہ یہ شیاطین جب اسرار خلقت اور آئندہ کے حوادث کی خبریں معلوم کرنے کے لیے فرشتوں کے عالم سے نزدیک ہونا چاہیں، تو

ملکوت کے نور کے ذریعے جسے برداشت کرنے کی ان میں طاقت نہیں ہے، رُک جاتے ہیں اور دُور ہو جاتے ہیں اور حق کے ذریعے ان کے باطل کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ مفسرین اس سورہ کے آغاز میں فرشتوں کے گروہوں کی بحث کے بعد اس قصہ کے ذکر کو، اس معنی کا مؤید سمجھتے ہیں۔[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ "سماء" یہاں آسمان ایمان اور معنویت و روحانیت کے لیے کنایہ ہو۔ کیونکہ ہمیشہ شیاطین اس تک راہ پانے کی سعی و کوشش کرتے ہیں اور وسوسوں کے ذریعے سچے مومنین کے دلوں میں نفوذ پیدا کرتے ہیں لیکن خدائی پیغمبر اور ائمہ معصومین اور ان کے فکری و عملی راستے کے پیرو علم و تقویٰ کے شہابِ ثاقب کے ذریعے ان پر حملہ کرتے ہیں اور انھیں اس آسمان کے قریب ہونے سے روک دیتے ہیں۔

ہم اس تفسیر کو صرف ایک احتمال کے طور پر یہاں پیش کر رہے ہیں اور اس کے قرائن و شواہد گیارہویں جلد سورۂ حجر کی آیہ ۱۸ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔ ان قرائن کی مزید وضاحت کے لیے گیارہویں جلد ہی کی طرف رجوع فرمائیں۔

قرآنِ مجید کی ان آیات اور ان سے مشابہ آیات کے معنی کے سلسلہ میں یہ تین مختلف تفاسیر تھیں۔

---

[1] تفسیر "المیزان" (جلد ۱۷، صفحہ ۱۲۰) سے تلخیص

۱۱۔ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ○

۱۲۔ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ۝

۱۳۔ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۝

۱۴۔ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝

۱۵۔ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

ترجمہ

۱۱۔ ان سے پوچھو کیا ان کی خلقت (اور معاد) زیادہ مشکل ہے یا فرشتوں (اور آسمان وزمین) کی خلقت؟ ہم نے انھیں چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا ہے۔

۱۲۔ تو ان کے انکار سے تعجب کرتا ہے لیکن وہ تو ٹھٹھا کرتے ہیں۔

۱۳۔ اور جس وقت انھیں نصیحت کی جائے تو وہ ہرگز متوجہ نہیں ہوتے۔

۱۴۔ اور جب وہ کوئی معجزہ دیکھیں تو دوسروں کو بھی ٹھٹھا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

۱۵۔ اور کہتے ہیں یہ تو نرا کھلا جادو ہے۔

تفسیر

وہ ہرگز حق کو قبول نہیں کریں گے

یہ آیات بھی مسئلہ قیامت اور ہٹ دھرم منکرین کی مخالفت کو بیان کر رہی ہیں۔

گزشتہ بحث کے بعد اب ان آیات میں قرآن ہر چیز پر خداوند تعالیٰ اور آسمان و زمین کے خالق کی قدرت کے متعلق فرماتا ہے: ان سے پوچھو کیا ان کی خلقت اور معاد زیادہ مشکل اور سخت تر ہے یا فرشتوں اور آسمانوں و زمین کی خلقت (فاستفتہم اھم اشد خلقًا ام من خلقنا)۔

ہاں ہم نے انھیں ایک معمولی سی چیز، چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا: (انا خلقناھم من طین لازب)۔

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے اور کچھ نہیں (و قالوا ان ھٰذا الّا سحر مبین)۔

ان کا معجزات اور آیات الٰہی کو "ھٰذا" (یہ) کہنا اس لیے تھا تاکہ وہ انھیں حقیر اور بے قدر و قیمت ظاہر کریں اور انھیں "سحر" کہنا اس بنا پر تھا کہ ایک طرف تو پیغمبر اسلامؐ کے خارق العادہ اعمال و افعال قابلِ انکار نہیں تھے اور دوسری طرف وہ ایک معجزہ کے طور پر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا نہیں چاہتے تھے صرف ایک لفظ جو ان کی شیطنت کا اظہار اور ان کی ہوائے نفس کو پورا کر سکتا تھا وہی لفظ سحر تھا جو اس حال میں بھی قرآن اور پیغمبر کے عجیب اور انتہائی زیادہ اثر کے بارے میں دشمن کے اعتراف کی نشاندہی کرتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ "یستسخرون" کا مفہوم: مفسرین کی ایک جماعت کے نظریہ کے مطابق لفظ "یستخرون" "یسخرون" (مذاق اڑاتے ہیں) کے معنی میں آیا ہے اور ان دونوں تعبیروں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے جبکہ بعض دوسرے ان دونوں کے درمیان مختلف معانی کے قائل ہیں وہ "یستخرون" کو اس مفہوم کی بنا پر جو باب استفعال میں پوشیدہ ہے، دوسروں کو تمسخر اڑانے کی دعوت دینے کے معنی میں سمجھتے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ صرف خود آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسرے بھی یہ کام سرانجام دیں تاکہ یہ امر معاشرے میں مذاق ہی بن کر رہ جائے۔

بعض ان دونوں کے فرق کو زیادہ تاکید کے معنی میں سمجھتے ہیں جو لفظ "یستخرون" سے معلوم ہوتی ہے۔

بعض نے اس لفظ کو "کسی چیز کے مذاق ہونے کا اعتقاد رکھنے" کے معنی میں بیان کیا ہے۔ یعنی وہ شدید انحراف کے نتیجے میں حقیقتاً یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ معجزات ایک مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، لیکن دوسرا معنی سب سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۲۔ اس آیت کی ایک شانِ نزول: بعض مفسرین نے زیرِ بحث آیت کی ایک شانِ نزول بھی بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی ایک مشرک سے جس کا نام "رکانہ" تھا اطرافِ مکہ کے ایک پہاڑ پر تنہائی میں ملاقات ہوئی۔ باوجود اس کے کہ رکانہ مکہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ قوی اور طاقتور تھا، پیغمبر اکرمؐ نے اسے زمین پر پٹخ دیا تاکہ اس پر ظاہر کر دیں کہ آپ معجزے کی طاقت رکھتے ہیں کیونکہ عام حیثیت کے لحاظ سے حریف کی کامیابی مسلّم تھی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے کچھ اور معجزات بھی اسے دکھائے کہ جو اس کی ہدایت کے لیے کافی تھے لیکن وہ نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں لایا بلکہ مکہ میں آیا اور چلّا کر کہا:

یابنی ھاشم ساحروا بصاحبکم اھل الارض

اے بنی ہاشم! تمھارا ساتھی جادو میں اتنا قوی ہے کہ تم اس کے ذریعہ روئے زمین کے تمام جادوگروں کا مقابلہ کر سکتے ہو۔

زیرِ نظر آیات اس کے اور اس جیسے افراد کے بارے میں نازل ہوئیں[1]

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۳ ص ۷۱

۱۶۔ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ۙ
۱۷۔ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُونَ ؕ
۱۸۔ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُونَ ۚ
۱۹۔ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُونَ
۲۰۔ وَقَالُوا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّينِ
۲۱۔ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُونَ ۚ
۲۲۔ اُحْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ۙ
۲۳۔ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَاهْدُوهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيمِ ۚ الربع

ترجمہ

۱۶۔ وہ کہتے ہیں جب ہم مر گئے اور خاک اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے ؟
۱۷۔ یا ہمارے گزشتہ آباؤ اجداد (لوٹائے جائیں گے) ؟
۱۸۔ کہہ دو : ہاں (تم سب زندہ کیے جاؤ گے) جبکہ تم ذلیل و خوار ہو گے۔
۱۹۔ صرف ایک ہی عظیم صیحہ ہو گی ، اچانک سب کے سب (قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے) اور دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔
۲۰۔ اور کہیں گے : وائے ہو ہم پر یہ جزا کا دن ہے ؟
۲۱۔ (ہاں !) یہ وہی جدائی کا دن ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (حق کی باطل سے جدائی کا دن)۔
۲۲۔ (اس وقت فرشتوں کو حکم دیا جائے گا) ظالموں اور ان کے ساتھیوں اور جن جن کی وہ پرستش کیا کرتے تھے .....
۲۳ (ہاں جن جن کی بھی وہ) خدا کے سوا پرستش کیا کرتے تھے انھیں جمع کرو اور انھیں جہنم کے راستے پر چلتا کر دو۔

تفسیر

کیا ہم اور ہمارے آباء پھر زندہ ہو جائیں گے ؟

یہ آیات بھی اسی طرح منکرینِ معاد کی گفتگو اور ان کو دیے گئے جواب کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پہلی آیت منکرین کا معاد کو بعید جاننا اس طرح بیان کرتی ہے کہ وہ کہتے ہیں : کیا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے ؟(ءاذا متنا وکنا ترابا وعظاما ءانا لمبعوثون)[1]

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیا ہمارے گزشتہ آباؤ اجداد بھی اٹھائے جائیں گے ؟(او اٰباؤنا الاولون)۔

وہی جن کے وجود سے مٹھی بھر بوسیدہ ہڈیوں یا بکھری ہوئی مٹی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ کون ہے ایسا جو ان بکھرے ہوئے اجزاء کو اکٹھا کر سکے اور انھیں لباس حیات پہنا سکے ؟

لیکن یہ دل کے اندھے اس بات کو بھولے ہوئے ہیں کہ پہلے دن وہ سب کے سب خاک ہی تو تھے ، وہ مٹی ہی سے پیدا کیے گئے تھے اگر انھیں خدا کی قدرت میں شک ہے تو انھیں جاننا چاہیے کہ خدا نے انھیں ایک مرتبہ قدرت دکھا دی اور اگر انھیں مٹی کی قابلیت میں شک ہے تو اس کا ایک مرتبہ ثبوت مل چکا، اس کے علاوہ آسمانوں اور زمین کی ایسی عظیم پیدائش، کسی کے لیے حق تعالیٰ کی بے پایاں قدرت میں شک کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑتی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ انکار کے لیے اپنی گفتگو کو طرح طرح کی تاکیدوں کے ساتھ زوردار بناتے ہیں چونکہ جملہ "ءانا لمبعوثون" "جملہ اسمیہ" بھی ہے اور "ان" اور "لام" جو دونوں ہی تاکید کے لیے آتے ہیں اس میں استعمال ہوئے ہیں اور یہ سب ان کی جہالت اور ہٹ دھرمی کی بنا پر تھا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں لفظ "تراب" (خاک) "عظام" (ہڈیوں) سے پہلے بیان ہوا ہے ممکن ہے یہ امر ان تین نکتوں میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ ہو۔

۱۔ یہ کہ اگرچہ انسان مرنے کے بعد پہلے ہڈیوں کی صورت اختیار کرتا ہے اور پھر خاک کی صورت۔ لیکن چونکہ خاک کا دوبارہ زندہ ہونا زیادہ عجیب ہے لہذا پہلے اسے بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ جب مردوں کا جسم بکھرتا ہے تو پہلے گوشت مٹی میں تبدیل ہوتا ہے اور ہڈیوں کے پہلو میں گر پڑتا ہے اس بنا پر وہ خاک بھی ہوتا ہے اور ہڈیاں بھی۔

---

[1] یہ آیت ایک جملہ شرطیہ کی شکل میں ہے کہ جس کی شرط کو (ءاذا متنا) اور اس کی جزا محذوف ہے "ءانا لمبعوثون" اس پر قرینہ ہے کیونکہ یہ جملہ ادبی قواعد کی بناء پر جزاء واقع نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ممکن ہے "تراب" تو بہت پہلے کے مرے ہوئے آباؤ اجداد کے جسموں کی طرف اشارہ ہو اور "عظام" ان آباؤ اجداد کے بدنوں کی طرف اشارہ جو ابھی تک کامل طور سے مٹی نہیں ہوئے ہیں۔

اس کے بعد قرآن انھیں ٹھونک بجا کر جواب دیتا ہے اور پیغمبر اکرمؐ سے کہتا ہے، انھیں کہہ دو: ہاں! تم بھی اور تمھارے سارے آباؤ اجداد بھی پھر زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے، اس حالت میں کہ تم سب کے سب ذلیل و خوار اور حقیر ہو گے (قل نعم وانتم داخرون)۔[1]

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تمھارا اور تمھارے سارے گزشتہ آباؤ اجداد کا زندہ کرنا قادر و توانا خدا کے لیے کچھ مشکل کام ہے اور کچھ بہت ہی سخت عمل ہے؟

نہیں، صرف ایک ہی صیحہ اور عظیم آواز خدا کے مامور کی طرف سے بلند کی جائے گی تو اچانک سب کے سب قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور زندہ ہو جائیں گے اور خود اپنی آنکھوں سے محشر کا منظر دیکھیں گے جس کی اس دن تک تکذیب کیا کرتے تھے (فانما ھی زجرۃ واحدۃ فاذا ھم ینظرون)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "زجرۃ" "زجر" کے مادہ سے کبھی نکالنے، دھکا دینے اور بھگانے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی بلند آواز کے ساتھ پکارنے کے معنی میں۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے اور یہ اسرافیل کے دوسرے نفخ صور اور دوسری چیخ کے معنی میں ہے جس کی تشریح انشاء اللہ سورہ "زمر" کی آیات کے ذیل میں کی جائے گی۔

لفظ "ینظرون" (وہ دیکھیں گے) ان کے میدانِ محشر میں حیران و پریشان ہو کر دیکھنے یا عذاب کا انتظار کرتے ہوئے دیکھنے کی طرف اشارہ ہے اور ہر دو صورت میں مطلب یہ ہے کہ نہ صرف وہ زندہ ہی ہوں گے بلکہ اپنے ادراک اور بصارت کو بھی اس ایک صیحہ کے ساتھ ہی واپس پالیں گے۔

"زجرۃ واحدۃ" کی تعبیر ان دونوں الفاظ کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے، قیامت کے تیزی کے ساتھ اچانک آنے اور اس کے خدا کی قدرت کے سامنے بالکل آسان ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ قیامت کے فرشتے کی ایک ہی تکم آمیز چیخ کے ساتھ ہر چیز اپنے راستے پر چل پڑے گی۔

اس موقع پر ان مغرور و سرکش مشرکین کی چیخ و پکار بلند ہو گی جو اُن کی بدحالی اور بے چارگی کی نشانی ہے اور وہ کہیں گے: وائے ہو

---

[1] "داخر"، "دخر" (بروزنِ "فخر") اور "دخور" دونوں ہی ذلت و حقارت کے معنی میں ہیں۔ درحقیقت زیر بحث آیت کا ایک جملہ مقدر ہے کہ اصلی جواب وہی تھا اور اس پر کچھ اضافہ ہے تاکہ بات میں کچھ زیادہ زور پیدا ہو جائے۔ تقدیر اس طرح تھی:۔

نعم انکم مبعوثون حالکونکم داخرین

ہم پر، یہ تو یوم جزا ہے" (وقالوا یا ویلنا ھٰذا یوم الدین)۔

ہاں! جس وقت ان کی نگاہیں عدالتِ الٰہی، اس عدالت کے گواہوں اور فیصلہ کرنے والوں اور عذاب کی نشانیوں اور علامات پر پڑیں گی تو بے اختیار نالہ و فریاد کریں گے اور اپنے پورے وجود کے ساتھ قیامت کی حقانیت کا اعتراف کرلیں گے، لیکن ایسا اعتراف ان کی کسی مشکل کو حل نہیں کرسکے گا اور نہ ہی ان کے عذاب و سزا میں معمولی سی بھی کمی ہو سکے گی۔

اس موقع پر خدا یا ملائکہ کی طرف سے خطاب ہوگا، ہاں! آج وہی جدائی کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"، حق کی باطل سے جدائی، بدکاروں کی صفوں کی نیکوکاروں سے علیحدگی اور پروردگار بزرگ و برتر کے فیصلہ اور عدالت کا دن۔ (ھٰذا یوم الفصل الذی کنتم بہ تکذبون)۔

اس کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتی ہے جن میں قیامت کے دن کو یوم الفصل یا جدائی کے دن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کتنی عجیب، منہ بولتی اور وحشت ناک تعبیر ہے؟[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جب کفار قیامت میں اس دن کے بارے میں بات کریں گے تو اسے روزِ جزاء سے تعبیر کریں گے (یا ویلنا ھٰذا یوم الدین) لیکن خدا یوم الفصل کے نام کے ساتھ اس کا ذکر کرتا ہے۔ (ھٰذا یوم الفصل)

ممکن ہے تعبیر کا یہ فرق اس لحاظ سے ہو کہ مجرمین تو صرف اپنی سزا اور عذاب کے بارے میں سوچتے ہیں لیکن خدا ایک زیادہ وسیع معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی اقسام میں سے ایک سزا و عذاب کا مسئلہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ قیامت کا دن جدائیوں کا دن ہے، ہاں! بدکاروں کی صفوں کی نیکوکاروں سے جدائی۔ جیسا کہ سورۂ یٰس کی آیہ ۵۹ میں بیان کیا گیا ہے۔

وامتازوا الیوم ایھا المجرمون

اے مجرمو! تم دوسروں سے الگ ہو جاؤ۔

کیونکہ یہ دارِ دنیا نہیں ہے، جس میں بدکار لوگ خود کو بندگانِ خدا کی صف میں قرار دیں اور کتنا دردناک ہے کہ وہ یہ مشاہدہ کریں گے کہ ان کے باایمان دوست و احباب، تعلق دار اور آل و اولاد ان سے جدا ہو کر جنت کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

علاوہ ازیں وہ دن حق کی باطل سے جدائی کا دن ہے۔ اس روز سچے اور جھوٹے طرزِ عمل، مخالف عقیدے اور مختلف مکاتبِ فکر عالم دنیا کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ ملے گی۔

ان سب چیزوں سے قطع نظر وہ دن، روزِ فصل، فیصلے کے دن کے معنی میں ہے یعنی عالم و عادل خدا اپنے بندوں کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت انتہائی منصفانہ حکم صادر فرمائے گا اور یہ وہ موقع ہوگا کہ مشرکین کے لیے ہر طرح کی رسوائی فراہم ہوگی۔

المختصر۔ اس دنیا کی طبیعت و مزاج حق و باطل کی آمیزش ہے جبکہ قیامت کی طبیعت و مزاج ان دونوں کی ایک دوسرے سے جدائی ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں قیامت کا ایک نام۔ جس کا بارہا تکرار ہوا ہے۔ "یوم الفصل" ہے اصولی طور پر وہ دن جس میں

---

[1] دخان ۔ ۴۰، مرسلات ۱۲، ۱۴، ۳۸ اور نبأ ۱۷

تمام چھپی ہوئی بائیں ظاہر ہو جائیں گی۔ وہاں مختلف صفوں میں موجود لوگوں کی جدائی یقینی امر ہے۔

اس کے بعد خدا ان فرشتوں کو جو مجرموں کو دوزخ کی طرف چلانے پر مامور ہیں حکم دے گا: ظالموں اور ان کے مانند کام کرنیوالوں کو اور جن کی وہ پرستش کیا کرتے تھے سب کو جمع کر دو (احشروا الذین ظلموا وازواجھم وما کانوا یعبدون)۔

ہاں! جن کی وہ خدا کے سوا پرستش کیا کرتے تھے انھیں چلتا کرو اور دوزخ کا راستہ دکھاؤ (من دون اللہ فاھدوھم الی صراط الجحیم)۔

"احشروا" "حشر" کے مادہ سے ہے اور مفردات میں راغب کے قول کے مطابق کسی گروہ کو اس کے مقام سے نکالنے اور انھیں میدانِ جنگ یا اسی قسم کی جگہ کی طرف روانہ کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ لفظ بہت سے مقامات پر جمع کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

بہرحال یہ گفتگو یا تو خدا کی طرف سے ہے یا فرشتوں کے ایک گروہ کی دوسرے گروہ سے ہے جو اکٹھا کرنے اور مجرموں کو دوزخ کی طرف چلانے پر مامور ہیں اور نتیجہ ایک ہی ہے۔

"ازواج" یہاں یا تو ان کی مجرم و بت پرست بیویوں کی طرف اشارہ ہے یا ان کے ہم فکر و ہم کار و ہم شکل لوگوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ لفظ دونوں معنی کے لیے آیا ہے، جیسا کہ سورہ واقعہ کی آیہ ۷ میں بیان ہوا ہے:

وکنتم ازواجًا ثلاثۃ

تم قیامت کے دن تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔

اس بنا پر مشرک مشرکوں کے ساتھ، بدکار و سیاہ دل اپنے جیسے بدکاروں اور سیاہ دلوں کے ساتھ اپنی اپنی صفوں میں جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔

یا اس سے وہ شیاطین مراد ہیں جو ان کے ہم شکل و ہم عمل تھے۔

اس کے باوجود یہ تینوں معانی ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آیت کے مفہوم میں تینوں جمع ہوں۔

"ما کانوا یعبدون" مشرکین کے معبودوں کی طرف اشارہ ہے چاہے وہ بت اور شیاطین ہوں یا فرعون و نمرود جیسے ظالم و جابر انسان ہوں اور "ما کانوا یعبدون" (وہ چیزیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے) کی تعبیر ہو سکتا ہے اس بنا پر ہو کہ ان کے معبود زیادہ تر بے جان اور غیر ذوی العقول موجودات ہی تھے اور یہ تعبیر اصطلاح کے مطابق "تغلیب" کے لیے ہے۔

"جحیم" دوزخ کے معنی میں "جحمہ" (بروزن ضربہ) کے مادہ سے "آگ بھڑکنے کی شدت" کے معنی سے لیا گیا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے: انھیں "صراط جحیم" کی طرف ہدایت کرو۔ کتنی عجیب عبارت ہے؟ ایک دن انھیں "صراط مستقیم" کی ہدایت کی گئی۔ لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا تو آج ان کی صراط جحیم کی طرف راہنمائی ہونا چاہیے اور وہ مجبور ہیں کہ اسے قبول کریں، یہ ایک ایسی گراں بار سرزنش ہے جو ان کی روح کی گہرائیوں کو جلا دے گی۔

تفسیر

دوزخ میں گمراہ پیشواؤں اور پیروکاروں کی گفتگو

جیسا کہ ہم گزشتہ آیات میں جان چکے ہیں کہ عذاب کے فرشتے ظالموں اور ان کے ہم خیالوں کو بتوں اور جھوٹے معبودوں کے ہمراہ اکٹھے چلتا کریں گے اور انھیں جہنم کی راہ پر ڈال دیں گے ۔

اس بات کو جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے : اس موقع پر خطاب ہوگا ، " انھیں روکو ابھی ان سے پوچھ گچھ ہونا ہے (وقفوھم انھم مسئولون)۔[1]

ہاں ! انھیں رک کر مختلف سوالات کا جواب دینا ہے ۔

لیکن ان سے کس چیز کے بارے میں سوال ہوگا ؟

بعض نے تو کہا ہے کہ ان بدعتوں کے بارے میں جو انھوں نے قائم کی تھیں ۔

بعض نے کہا ہے کہ ان کے بُرے اعمال اور خطاؤں کے بارے میں ۔

بعض نے مزید کہا ہے کہ توحید اور لا الٰہ الا اللہ کے بارے میں ۔

بعض نے کہا نعمتوں ، جوانی ، تندرستی ، عمر ، مال اور اسی قسم کی چیزوں کے بارے میں ۔

ایک مشہور و معروف روایت میں جو سُنی و شیعہ طرق سے منقول ہے ، یہ کہا گیا ہے کہ :

علیؑ کی ولایت کے بارے میں سوال ہوگا ۔[2]

البتہ یہ تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ اس دن ہر چیز کے بارے میں سوال ہوگا ۔ عقائد ، توحید ، ولایت علیؑ گفتار و کردار اور ان نعمتوں کے بارے میں جو خدا نے انسان کو عطا فرمائی ہیں ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں پہلے دوزخ کی طرف کیوں چلتا کریں گے اور پھر انھیں پوچھ گچھ کے لیے کیوں ٹھہرائیں گے ؟ کیا بازپرس اس کام سے پہلے نہیں ہونی چاہیے ؟

اس سوال کا دو طرح سے جواب دیا جا سکتا ہے :

پہلا یہ کہ اس گروہ کا جہنمی ہونا تو سب پر واضح ہے یہاں تک کہ خود ان پر بھی ۔ اور پوچھ گچھ اس بنا پر ہوگی تاکہ ان کے جرم کی

---

[1] "وقفوھم" وقف کے مادہ سے کبھی متعدی معنی میں استعمال ہوتا ہے (روک لینا اور بند کرنا) اور کبھی لازم کے معنی میں (رُکنا اور کھڑا ہو جانا) پہلے کا مصدر "وقف" اور دوسرے کا "وقوف" ہے ۔

[2] اس روایت کو "صواعق" میں ابو سعید خدری کے واسطے سے پیغمبر اکرمؐ سے اور اسی طرح حاکم ابوالقاسم حسکانی نے "شواہد التنزیل" میں آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے ۔ عیون اخبار الرضا میں بھی یہ روایت امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے نقل ہوئی ہے ۔

کیفیت وکمیت ان پر واضح کردی جائے۔

دوسرا یہ کہ سوالات فیصلہ اور انصاف کرنے کے لیے نہیں ہوں گے بلکہ یہ ایک طرح کی سرزنش اور روحانی سزا ہے۔

البتہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے، سوالات ان سے مربوط ہوں لیکن اگر وہ بعد والی آیت کے ساتھ مربوط ہوں کہ ان سے یہ سوال ہوگا "تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے"؟ تو اس صورت میں اس آیت میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی لیکن یہ تفسیر ان متعدد روایات کے ساتھ جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں، ہم آہنگ نہیں ہے، مگر یہ کہ یہ سوال بھی ان مختلف سوالات کا ایک جزو ہو جن سے یہ صورت اختیار کرتا ہے (غور کیجیے گا)۔

بہرحال جس وقت یہ بے بس دوزخی جہنم کی راہ پر چلتا کیے جائیں گے ان کا ہاتھ ہر طرف سے بے بس ہو جائے گا، انھیں کہا جائے گا: دنیا میں تو تم مشکلات کے وقت ایک دوسرے کی پناہ لیتے تھے اور دوسرے سے مدد طلب کرتے تھے" اب یہاں ایک دوسرے سے مدد کیوں نہیں مانگتے۔ (مالکم لاتناصرون)۔

ہاں! تم دنیا میں جتنے سہارے اپنے لیے خیال کرتے تھے یہاں وہ سب ختم ہو گئے۔ تم ایک دوسرے سے مدد لے سکتے ہو نہ ہی تمھارے معبود تمھاری مدد کو آسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ تو خود بے بس اور گرفتار ہوں گے۔

کہتے ہیں کہ ابوجہل نے بدر کے دن کہا تھا:

نحن جمیع منتصر

ہم سارے ایک دوسرے کی مدد سے مسلمانوں پر کامیاب ہوں گے۔

قرآنِ مجید نے اس کی گفتگو سورۂ قمر کی آیہ ۴۴ میں بیان کی ہے۔

ام یقولون نحن جمیع منتصر

لیکن قیامت میں ابوجہل اور اس کے ہم صفت لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ اب تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ لیکن ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوگا اور رسوا کن سکوت کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے۔

بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے:

بلکہ وہ تو اس دن خضوع وخشوع کے ساتھ سرِ تسلیم خم کیے ہوں گے اور مخالفت تو کجا ان میں اظہار وجوہ کی بھی سکت نہ ہوگی (بل ھم الیوم مستسلمون)۔[1]

---

[1] "استسلام" "سلامت" کے مادہ سے باب "استفعال" کے تقاضے کے مطابق سلامتی طلب کرنے کے معنی میں ہے جو عام طور پر ایک عظیم قدرت کے سامنے ہوتے وقت سرِ تسلیم خم کی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس موقع پر وہ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں گے اور ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن میں ڈالنے کے لیے بضد ہوگا ۔ پیروی کرنے والے، اپنے پیشواؤں اور سربراہوں کو قصوروار ٹھہرائیں گے اور پیشوا اپنے پیروکاروں کو جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : وہ ایک دوسرے کی طرف رُخ کریں گے اور ایک دوسرے سے سوال کریں گے (و اقبل بعضھم علی بعض یتساء لون)۔

گمراہ پیروکار اپنے گمراہ کرنے والے پیشواؤں سے "کہیں گے : تم شیطان صفت نصیحت، خیر خواہی اور ہمدردی کے نام پر اور ہدایت و رہنمائی کے بہانے ہمارے پاس آتے تھے" لیکن تمھارے کام میں مکر و فریب کے سوا اور کچھ نہیں تھا (قالوا انکم کنتم تأتوننا عن الیمین)۔

ہم تو فطرت کے تقاضے کے مطابق نیکی ، پاکیزگی اور سعادت کے طالب تھے لہذا ہم نے تمھاری دعوت پر لبیک کہا، ہمیں خبر نہ تھی کہ اس خیر خواہی کے چہرے کے پیچھے شیطان صفت چہرہ چھپا ہوا ہے، جو ہمیں بدبختی کے گڑھے میں گرا دے گا ۔ ہاں! ہمارے سارے کے سارے گناہ تمھاری ہی گردن پر ہیں ۔ ہمارا تو حسنِ نیت اور پاک دلی کے سوا کوئی جذبہ نہ تھا اور تم شیطان صفت جھوٹوں کے پاس بھی مکر و فریب کے سوا کچھ نہ تھا ۔

"یمین" کا لفظ جو "دایاں ہاتھ" یا "دائیں سمت" کے معنی میں ہے، عربوں میں بعض اوقات خیر و برکت اور نصیحت کے لیے کنائے کے طور پر بولا جاتا ہے اور اصولی طور پر عربوں کو جو کچھ دائیں طرف سے آتا تھا اسے "نیک فال" سمجھتے تھے ۔ اسی لیے بہت سے مفسرین نے "کنتم تأتوننا عن الیمین" کا معنی خیر خواہی اور نصیحت کا اظہار لیا ہے ۔

بہر حال یہ ایک عمومی رواج ہے کہ دائیں عضو اور دائیں طرف کو محترم اور بائیں کو غیر محترم خیال کرتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ "یمین" نیکیوں اور خیرات کے معنی میں بولا جاتا ہے ۔

کچھ مفسرین نے یہاں ایک دوسری تفسیر بھی بیان کی ہے، انھوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم طاقت اور اقتدار کے بل بوتے پر ہمارے پاس آتے تھے کیونکہ دائیں سمت عام طور پر زیادہ قوی ہوتی ہے ۔ اسی وجہ سے اکثر لوگ اہم کام دائیں ہاتھ سے ہی انجام دیتے ہیں اس لیے یہ تعبیر "طاقت" کے لیے کنائے کے طور پر آئی ہے ۔

دوسری تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں جو مذکورہ بالا دونوں تفسیروں کی طرف ہی لوٹتی ہیں لیکن بلا شک و شبہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے ۔

بہر حال ان کے پیشوا بھی خاموش نہیں رہیں گے اور جواب میں "کہیں گے تم تو خود ہی اہلِ ایمان نہیں تھے" (قالوا بل لم تکونوا مؤمنین)۔

اگر تمھارا مزاج آمادۂ انحراف نہ ہوتا، اگر تم خود ہی شر و شیطنت کے طالب نہ ہوتے تو ہمارے پاس کہاں آتے؟ تم نے انبیاء اور نیک و پاک لوگوں کی دعوت کو قبول کیوں نہ کیا؟ ہمارے ایک ہی اشارے پر تم سر کے بل کیوں دوڑ پڑے؟ پس معلوم ہوتا ہے

کہ خود تمھیں میں عیب تھا، جاؤ اور خود اپنے آپ کو ملامت کرو اور جو لعن طعن کرنا چاہتے ہو خود کو کرو۔

ہماری دلیل واضح ہے "ہم کسی قسم کا تسلط تم پر نہیں رکھتے تھے اور ہم نے تم پر کوئی جبر اور زبردستی نہیں کی تھی (و ما کان لنا علیکم من سلطان)۔

"بلکہ تم خود ہی ایک سرکش اور حد سے بڑھنے والی قوم تھے اور تمھاری ستم گری کی عادت تمھاری بدبختی کا سبب بنی (بل کنتم قوما طاغین)۔

کتنی دردناک ہے یہ بات کہ انسان یہ دیکھے کہ اس کا وہ رہبر و پیشوا جس کا وہ ایک عمر تک دل سے عقیدت مند رہا تھا، اس نے اس کی بدبختی کے اسباب فراہم کیے ہیں، اس کے بعد اس طرح سے اس سے بیزاری اختیار کر رہا ہے اور تمام گناہ اس کی گردن پر ڈال رہا ہے اور خود کو بالکل بری الذمہ قرار دے رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ ایک جہت سے سچ کہہ رہے ہوں گے نہ تو یہ بے گناہ ہیں اور نہ ہی وہ، ان کی طرف سے گمراہ کرنا اور شیطنت تھی اور ان کی طرف سے گمراہی کو اپنانا اور تسلیم کرنا تھا۔

لہٰذا ان باتوں کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور آخر کار یہ پیشوا اس حقیقت کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے: "اسی بنا پر، ہمارے پروردگار کا فرمان ہم سب پر لاگو ہو گیا ہے اور عذاب کا حکم سبھی کے لیے صادر ہو گیا ہے اور ہم سب اس کے عذاب کا مزہ چکھیں گے" (فحق علینا قول ربنا انا لذائقون)۔

تم سب کے سب سرکش تھے اور سرکشوں کا انجام یہی ہے اور بھی گمراہ اور گمراہ کرنے والے تھے۔

ہم نے تمھیں بھی گمراہ کیا ہے اور ہم تو خود گمراہ تھے ہی" (فاغویناکم انا کنا غاوین)۔

اس بنا پر اس میں تعجب کی کون سی بات ہے کہ ہم سب کے سب ان مصیبتوں اور عذاب میں شریک رہیں۔؟

چند اہم نکات

۱۔ ولایتِ علیؑ کے بارے میں بھی سوال ہوگا: جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں آیہ "وقفوھم انھم مسئولون" کی تفسیر کے بارے میں ایسی متعدد روایات وارد ہوئی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس دن مجرموں سے جو سوال پوچھے جائیں گے ان میں سے ایک (اہم سوال) امیر المومنین علی علیہ السلام کی ولایت کے بارے میں ہوگا۔

شیخ طوسی اپنی کتاب "امالی" میں انس بن مالک کے واسطے سے پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل کرتے ہیں:۔

اذا کان یوم القیامۃ و نصب الصراط علی جھنم لم یجز علیہ الا من معہ جواز فیہ ولایۃ علی بن ابی طالب و ذلک قولہ تعالیٰ: وقفوھم

انهم مسئولون یعنی عن ولایة علی بن ابی طالب (ع)

جب روز قیامت ہوگا اور صراط جہنم کے اوپر نصب کر دی جائے گی تو اس کے اوپر سے کوئی بھی عبور نہ کر سکے گا سوائے اس شخص کے جس کے ہاتھ میں ایسا پروانہ ہو کہ جس میں ولایت علیؑ ثبت ہو اور یہی وہ چیز ہے جس کے بارے میں خدا نے فرمایا ہے: وقفوهم انهم مسئولون [1]

اہل سنت کی بھی بہت سی کتابوں میں اس آیت کی یہ تفسیر موجود ہے کہ علیؑ بن ابی طالب کی ولایت کے بارے میں سوال ہوگا ابن عباس اور ابو سعید خدری کے واسطے سے پیغمبر گرامی اسلامؐ سے یہ روایات نقل ہوئی ہیں۔ اہل سنت کے جن حضرات نے اس حدیث کو نقل کیا ہے ان میں سے کچھ علماء یہ ہیں:۔

ابن حجر ہیثمی، صواعق محرقہ میں۔ (ص ۔ ۱۴۷)

عبدالرزاق حنبلی (کشف الغمہ، ص ۹۲ پر ان کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے)۔

علامہ سبط ابن جوزی، تذکرہ (ص ۲۱) میں۔

آلوسی، روح المعانی میں، زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

ابونعیم اصفہانی (کفایۃ الخصال ص ۲۶۰ کے مطابق) [2]

البتہ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے، اس قسم کی روایات آیات کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتیں بلکہ حقیقت میں آیات کے واضح مصداق کو بیان کرتی ہیں۔ اس بنا پر کوئی امر مانع نہیں ہے کہ سوال تو تمام عقائد کے بارے میں ہی ہو لیکن چونکہ عقائد کی بحث میں ولایت کا مسئلہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے لہٰذا اسے خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ولایت ایک عام دوستی یا خشک اعتقاد کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد پیغمبر گرامی اسلامؐ کے بعد اعتقادی، عملی، اخلاقی اور اجتماعی مسائل میں علی علیہ السلام کی رہبری اور امامت کو قبول کرنا ہے۔ وہ مسائل جن کے نمونے نہج البلاغہ کے فصیح و بلیغ خطبوں اور آپؑ سے منقول کلمات و ارشادات میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ ایسے مسائل ہیں جن پر ایمان لانا اور ان کے مطابق عمل کرنا، دوزخیوں کی صف سے نکلنے اور پروردگار کی صراط مستقیم میں قرار پانے کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔

۲۔ **گمراہ پیشوا اور پیروکار**: ان آیات میں اور قرآن مجید کی دوسری آیات میں قیامت کے دن یا جہنم میں گمراہ پیشواؤں اور پیروکاروں کے آپس میں جھگڑنے کے بارے میں کچھ معنی خیز اشارے کیے گئے ہیں۔

یہ ان تمام لوگوں کے لیے جو اپنی عقل اور دین کو گمراہ رہبروں کے اختیار میں دے دیتے ہیں ایک سبق آموز تنبیہ ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۰۱

[2] اس بارے میں مزید معلومات کے لیے، بہترین کتاب "احقاق الحق" جلد ۳ (طبع جدید) ص ۱۰۴ اور المراجعات ص ۵۰ (مراجعہ ۱۲) کی طرف رجوع فرمائیں۔

اس دن اگرچہ ہر شخص یہی کوشش کرے گا کہ دوسرے سے برأت کرے، یہاں تک کہ اپنا گناہ بھی دوسرے ہی کی گردن پر ڈال دے لیکن اس کے باوجود کوئی بھی اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکے گا۔

زیر بحث آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ گمراہ کرنے والے پیشوا اپنے تابعین کو صراحت کے ساتھ کہیں گے کہ تم پر ہمارے اثر کا اصل سبب خود تمھاری سرکشی ہی تھی (بل کنتم قوماً طاغین)

اس سرکشی ہی نے ہماری طرف سے گمراہ کرنے کا میدان ہموار کیا اور اسی سے وہ انحرافات جو ہم میں پائے جاتے تھے تمھاری طرف منتقل کرنے پر ہم قادر ہوئے۔ (فاغوینا کم انا کنا غاوین)

"اغوا" "غی" کے مادہ سے ہے۔ اس کے دقیق معنی پر غور کیا جائے تو مطلب اور بھی زیادہ واضح و روشن ہو جاتا ہے کیونکہ "غی" "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق اس جہالت کے معنی میں ہے، جس کا سرچشمہ فاسد عقیدہ ہو۔ یہ گمراہ پیشوا عالم ہستی اور زندگی کے حقائق سے بے خبر رہ گئے اور اس جہالت اور اعتقاد فاسد کو اپنے ان پیروکاروں میں منتقل کر دیا جو فرمانِ خدا کے مقابلہ میں پہلے ہی سرکش کیے ہوئے تھے۔

اسی بنا پر وہاں یہ اعتراف کریں گے کہ وہ خود بھی عذاب کے مستحق ہیں اور ان کے پیروکار بھی (فحق علینا قول ربنا انا لذائقون) لفظ "رب" کا خاص طور پر ذکر کرنا پُر معنی ہے، یعنی انسان کا معاملہ اس حد تک پہنچ جائے گا کہ وہ خدا جو اس کا مالک و مربی ہے اور جو اس کی بھلائی اور نیکی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا، اسے اپنے دردناک عذاب کا مستحق قرار دے دیگا اور یقیناً یہ بھی اس کی ربوبیت کی ایک شان ہے۔

تفسیر

گمراہ پیشواؤں اور ان کے پیروکاروں کا انجام

قیامت کے دن جہنم کے پاس گمراہ پیروکاروں اور پیشواؤں کے جھگڑا کرنے کے بیان کے بعد۔ اب زیر بحث آیات میں دونوں گروہوں کا انجام ایک ہی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ نیز ان کی بدبختی کے عوامل کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ ان میں گویا مرض کا بیان بھی ہے اور علاج کا ذکر بھی۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ سب کے سب، پیرو اور پیشوا، اس دن عذابِ الٰہی میں مشترک ہوں گے (فانّھم یومئذٍ فی العذاب مشترکون)۔

البتہ ان کا عذاب میں مشترک ہونا، دوزخ اور عذابِ الٰہی میں ان کے مختلف درجات میں مانع نہیں ہے۔ کیونکہ یقینی طور پر ایسا شخص جو ہزارہا انسانوں کی گمراہی اور انحراف کا سبب بنا ہے ہرگز سزا اور عذاب میں ایک عام گمراہ فرد کے برابر نہیں ہوگا۔

یہ آیت حقیقت میں سورۂ مومن کی آیہ ۴۸ کے مانند ہے کہ جس کے مطابق متکبرین کمزور عقیدہ لوگوں کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کے بعد کہیں گے:

قال الذین استکبروا انّا کلّ فیھا ان اللہ قد حکم بین العباد

اب تو ہم سب ہی دوزخ میں ہیں کیونکہ خدا نے اپنے بندوں کے درمیان عادلانہ فیصلہ کر دیا ہے۔

اور یہ بات سورۂ عنکبوت کی آیہ ۱۳ سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی جس میں فرمایا گیا ہے:

ولیحملن اثقالھم و اثقالاً مع اثقالھم

وہ قیامت کے دن اپنا سنگین بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے اور ان کے اپنے سنگین بار پر دوسروں کے بار کا بھی اضافہ ہوگا۔

جو دوسروں کو گمراہ کرنے اور گناہ کی طرف مائل کرنے اور بدعت کی بنیاد رکھنے کے نتیجہ میں حاصل ہوا ہے۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے قرآن فرماتا ہے: ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں (انّا کذالک نفعل بالمجرمین)۔

یہ ہماری ہمیشہ کی سنت ہے، وہ سنت جو قانون عدالت سے پیدا ہوئی ہے۔

اس کے بعد ان کی بدبختی کی اصل بنیاد کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ ایسے تھے کہ جب کلمہ توحید اور لا الٰہ الّا اللہ ان سے کہا جاتا تھا تو وہ تکبر و استکبار کرتے تھے (انّھم کانوا اذا قیل لھم لا الٰہ الّا اللہ یستکبرون)۔

ہاں! ان کے تمام انحرافات کی اصل جڑ بنیاد، تکبر اور خود کو برتر سمجھنا، حق کو قبول نہ کرنا، غلط طریقوں اور باطل کی پیروی پر اصرار اور ہٹ دھرمی کرنا اور اس کے علاوہ تمام چیزوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا تھا۔

روحِ استکبار کا مدِ مقابل حق کے سامنے انکساری اور سرِ تسلیم خم کرنا ہی ہے اور حقیقتاً اسلام یہی ہے اور بس۔ وہ استکبار بدبختی کا باعث ہے اور یہ خضوع و تسلیم، سعادت کا موجب ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں، عذابِ الٰہی استکبار کے ساتھ مربوط بیان ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ احقاف کی آیہ ۲۰ میں ہے:۔

فالیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق

آج کے دن ذلیل کرنے والا عذاب تمھاری جزا ہے، کیونکہ تم زمین میں ناحق استکبار کیا کرتے تھے۔

جبکہ وہ اپنے اس عظیم گناہ کے لیے بدتر از گناہ عذر پیش کیا کرتے تھے اور ہمیشہ یہی کہتے تھے: کیا ہم اپنے خداؤں اور بتوں کو ایک دیوانے شاعر کے لیے چھوڑ دیں؟ (و یقولون ائنا لتارکوا الھتنا لشاعر مجنون)۔

وہ رسول اللہؐ کو اس لیے شاعر کہتے تھے کہ آپ کی باتیں اس طرح دلوں پر اثر کرتی تھیں اور انسانوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں کہ جیسے آپ بہترین اشعار پڑھ رہے ہوں، حالانکہ آپ کی باتیں بالکل شعر نہیں تھیں اور انھیں مجنون اس لیے کہتے تھے کہ آپؐ ماحول کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے تھے اور وہ ہٹ دھرم متعصب لوگوں کے بیہودہ عقائد کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ ایسا کام تھا جو گمراہ عوام کی نگاہ میں ایک قسم کی جنون آمیز خودکشی تھی۔ حالانکہ پیغمبرؐ کا عظیم افتخار یہی ہے کہ آپؐ ان حالات کے سامنے نہیں جھکے۔

اس کے بعد قرآن ان بے بنیاد باتوں کی نفی کرنے اور پیغمبر اکرمؐ کی رسالت اور مقامِ وحی کا دفاع کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: ایسا نہیں ہے وہ تو حق لے کر آیا ہے اور اس نے گزشتہ پیغمبروں کی تصدیق کی ہے۔ (بل جاء بالحق و صدق المرسلین)۔

ایک طرف تو اس کی گفتگو کے مطالب اور دوسری طرف اس کی انبیاء کی دعوت کے ساتھ ہم آہنگی اس کی گفتگو کی صداقت کی دلیل ہے۔

لیکن اے دل کے اندھے مستکبر، اور بدزبان گمراہو! تم یقینی طور پر خدا کا دردناک عذب چکھو گے (انکم لذائقوا العذاب الالیم)

لیکن کہیں یہ گمان نہ کرلینا کہ خدا بھی انتقام جو ہے اور وہ تم سے اپنے پیغمبر کا انتقام لینا چاہتا ہے ایسا نہیں ہے، بلکہ "جو اعمال تم انجام دیا کرتے تھے بدلہ تو تمھیں صرف اسی کا ملے گا (و ما تجزون الّا ما کنتم تعملون)۔

حقیقت میں وہ تمھارے اعمال ہی ہوں گے جو تمھارے سامنے مجسم ہوجائیں گے اور تمھارے ساتھ رہیں گے۔ اور تمھیں آزار پہنچاتے رہیں گے۔ تمھارا عمل ہی تمھاری سزا ہے، وہی استکبار و کفر و بے ایمانی، وہی آیاتِ الٰہی اور اس کے پیغمبر پر شاعری اور جنون کی تہمت باندھنا، وہی ظلم و زیادتی، بے انصافیاں اور بُرے کام۔

آخری زیرِ بحث آیت میں آئندہ کے مباحث کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہے۔ اس میں ایک گروہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پروردگار کے مخلص بندوں کے سوا، جو اس تمام تر سزا و عذاب سے دور اور محفوظ رہیں گے (الّا عباد اللہ المخلصین)۔[1]

لفظ "عباد اللہ" اکیلا ہی اس گروہ کے خدا سے ربط کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن جب "مخلصین" بھی اس کے ساتھ ہو تو اس میں ایک اور ہی گہرائی اور جان ڈال دیتا ہے۔ وہ لفظ "مخلص" اسم مفعول کی صورت میں، وہ شخص جسے خدا نے خاص کیا ہے۔ ہر قسم کے شرک و ریا سے خالص، اور ہر قسم کے شیطانی وسوسوں اور ہوائے نفس کی ملاوٹوں سے خالص۔

ہاں! صرف یہی گروہ ہے کہ جسے اس کے اعمال کی ہی جزا نہیں ملے گی بلکہ خدا اس سے اپنے فضل و کرم کے ساتھ پیش آئے گا اور وہ بے حساب اجر حاصل کریں گے۔

نکتہ: مخلصین کا اجر و ثواب

قرآن کریم کی آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "مخلص" زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوا ہے، جب انسان تربیت و اصلاح اور خود سازی کے مرحلوں میں ہوتا ہے اور ابھی ضروری تکامل دار تقاء کی منزل تک پہنچا ہوا نہیں ہوتا۔ لیکن "مخلص" اس مرحلے کے لیے کہا جاتا ہے، جب انسان ایک مدت تک جہاد بالنفس کرنے اور معرفت و ایمان کے مراحل طے کرنے کے بعد اس منزل پر فائز ہوجاتا ہے جہاں شیطان کے وسوسوں کے اثر سے محفوظ ہوجاتا ہے جیسا کہ قرآن ابلیس کے قول کو نقل کرتا ہے۔

فبعزتك لاغوينهم اجمعين الّا عبادك منهم المخلصين

تیری عزت کی قسم! تیرے مخلص بندوں کے سوا میں ان سب کو گمراہ کردوں گا (ص ۔ ۸۲، ۸۳)

یہ جملہ جو بارہا قرآن کی آیات میں آیا ہے "مخلصین" کے مقام کی عظمت کو واضح کرتا ہے۔ یہ یوسفؑ جیسے صدیق افراد کا مقام ہے جو عظیم آزمائش کے میدان کو عبور کرتے ہیں:۔

كذلك لنصرف عنه السوء والفحشاء انّه من عبادنا المخلصين

ہم نے یوسفؑ کو اس طرح سے اپنی برہان دکھائی تاکہ برائی اور بدی کو ہم اس سے دُور کردیں،

---

[1] یہ جملہ استثناءِ منقطع کی شکل میں ہے جو "تجزون" کی ضمیر یا "لمحضرون" کی ضمیر سے استثناء ہے۔

کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا (یوسف۔۲۴)

یہ ان لوگوں کا مقام ہے جو جہاد اکبر میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور لطفِ پروردگار کا ہاتھ، تمام غیر خالص باتوں کو ان کے وجود سے پاک کر دیتا ہے اور حوادث کی بھٹی میں وہ اس طرح سے نکھر جاتے ہیں کہ معرفتِ خالص کے سونے کے سوا ان میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ان کا اجر عمل کے معیار پر نہیں ہوتا بلکہ خدا کے فضل و رحمت کے معیار پر ہوتا ہے۔

علامہ طباطبائی نے اس مقام پر ایک بات کہی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

خدا زیر بحث آیت میں فرماتا ہے تمام لوگ اپنے اعمال کا اجر پائیں گے، خدا کے مخلص بندوں کے سوا۔

کیونکہ وہ اپنی عبودیت کی بنا پر خود کو کسی چیز کا مالک نہیں سمجھتے اور جو کچھ خدا چاہتا ہے اس کے سوا کسی اور چیز کا ارادہ نہیں کرتے اور جس چیز کا وہ مطالبہ کرتا ہے اس کے سوا کسی اور چیز کو انجام نہیں دیتے۔

مخلص ہونے کی بنا پر خدا نے انھیں اپنے لیے منتخب کر لیا ہے، وہ اس کی پاک ذات کے سوا کسی اور چیز کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے۔

ان کے دل میں اللہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہے، نہ زرق و برق دنیا ہے اور نہ ہی آخرت کی نعمتوں کا خیال۔

اب یہ بات واضح ہے کہ جو شخص ان صفات کا حامل ہے اس کی لذت و نعمت اور روزی ایسی چیز ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہے۔ جیسا کہ بعد والی آیات میں بیان ہوا ہے:۔

اولئك لهم رزق معلوم

ان کی روزی ایسی خاص اور مخصوص ہے کہ جو دوسروں سے جدا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ بھی دوسرے اہلِ بہشت کی طرح بہشت میں زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ان کا حصہ دوسروں کے حصے کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔ (وہ خدا کی پاک ذات کے جلووں سے باطنی لذات سے محظوظ ہوتے ہیں اور ان کا دل اس کے پیمانۂ شوق سے لبریز ہوتا ہے اور وہ اس کے عشق و وصال میں غرق ہوتے ہیں)[1]

---

[1] المیزان جلد ۱۷ ص ۱۴۱

٤١۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ۙ
٤٢۔ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ۙ
٤٣۔ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۙ
٤٤۔ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ
٤٥۔ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ
٤٦۔ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ
٤٧۔ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ
٤٨۔ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۙ
٤٩۔ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ

ترجمہ

٤١۔ ان (مخلص بندوں) کے لیے ایک خاص اور معیّن روزی ہے۔
٤٢۔ (قسم قسم کے عمدہ عمدہ) پھل اور وہ معزز و محترم ہوں گے۔
٤٣۔ (بہشت کے) پُرنعمت باغوں میں۔
٤٤۔ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے (بیٹھے ہوں گے)۔
٤٥۔ ان کے گرد شراب طہور سے لبریز پیالوں کا دور ہوگا۔
٤٦۔ وہ شراب جو سفید چمکدار اور پینے والوں کے لیے لذّت بخش ہوگی۔
٤٧۔ وہ شراب جس میں نہ عقل کو فاسد کرنے والی کوئی چیز ہوگی اور نہ ہی وہ مست کرنے والی ہوگی۔
٤٨۔ ان کی ایسی بیویاں ہوں گی جو اپنے شوہر کے سوا کسی اور سے عشق و محبت نہ کریں گی۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی (اور حسین) ہوں گی۔

۴۹۔ گویا وہ (لطافت اور سفیدی میں) پرندے کے ان انڈوں کے مانند ہیں (جو پرندے کے پر و بال کے نیچے) چھپے رہے ہوں۔ (اور کسی انسان کے ہاتھ نے انھیں چھوا تک نہ ہو)۔

تفسیر

بہشت کی نعمتوں کا ایک گوشہ

گزشتہ بحث کی آخری آیت میں "عباد اللہ المخلصین" کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ زیر بحث آیات ان بے شمار نعمتوں کو بیان کر رہی ہیں جو خدا ان کو عطا فرمائے گا۔ ان نعمتوں کا سات حصّوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلے قرآن کہتا ہے: ان کے لیے معلوم و معیّن روزی ہے (اولئک لھم رزق معلوم)۔

کیا یہ انھی نعمتوں کا خلاصہ ہے جنکی بعد والی آیات میں تشریح ہوئی ہے اور وہ انھی نعمتوں کو بیان کر رہی ہیں جو یہاں سربستہ اور اجمالی طور پر بیان ہوئی ہیں؟

یا یہ ان نامعلوم اور ناقابلِ توصیف نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو نعماتِ بہشت کا سرنامہ بن گئی ہیں؟

بعض مفسّرین نے اس کی پہلی صورت میں تفسیر کی ہے جب کہ بعض دوسروں نے اس کی دوسری صورت میں تفسیر کی ہے۔

بحث کی مناسبت اور نعمتوں کی جامعیت دوسرے معنی کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اس طرح سے ان سات نعمتوں میں سے سب سے پہلے زیر بحث آیات میں بیان ہونے والی نعمتیں۔ معنوی نعمتیں، روحانی لذتیں اور حق تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے جلووں کا دیدار اور اس کے عشق کے بادۂ طہور سے سرمست ہونا ہے۔ وہی لذت جسے دیکھے بغیر کوئی نہیں جانتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن کی آیات میں جنت کی نعمات تو تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، لیکن معنوی نعمتوں اور روحانی لذتوں کا بیان سربستہ اور اجمالی صورت میں کیا گیا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی نعمات تو قابلِ توصیف و تعریف ہیں، جبکہ دوسری تعریف و توصیف میں نہیں آسکتیں۔

"رزق معلوم" کے معنی کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ کیا اس کا وقت معلوم ہے؟ کیا وہ باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہیں؟ کیا اس کی تمام خصوصیات معلوم ہیں؟ اس ضمن میں ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں اس کی بنا پر کلمہ "معلوم" ایک سربستہ تعبیر ہے ان نعمات کی جن کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد دوسری نعمتوں کا بیان شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے قرآن بہشت کی نعمتوں کا نام لیتا ہے۔ نعمتیں بھی ایسی جو بہشتیوں کو انتہائی احترام کے ساتھ دی جائیں گی، فرماتا ہے: ان کے لیے طرح طرح کے پھل ہیں (فواکہ)۔

شرابِ طہور کے چشمے جاری ہیں۔ جن سے ہر لمحہ پیمانے بھر سکتے ہیں اور اہلِ بہشت کے گرداگرد انھیں گردش دی جائے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ شرابِ طہور ختم ہو جائے یا اسے مہیا کرنے کے لیے زحمت اٹھانا پڑے یا وہ پرانی، خراب اور فاسد ہو جائے۔

اس کے بعد اس شرابِ طہور کے برتنوں کی تعریف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ سفید چمک دار ہیں اور پینے والوں کے لیے لذت بخش ہیں۔ (بیضاء لذۃ للشاربین)۔

بعض مفسرین نے "بیضاء" کو اس شراب کے "ظروف" کی صفت قرار دیا ہے اور بعض نے خود "شرابِ طہور" کی صفت کہا ہے یعنی یہ شراب دنیا کی خوش رنگ شرابوں کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی شراب ہے جو پاک ہے اور شیطانی رنگوں سے پاک سفید و شفاف ہے۔

البتہ دوسرا معنی "لذۃ للشاربین" کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

چونکہ شرابِ پیمانہ اور اس قسم کی چیزوں کا نام ممکن ہے کچھ اور مفاہیم کو ذہنوں کی طرف دعوت دے اس لیے بعد والی آیت میں بلا فاصلہ ایک مختصر اور واضح جملے کے ساتھ ان تمام مفاہیم کو سننے والوں کے اذہان سے ہٹاتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ شرابِ طہور نہ تو فسادِ عقل کا سبب ہے اور نہ ہی مستی کا موجب (لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون)۔

اس میں ہوشیاری و نشاط اور لذتِ روحانی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

"غول" (بروزن "قول") اصل میں اس فساد کے معنی میں ہے جو پنہاں طور پر کسی چیز میں اُتر جائے اور یہ جو عربی ادب میں مخفی اور پوشیدہ قتل کو "غیلۃ" کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہے۔

"ینزفون" اصل میں "نزف" (بروزن "حذف") کے مادہ سے، کسی چیز کو تدریجی صورت میں ختم کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ جس وقت کنوئیں کے پانی کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ پانی کو تدریجاً کنوئیں سے نکالیں یہاں تک کہ وہ ختم ہو جائے۔ تدریجی طور پر خون نکلنے کے موقع پر بھی جو بدن کے سارے خون کے گرانے پر ختم ہو "نزف الدم" کی تعبیر استعمال ہوتی ہے۔

بہرحال زیرِ بحث آیت میں اس سے مراد عقل کا تدریجاً ختم ہونا اور سکرات کی حد تک پہنچ جانا ہے، جو جنت کی شرابِ طہور میں مطلقاً موجود نہیں ہے۔ اس سے نہ عقل میں کمی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی خرابی پیدا کرتی ہے۔

یہ دونوں تعبیریں ضمنی طور پر دنیا کی شرابوں اور موادِ الکحل کے بارے میں، بہت ہی عمدہ اور دقیق بیان ہے کہ وہ مخفی طور پر تدریجی صورت میں انسان کے وجود میں اثر کرتی ہیں اور برائی اور خرابی پیدا کرتی ہیں، نہ صرف عقل اور سارے اعصاب کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں بلکہ انسان کے بدن کی تمام مشینری کو دل سے لے کر رگوں تک اور معدے سے لے کر جگر اور گردوں تک ایک ناقابلِ انکار تخریبی اور تباہ کن تاثیر رکھتی ہیں۔ گویا انسان کو اندر ہی اندر خراب کر کے تباہ کر دیتی ہیں۔

اس کے علاوہ شرابِ دنیا انسان کے عقل و ہوش کو کنوئیں کے پانی کی طرح بتدریج کھینچتی ہے تاکہ اسے خشک اور

خالی کردے۔

لیکن خدائی شراب طہور قیامت میں، ان تمام صفات سے پاک ہے [1]

آخر کار قرآن چھٹے مرحلے میں جنت کی پاک و پاکیزہ بیویوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ان کے پاس ایسی بیویاں ہوں گی جو اپنے شوہروں کے سوا کسی اور سے محبت نہیں کرتیں، ان کے غیر کو نگاہ تک اٹھا کر نہیں دیکھتیں اور ان کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت ہیں (وعندھم قاصرات الطرف عین)۔

"طرف" اصل میں آنکھوں کی پلکوں کے معنی میں ہے اور چونکہ دیکھتے وقت پلکیں حرکت کرتی ہیں لہذا یہ لفظ دیکھنے کے لیے کنایہ ہے۔ اس بنا پر "قاصرات الطرف" کی تعبیر ان عورتوں کے معنی میں ہے جو نظریں نیچی رکھتی ہیں۔ اس کی تفسیر میں کئی ایک احتمال ذکر کیے گئے ہیں جو علیحدہ علیحدہ ہونے کے باوجود سب مراد ہو سکتے ہیں۔

پہلی تفسیر یہ ہے کہ وہ صرف اپنے شوہروں کی طرف ہی دیکھتی ہیں، اپنی آنکھوں کو ہر طرف سے ہٹا کر، انھیں کو دیکھتی رہتی ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ وہ صرف اپنے شوہروں سے محبت کرتی ہیں اور ان کی محبت کے علاوہ ان کے دل میں کسی دوسرے کی محبت نہیں ہے یہ امر ایک بیوی کے لیے عظیم ترین امتیاز ہے کہ وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی کو اپنے وہم و خیال میں بھی نہ لائے اور اس کے علاوہ کسی اور سے پیار نہ ہو۔

ایک اور تفسیر یہ ہے کہ ان کی آنکھیں خمار آلود ہیں، وہی خاص حالت جو شعراء کے اکثر اشعار میں آنکھ کی ایک خوبصورت توصیف کے طور پر بیان ہوئی ہے [2]

البتہ پہلا اور دوسرا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اگرچہ ان معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

لفظ "عین" (بروزن "عین") جمع ہے "عیناء" کی جو بڑی آنکھ والی عورت کے معنی میں ہے۔

آخر میں آخری زیر بحث آیت، ان جنتی بیویوں کی ایک اور صفت کو بیان کرتے ہوئے ان کی پاکیزگی کو اس عبارت کیساتھ

---

[1] "فیھا" اور "عنھا" کی ضمیریں "خمر" کی طرف لوٹتی ہیں، جو کلام میں مذکور نہیں ہے لیکن سیاق کلام سے معلوم ہو جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ لفظ "خمر" مؤنث مجازی ہے اور "عنھا" میں "عن" کی علت کو بیان کرنے کیلیے ہے یعنی وہ اس "خمر" کی وجہ سے مست اور محروم عقل و ہوش نہیں ہوں گے یہ بات ذہن میں رہے کہ لفظ "خمر" ایک مشترک لفظ ہے جو کبھی تو مضر و ہوش اڑانے اور عقل کو تباہ کرنے والی شراب کے لیے بولا جاتا ہے، مثلاً۔

انما الخمر والمیسر.... (مائدہ: ۹۰)

اور کبھی شراب طہور پر جو خدا کے مخلص بندوں کا حصہ ہے مثلاً

وانھار من خمر لذۃ للشاربین (محمد: ۱۵)

جو جنت کی تعریف میں آئی ہے۔

[2] "روح المعانی" جلد ۲۳ ص ۱۸

بیان کرتی ہے: ان کا بدن بہت زیادہ پاکیزگی، عمدگی، سفیدی اور صفائی میں پرندے کے ان انڈوں کی طرح ہے کہ جسے نہ انسانی ہاتھ نے چھوا ہو اور نہ ہی اس پر گرد و غبار پڑا ہو، بلکہ وہ پرندے کے پر و بال کے نیچے پوشیدہ رہے ہوں (کانھن بیض مکنون)۔

"بیض" جمع ہے "بیضۃ" کی جو پرندے کے انڈے کے معنی میں ہے (ہر قسم کا پرندہ) اور "مکنون" "کن" (بروزن جن) پوشیدہ اور چھپے ہوئے کے معنی میں ہے۔

قرآن کی یہ تشبیہ اس وقت ٹھیک طرح سے واضح ہوگی جب انسان ان لمحات میں، جب انڈہ پرندے سے جدا ہو اور ابھی انسانی ہاتھ اسے نہ لگا ہو اور وہ ابھی پرندے کے پروں کے نیچے ہی پڑا ہو، اسے نزدیک سے دیکھے کہ وہ کیسی عجیب شفافیت صفائی رکھتا ہے۔

بعض مفسرین نے "مکنون" کو پرندے کے انڈے کے اندر موجود مواد کے معنی میں لیا ہے جو اس کے چھلکے کے اندر چھپا ہوا ہے اور حقیقتاً مذکورہ تشبیہ اس موقع کی طرف اشارہ ہے جب انڈے کو پکا کر اس کا چھلکا ایک ہی ساتھ جدا کر دیا جائے تو اس حالت میں سفیدی اور چمک کے علاوہ ایک خاص نرمی اور لطافت بھی اس میں ہوتی ہے۔ بہرحال قرآن کی تعبیرات حقائق بیان کرنے میں اس قدر عمیق، گہری اور معنی خیز ہیں کہ ایک مختصر سی تعبیر کے ساتھ بہت سے مطالب کو ایک لطیف انداز میں پیش کر دیتی ہیں۔

نکتہ: گزشتہ آیات پر ایک نظر

اہل بہشت کے لیے جو طرح طرح کی نعمتیں گزشتہ آیات میں بیان ہوئی ہیں وہ مادی و روحانی نعمتوں کا مجموعہ ہیں اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ پہلی نعمت جو "اولئك لھم رزق معلوم" کے سربستہ جملہ سے معلوم ہوتی ہے وہ معنوی و روحانی نعمتوں کے ساتھ مربوط ہے جس کی کسی زبان میں بھی تشریح نہیں کی جا سکتی۔

لیکن پھل دوسرے حصے جو جنت کے پھل، شراب طہور، خوبصورت بیویاں، بہت احترام، پاکیزہ مسکن اور لائق ہمسفر ہیں، جنت کی نعمتوں کے مختلف جہات کو واضح کرتے ہیں جو غالباً مادی و روحانی نعمتوں کا ایک امتزاج ہے۔

لیکن یہ سب کی سب ایسی باتیں ہیں جو ہماری زبان میں پیش کی گئی ہیں اور یہ جنت کی نعمتوں کی تمام خصوصیات کو منعکس نہیں کر سکتیں۔ اصولی طور پر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کے لیے ایک دوسری زبان، دوسرے کان دوسرے ادراک اور دوسری نظر کی ضرورت ہے اور اس کے لیے دوسرے ہی الفاظ، جملہ بندیاں اور گفتگو درکار ہے تاکہ اس حقیقت کو تفصیل کے ساتھ بیان کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں جنت کی نعمتوں کی اصل حقیقت دنیا والوں سے وہاں جا کر انھیں دیکھے اور حاصل کیے بغیر پوشیدہ رہے۔

بہرحال "مخلص بندے" اور وہ لوگ جو علم و ایمان میں کمال کے مرحلے تک پہنچے ہوئے ہیں، بارگاہِ خداوندی میں اس قدر عزیز ہیں کہ ان کے لیے خدا کے الطافِ بے کراں کی توصیف ہو ہی نہیں سکتی اور ہم جتنا بھی سوچیں اور تصور میں لائیں وہ اس سے برتر و بالا ہیں۔

۵۰۔ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○
۵۱۔ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ ○
۵۲ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ○
۵۳۔ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ○
۵۴۔ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ○
۵۵۔ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِىْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ○
۵۶۔ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ○
۵۷۔ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّىْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ○
۵۸۔ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ○
۵۹۔ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ○
۶۰۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○
۶۱۔ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ○

ترجمہ

۵۰۔ (اس حال میں جبکہ وہ اپنی باتوں میں مگن ہوں گے تو) بعض لوگ دوسرے بعض لوگوں کی طرف رُخ کر کے سوال کریں گے.....
۵۱۔ ان میں سے ایک کہے گا: میرا ایک ساتھی تھا۔
۵۲۔ جو ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا: کیا (سچ مچ) تو نے بھی بات کو مان لیا ہے؟.....
۵۳۔ کہ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو (دوبارہ) زندہ کیے جائیں گے اور ہمیں

جزا و سزا دی جائے گی ؟

۵۴۔ (اس کے بعد) کہے گا : کیا تم اس کی کوئی خبر لا سکتے ہو ؟

۵۵۔ اس موقع پر وہ تلاش کرنے لگے گا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائے گا تو اچانک اسے جہنم کے وسط میں دیکھے گا۔

۵۶۔ اسے دیکھ کر وہ کہے گا : خدا کی قسم کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی کہ تو مجھے بھی جہنم کی طرف کھینچ لے جائے۔

۵۷۔ اور اگر میرے پروردگار کی نعمت اور احسان نہ ہوتا تو میں بھی جہنم میں حاضر کیے جانے والوں میں سے ہوتا۔

۵۸۔ (اے دوستو !) کیا ہم اب کبھی نہیں مریں گے (اور دائمی جنت میں رہیں گے) ؟

۵۹۔ اور اس پہلی موت کے سوا اب اور کوئی موت ہمارے پاس نہیں آئے گی اور ہمیں کبھی سزا نہیں دی جائے گی (خدا کی یہ میرے لیے کیسی نعمت ہے)

۶۰۔ سچ مچ یہ تو بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔

۶۱۔ ہاں ! کوشش کرنے والوں کو ایسی جزا کے لیے کوشش اور عمل کرنا چاہیے۔

تفسیر

جہنمی دوست کی تلاش

گزشتہ آیات میں پروردگار کے مخلص بندوں کا ذکر تھا جو جنت کی طرح طرح کی نعمتوں میں غرق ہوں گے انھیں قسم قسم کے پھل میسر ہوں گے، جنت کی حوریں ان کی خدمت میں ہوں گی۔ شراب طہور کے جام ان کے گرد گردش میں ہوں گے اور وہ جنت کے تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے باصفا دوستوں کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مشغول ہوں گے ایسے میں اچانک ان میں سے بعض اپنے ماضی اور دنیا کے دوستوں کی سوچ میں پڑ جائیں گے وہی دوست جنھوں نے اپنی راہ الگ کر لی تھی اور جنت میں جن کی جگہ خالی پڑی ہوگی وہ ان کا انجام جاننے کی کوشش کریں گے۔

ہاں ! اس وقت جبکہ " وہ گفتگو میں محو ہوں گے اور مختلف موضوعات پر بات کر رہے ہوں گے اور بعض دوسرے بعض کی طرف رُخ کر کے سوال کر رہے ہوں گے اور ان کے جواب سن رہے ہوں گے (فاقبل بعضھم علی بعض یتساء لون)۔

اس موقع پر وہ اپنے جہنمی دوست کی طرف رُخ کرے گا اور یہ بات سرزنش کے طور پر اسے یاد دلاتے ہوئے کہے گا: کیا تو ہی دنیا میں یہ نہیں کہا کرتا تھا کہ" ہم کبھی نہیں مریں گے (افما نحن بمیتین)۔

سوائے اس پہلی دنیاوی موت کے اور اس کے بعد نہ کوئی نئی زندگی ہوگی اور نہ ہی ہمیں عذاب دیا جائے گا (الّا موتتنا الاولیٰ و ما نحن بمعذّبین)۔

اب تو دیکھ اور سوچ کہ تجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے؟ موت کے بعد اس قسم کی زندگی تھی اور اس طرح کا ثواب وجزا اور سزا و عذاب تھا۔ اب تمام حقائق تیرے سامنے آشکار ہو گئے ہیں۔ لیکن کیا فائدہ کیوں کہ لوٹنے کی اب کوئی راہ نہیں ہے۔

اس تفسیر کے مطابق آخری دو آیات اس جنتی شخص کی اپنے دوزخی ساتھی کے ساتھ گفتگو ہے۔ وہ قیامت کے انکار کے سلسلے میں اس کی کہی ہوئی باتیں اسے یاد دلا رہا ہے۔

لیکن بعض مفسرین نے ان دونوں آیات کی تفسیر میں ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ بہشتی شخص کی گفتگو دوزخی دوست کے ساتھ ختم ہو گئی ہے اور بہشتی دوست آپس میں باتیں دوبارہ کرنے لگیں گے۔ ان میں سے ایک فرطِ مسرت سے پکار کر کہے گا: "کیا واقعاً اب ہم نہیں مریں گے" اور یہاں ہماری حیات جاودانی ہے، کیا پہلی موت کے بعد اب کوئی موت نہیں آئے گی اور یہ لطفِ الٰہی ہم پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور ہمیں ہرگز عذاب نہیں ہوگا؟

البتہ یہ باتیں شک وشبہ کی بناء پر نہیں ہوں گی۔ بلکہ فرطِ وجد وسرور سے ہوں گی۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے بعض اوقات انسان طویل آرزو اور انتظار کے بعد کوئی وسیع اور اچھا مکان حاصل کرتا ہے تو تعجب کے ساتھ کہتا ہے کیا یہ میری ملکیت ہے؟ اے میرے خدا! یہ کتنی اچھی نعمت ہے، کیا یہ مجھ سے لے تو نہیں لی جائے گی؟

بہرحال اس گفتگو کو ایک پُرمعنی اور بہت ہی احساس انگیز جملے پر ختم کیا گیا ہے، جس میں بہت سی تاکیدات بھی موجود ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"واقعاً یہ ایک عظیم کامیابی ہے (انّ ھٰذا لھو الفوز العظیم)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہوگی کہ انسان نعمتِ جاودانی اور حیاتِ ابدی میں مستغرق ہو اور انواع واقسام کے الطافِ الٰہی اس کے شاملِ حال ہوں۔ اس سے برتر و بالا اور کس چیز کا تصور ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد خداوند عظیم ایک مختصر، بیدار کن اور معنی خیز جملے پر اس بحث کو ختم کرتا ہے۔ اس مثال کے مطابق لوگوں کو عمل کرنا چاہیے (لمثل ھٰذا فلیعمل العاملون)۔

یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ آخری آیت بھی جنتیوں کی ہی گفتگو کا حصّہ ہے، بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ اس دن اور کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اس دن عمل کا کوئی محل نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو یہ کہہ کر عمل کرنے کا شوق دلائیں۔ جبکہ آیت کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ یہ کہہ کر تمام گزشتہ آیات سے نتیجہ اخذ کیا جائے اور لوگوں کو ایمان وعمل کی طرف دعوت دی جائے، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ اس بحث کے آخر میں یہ خدا ہی کی گفتگو ہو۔

چند نکات

۱۔ جنتیوں کا دوزخیوں کے ساتھ ربط: ۔ زیر بحث آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض اوقات جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک قسم کا رابطہ قائم ہوجائے گا۔ گویا بہشتی جو اوپر رہتے ہوں گے، دوزخیوں کی طرف نگاہ کریں گے اور ان کی حالت و کیفیت کو دیکھ لیں گے (یہ معنی فاطلع کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے جو اوپر سے جھانکنے کے معنی میں ہے)۔

البتہ یہ اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان فاصلہ تھوڑا ہے۔ بلکہ ان حالات میں انھیں دیکھنے کی بہت زیادہ طاقت دے دی جائے گی، جس کے سامنے فاصلے اور مکان کا مسئلہ پیش ہی نہیں آئے گا۔

مفسرین کے کلمات میں ہے کہ بہشت میں ایک روشندان ہے جس سے جہنم کو دیکھا جاسکتا ہے۔

سورۂ اعراف کی آیات سے بھی اس قسم کا رابطہ اچھی طرح سے واضح ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

ونادٰی اصحاب الجنۃ اصحاب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقًا فھل وجدتم ما وعد ربکم حقًا قالوا نعم فاذن مؤذن بینھم ان لعنۃ اللہ علی الظالمین (اعراف - ۴۴)

جنتی دوزخیوں کو پکار کر کہیں گے: ہمارے پروردگار نے ہم سے جس چیز کا وعدہ کیا تھا ہم نے اسے برحق پایا، کیا تم نے بھی جس کا تمھارے پروردگار نے تم سے وعدہ کیا تھا اسے برحق پایا ہے؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ تو اس وقت کوئی ان کے درمیان میں سے پکار کر کہے گا کہ ستم گروں پر خدا کی لعنت ہو۔

اسی سورہ کی آیہ ۴۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ "اہل بہشت اور اہل دوزخ کے درمیان ایک حجاب ہے (وبینھما حجاب)۔

"نادٰی" کی تعبیر جو عام طور پر دور سے بات کرنے کے موقعوں پر استعمال ہوتی ہے، یہ ان دونوں گروہوں کی مکانی یا مقامی دوری کی نشانی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن کے حالات و شرائط اس جہان کے حالات سے بہت مختلف ہیں اور ہم اس جہان کے معیاروں پر ان کا ادراک نہیں کر سکتے۔

۲۔ یہ آیات کس شخص کے بارے میں نازل ہوئیں؟ بعض مفسرین نے ان آیات کے بارے میں کئی شان نزول نقل کیے ہیں ان کے مطابق یہ آیات ان دو افراد کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جن کا ذکر سورۂ کہف میں ایک مثال کے طور پر کیا گیا ہے جہاں قرآن فرماتا ہے:۔

واضرب لھم مثلًا رجلین جعلنا لاحدھما جنتین من اعناب وحففناھما بنخل وجعلنا بینھما زرعًا....

ان کے لیے ایک مثال بیان کر : ان دو مردوں کی داستان، جن میں سے ایک کے لیے ہم نے انواع واقسام کے انگوروں کا باغ قرار دیا تھا جس کے گرداگرد کھجور کے درخت تھے اور دونوں کے درمیان پُر برکت زراعت ہوتی تھی .... (کہف ـــــ ۳۲ تا ۴۲)

ان آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ ان دونوں آدمیوں میں سے ایک شخص بہت ہی خود خواہ، مغرور، کم ظرف اور منکر معاد تھا۔ دوسرا مومن اور قیامت کا معتقد تھا۔ بالآخر وہ بے ایمان مغرور شخص اس جہان میں بھی خدائی عذاب میں گرفتار ہوا اور اس کا سارا مال و سرمایہ تباہ و برباد ہو گیا۔[1]

لیکن زیر بحث آیات کا لب و لہجہ سورۂ کہف کی ان آیات کے ساتھ ہرگز ہم آہنگ نہیں ہے اور یہ آیات کوئی علیحدہ داستان بیان کر رہی ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین اسے دو شریک کار یا دوستوں سے متعلق جانتے ہیں۔ وہ دونوں ہی دولت مند تھے۔ ایک نے راہِ خدا میں بہت زیادہ خرچ کیا اور دوسرے نے بخل کیا۔ وہ ان باتوں کا معتقد نہیں تھا۔ کچھ مدت کے بعد خرچ کرنے والا آدمی محتاج ہو گیا تو اس کے دوست نے اسے سرزنش کی اور برا بھلا کہا اور مذاق کے طور پر کہا :

ءانك لمن المصدقين

کیا تو راہِ خدا میں انفاق کرتا ہے۔[2]

لیکن یہ شانِ نزول اس بات پر موقوف ہے کہ ہم زیر بحث آیات میں "مصدقین" کے "صاد" کو تشدید کے ساتھ پڑھیں تاکہ اس کا تعلق انفاق اور صدقہ دینے سے ہو جائے۔

جبکہ "مصدقین" کی مشہور قراءت "صاد" کی تشدید کے بغیر ہے۔ اس بنا پر مذکورہ شانِ نزول مشہور قراءت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

۲۔ اس قسم کی نعمات کے لیے کوشش کرنا چاہیے : کیا انسان کے لیے یہ بات مناسب ہے کہ انسان عمر کے گراں بہا سرمائے اور خداداد تعمیری صلاحیتوں کو ایسے امور میں صرف کرے جو پانی کے بلبلوں کی طرح ناپائیدار ہوں؟ ایسی متاع ہے جو بے قدر و قیمت اور فنا ہونے والی ہے۔ ایسی متاع ہے جس میں آفتیں ہی آفتیں ہیں اور درد سر ہی درد سر ہے۔

یا ان قیمتی صلاحیتوں اور وسائل کو ایسی راہ میں استعمال کرے جس کا نتیجہ حیاتِ جاوداں، بے پایاں نعمتیں اور پروردگار کی خوشنودی ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۶ ص ۱۲۹

[2] روح المعانی جلد ۲۳ ص ۸۳

جس کا ذائقہ کڑوا ہے اور جس کے شیرہ سے بدن میں ورم پیدا ہو جاتا ہے اور اسے کھانا بھی زیادہ مقدار میں ہو تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس قدر دردناک عذاب ہے[1]

یہ بات ظاہر ہے کہ اس ناگوار اور کڑوی غذا میں سے کھانا پیاس لگائے گا، لیکن جس وقت وہ پیاسے ہوں گے تو کیا پئیں گے،؟ قرآن کہتا ہے: ان دوزخیوں کے لیے اس زقوم کے بعد کھولتا ہوا، کثیف اور گندا پانی ہوگا (ثم ان لھم علیھا لشوبًا من حمیم)۔

"شوب" اس چیز کے معنی میں ہے جو کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جائے اور "حمیم" کھولتے ہوئے اور جلانے والے پانی کو کہتے ہیں، اس بنا پر وہ گرم کھولتا ہوا پانی جو وہ پئیں گے، وہ بھی خالص نہیں ہوگا بلکہ آلودہ اور گندہ ہوگا۔

وہ تو دوزخیوں کی غذا ہے اور یہ ان کے پینے کی چیز، لیکن اس پذیرائی کے بعد وہ کہاں جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے: پھر ان کی بازگشت جہنم کی طرف ہے۔ (ثم ان مرجعھم لالی الجحیم)۔

بعض مفسرین نے اس تعبیر سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ گرم اور آلودہ پانی جہنم سے باہر کے ایک چشمہ کا ہے۔ دوزخیوں کو پہلے ان جانوروں کی طرح جنھیں پانی کے گھاٹ پر لے جایا جاتا ہے اسے پینے کے لیے وہاں بلایا جائے گا اور اسے پینے کے بعد دوبارہ جہنم کی طرف لوٹا جائیں گے۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ یہ دوزخ کے مختلف مقامات کی طرف اشارہ ہے کہ ظالموں کو ایک علاقہ سے دوسرے علاقے کی طرف لے جایا جائے گا، تاکہ وہ یہ جلانے والا پانی پئیں۔ پھر انھیں اصلی جگہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ جنت کی نعمتوں کی حقیقی تصویر کشی اس دنیا میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی دوزخیوں کے عذاب کی۔ صرف دور سے ایک دھندلی سی تصویر مختصر سی عبارتوں کے ساتھ ہمارے ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔

(پروردگارا! ہمیں ان عذابوں سے اپنے لطف و کرم کی پناہ میں محفوظ رکھ)

قرآن زیر بحث آخری آیت میں دوزخیوں کی ان دردناک سزاؤں اور عذاب کے چنگل میں گرفتاری کی اصل وجہ کو دو مختصر اور پر معنی جملوں میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: انھوں نے اپنے آباؤ اجداد کو گمراہ پایا (انھم الفوا اٰباءھم ضالین)۔

---

[1] "منھا" کی ضمیر "شجرۃ" کی طرف لوٹتی ہے اور یہ خود اس بات کے لیے قرینہ ہے کہ یہاں "شجرۃ" سے مراد گھاس ہے نہ کہ درخت کیونکہ گھاس کو تو کھاتے ہیں درخت کو نہیں۔

لیکن اس حال میں بھی وہ بے اختیار تیزی کے ساتھ انھی کے پیچھے دوڑے چلے جاتے ہیں (فھم علیٰ اٰثارھم یھرعون)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں "یھرعون" "اھراع" کے مادہ سے، صیغہ مجہول کی صورت میں آیا ہے اور سرعت اور تیزی کے ساتھ دوڑنے کے معنی میں ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے اپنے بڑوں کی تقلید پر اپنے دل اور دین کو اس طرح سے لگا دیا ہے کہ وہ انھیں بے اختیار تیزی کے ساتھ اپنے پیچھے دوڑا رہے ہیں۔ گویا وہ خود سے ان کا کوئی ارادہ ہی نہیں یہ ان کے انتہائی تعصب اور اپنے بڑوں کے خرافات کے ساتھ شیفتگی کی طرف اشارہ ہے۔

۷۱۔ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ۙ
۷۲۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ
۷۳۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۙ
۷۴۔ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ع

ترجمہ

۷۱۔ ان سے پہلے اکثر گزشتہ لوگ (بھی) گمراہ تھے۔
۷۲۔ ہم نے ان میں ڈرانے والے بھیجے تھے۔
۷۳۔ دیکھو! جنھیں ڈرایا گیا تھا ان کا انجام کیا ہوا؟
۷۴۔ ہمارے مخلص بندوں کے سوا۔

تفسیر

گزشتہ گمراہ اقوام

کیونکہ مجرموں اور ظالموں سے مربوط گزشتہ مسائل کسی خاص زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، لہٰذا قرآن زیر بحث آیات میں ان کی عمومیت اور وسعت کو بیان کرتا ہے۔

ان چند آیات میں گزشتہ بہت سی اُمتوں کے حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے مطلع ہونا گزشتہ مباحث کے لیے ایک اچھی سند ہے۔ مثلاً قوم نوح و ابراہیم، قوم موسیٰ و ہارون، قوم لوط، قوم یونس وغیرہ۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ان سے پہلے بہت سے گزشتہ لوگ گمراہ ہو گئے (ولقد ضل قبلهم اكثر الاولين)۔

صرف مشرکین مکہ ہی نہیں جو اپنے بڑوں کی تقلید میں انتہاہ گمراہی میں جا گرے ہیں بلکہ ان سے پہلے بھی اکثر گزشتہ اقوام اس قسم کے انجام سے دوچار ہوئی تھیں اور ان کے مومنین بھی ان کے گمراہوں کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑے تھے اور یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اور ان پہلے مومنین کے لیے جو اس زمانے میں مکہ میں تھے اور ہر طرف سے دشمن کے محاصرہ میں تھے، ایک تسلی خاطر ہے۔

اپنے راستے سے منحرف نہیں کر سکتیں۔

حقیقت میں یہ اس زمانے میں مکہ میں پامردی دکھانے والے مومنین کے لیے اور آج کی شور و غوغا سے پُر دنیا میں رہنے والے ہم جیسے مسلمانوں کے لیے ایک الہام بخش پیام ہے کہ ہم دشمنوں کی کثرت سے نہ ڈریں اور کوشش کریں کہ خدا کے مخلص بندوں کی صف میں جگہ پالیں۔

۷۵۔ وَلَقَدْ نَادٰنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ۝ ز صلے
۷۶۔ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ ز صلے
۷۷۔ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۝ ز صلے
۷۸۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ ز صلے
۷۹۔ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝
۸۰۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝
۸۱۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝
۸۲۔ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝

ترجمہ

۷۵۔ نوح نے ہمیں پکارا (اور ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا) اور ہم کیسے اچھے قبول کرنے والے ہیں۔
۷۶۔ اور ہم نے اسے اور اس کے اہلِ خاندان کو اندوہِ عظیم سے نجات بخشی۔
۷۷۔ اور اس کی اولاد کو (روئے زمین پر) باقی رہنے والا قرار دیا۔
۷۸۔ اور ہم نے اس کا نیک نام بعد کی امتوں میں باقی رکھا۔
۷۹۔ سارے جہان کے لوگوں میں نوح پر سلام ہو۔
۸۰۔ ہم نیک لوگوں کو اسی طرح سے اجر دیتے ہیں۔
۸۱۔ بے شک وہ ہمارے صاحبِ ایمان بندوں میں سے تھا۔
۸۲۔ پھر دوسروں (اس کے دشمنوں) کو ہم نے غرق کر دیا۔

تفسیر

نوحؑ کی داستان کا ایک گوشہ

یہاں سے خدا کے نو عظیم پیغمبروں کی داستان کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس کی طرف گزشتہ آیات میں اجمالی طور پر ذکر ہوا تھا۔

سب سے پہلے شیخ الانبیاء اور پہلے اولوالعزم پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے ان کی اس پرسوز دعا کی طرف ـــــ جو انھوں نے اس وقت کی تھی جب وہ اپنی قوم سے مایوس ہو گئے تھے ـــــ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نوح نے ہمیں پکارا تو ہم نے بھی ان کی دعا قبول کر لی اور ہم کیسے اچھے قبول کرنے والے ہیں (ولقد نادانا نوح فلنعم المجیبون)[1]

یہ دعا ممکن ہے اسی دعا کی طرف اشارہ ہو جو سورۂ نوح میں آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

و قال نوح رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارًا انک ان تذرھم یضلوا عبادک و لا یلدوا الا فاجرًا کفارًا

نوح نے کہا: پروردگارا! کافروں میں سے کسی کو زمین پر نہ رہنے دے کیونکہ اگر تو انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ان سے فاجروں اور کافروں کے سوا اور کوئی پیدا نہیں ہو گا۔ (وہ خود بھی فاسد ہیں اور ان کی آئندہ نسل بھی فاسد ہو گی (نوح ـــــ ۲۶، ۲۷)

یا وہ دعا جو آپؑ نے کشتی پر سوار ہوتے وقت بارگاہِ خدا میں کی تھی۔

رب انزلنی منزلًا مبارکًا و انت خیر المنزلین

پروردگارا! تو ہمیں کسی پُر برکت منزل پر اتارنا اور تو بہترین منزل عطا کرنے والا ہے (مؤمنون ـــــ ۲۹)

یا وہ دعا جو سورۂ قمر کی آیہ ۱۰ میں آئی ہے۔

فدعا ربہ انی مغلوب فانتصر

نوحؑ نے اپنے پروردگار سے اس طرح دعا کی: (پروردگارا) میں اس قوم کے چنگل میں

---

[1] "مجیبون" صیغہ جمع ہے حالانکہ اس سے مُراد خدا ہے کہ جس نے نوح کی دعا قبول کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات جمع کا صیغہ اظہارِ عظمت کے لیے آتا ہے۔ جیسا کہ "نادانا" میں جمع متکلم کی ضمیر بھی اسی مقصد کے لیے ہے۔

مغلوب ہوں، میری مدد فرما۔

البتہ اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ زیر بحث آیہ ان تمام دعاؤں کی طرف اشارہ ہو اور مراد یہ ہو کہ خدا نے بہترین طریقے سے ان سب کو قبول فرمایا۔

لہٰذا بعد والی آیت میں بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے اور اس کے خاندان کو عظیم غم سے نجات بخشی (ونجیناہ واھلہ من الکرب العظیم)۔[1]

یہ غم واندوہ کیا تھا، جس نے حضرت نوحؑ کو ستا رکھا تھا؟

ممکن ہے یہ کافر و مغرور قوم کی طرف سے مذاق اڑانے اور زبانی آزار پہنچانے اور آپ کی اور آپ کے پیروکاروں کی توہین کرنے کی طرف اشارہ ہو یا اس ہٹ دھرم قوم کی طرف سے پے در پے جھٹلانے کی طرف اشارہ ہو۔

کبھی وہ کہتے تھے:۔

وما نراك اتبعك الا الذين هم اراذلنا

ہم نہیں دیکھتے کہ کسی نے تیری پیروی کی ہو سوائے ہمارے چند حقیر لوگوں کے۔ (ہود ـــــ ۲۷)

کبھی کہتے تھے:۔

یانوح قد جادلتنا فاکثرت جدالنا فأتنا بما تعدنا ان کنت من الصادقین

اے نوح! تو نے ہم سے بہت باتیں کرلیں (اور تو خوب جھگڑ چکا ہے) اگر تو سچ کہتا ہے تو وہ عذاب جس کا تو وعدہ کیا کرتا ہے اسے لے آ۔ (ہود ـــــ ۳۲)

اور کبھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ویصنع الفلك وکلما مر علیه ملأ من قومه سخروا منه

وہ تو کشتی کے بنانے میں مشغول تھا مگر جس وقت اس کی قوم کا کوئی گروہ اس کے قریب سے گزرتا تو اس کا مذاق اڑاتا (وہ کہتے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے)۔ (ہود ـــــ ۳۸)

حضرت نوحؑ جیسے باحوصلہ پیغمبر کو انھوں نے اس قدر پریشان کیا اور آپؑ کی اتنی بے ادبی کی کہ آپؑ کو دیوانہ تک کہا۔ آپؑ نے عرض کیا:۔

رب انصرنی بما کذبون

پروردگارا! ان کی تکذیب کے مقابلے میں میری مدد فرما۔ (مؤمنون ـــــ ۲۶)

---

[1] "کرب" مفردات میں راغب کے قول کے مطابق "اندوہ شدید" کے معنی میں ہے اور "عظیم" اس معنی پر مزید تاکید کے لیے ہے۔

بہرحال مجموعی طور پر ان سب ناگوار حوادث اور زبان کے شدید زخموں نے ان کے پاکیزہ دل کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ طوفان آ پہنچا اور خدا نے انھیں اس ستمگر قوم کے چنگل سے اس کربِ عظیم اور اندوہِ کبیر سے نجات بخشی۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ "کربِ عظیم" سے مراد وہی طوفان تھا، جس سے حضرت نوحؑ اور ان کے انصار و اصحاب کے علاوہ کسی نے نجات نہیں پائی۔ لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: ہم نے نوح کی اولاد کو (زمین پر) باقی رہ جانے والا قرار دیا۔ (و جعلنا ذریتہ ھم الباقین)۔

کیا واقعاً تمام انسان جو اس وقت روئے زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں حضرت نوحؑ کی اولاد ہیں؟ اور کیا مذکورہ بالا آیت یہی کچھ کہتی ہے یا انبیاء و اولیاء و صلحاء کا ایک عظیم گروہ ان کی اولاد میں سے باقی رہا۔ اگرچہ تمام لوگ ان کی اولاد میں سے نہیں ہیں؟ ہم اس سلسلے میں ان آیات کی تفسیر کے بعد ایک بحث پیش کریں گے۔

اس کے علاوہ ہم نے بعد میں آنے والی امتوں میں نوح کے لیے ذکرِ خیر، ثنائے جمیل اور نیک نام جاری رکھا (و ترکنا علیہ فی الاٰخرین)۔

وہ انھیں ایک ثابت قدم قیام کرنے والا، شجاع، بہت زیادہ صبر کرنے والا، دلسوز و مہربان پیغمبر کے عنوان سے یاد کرتے ہیں اور انھیں شیخ الانبیاء کہتے ہیں۔

ان کی تاریخ ثباتِ قدم، پامردی اور استقامت کا ایک نمونہ ہے اور دشمنوں اور بے عقلوں کی سختیوں کے مقابلے میں ان کا طرزِ عمل راہِ حق کے تمام راہیوں کے لیے الہام بخش ہے۔

عالمین کے لوگوں میں نوح پر سلام (سلام علیٰ نوح فی العالمین)۔

اس سے برتر و بالاتر اور کون سا اعزاز و افتخار ہوگا کہ خداوندِ عالم ان پر سلام بھیجتا ہے۔ ایسا سلام جو جہان اور جہان والوں کے درمیان باقی رہتا ہے اور دامنِ قیامت تک پھیلا دیا جاتا ہے۔ خدا کا سلام جو اس کے بندوں کی طرف سے ثنائے جمیل اور ذکرِ خیر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں اس وسعت کے ساتھ بہت کم سلام کسی کے لیے نظر آتا ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ "العالمین" (اس بناء پر کہ جمع ہے اور الف و لام اس کے ساتھ ہے)۔ ایسا وسیع معنی رکھتا ہے، جو نہ صرف انسانوں بلکہ ممکن ہے کہ فرشتوں اور ملکوت کے عوالم پر بھی محیط ہو۔

اور اس غرض سے کہ یہ دوسروں کے لیے الہام بخش ہو، مزید فرمایا گیا ہے: ہم اسی قسم کی جزا نیکوکاروں کو دیتے ہیں۔ (انا کذٰلک نجزی المحسنین)۔

چونکہ وہ ہمارے صاحب ایمان بندوں میں سے تھا (انہ من عبادنا المؤمنین)۔
درحقیقت مقام بندگی اور اسی طرح ایمان جو احسان و نیکی کے ساتھ ہو، جس کا بیان آخری دو آیات میں ہے، حضرت نوحؑ کے لیے خدا کے لطف اور اندوہِ عظیم سے ان کی نجات اور ان پر خدا کے درود و سلام کی اصل وجہ تھی کیونکہ اگر یہی طرزِ عمل دوسروں کا بھی ہو تو وہ بھی اسی رحمت اور لطف کے حق دار ہوں گے کہ جن کے نوح تھے، کیونکہ پروردگار کے الطاف کا معیار تخلف ناپذیر ہے اور وہ کسی خاص شخص کے لیے نہیں ہوتا۔

آخری زیر بحث آیت میں ایک مختصر اور تیز جملے کے ساتھ اس ظالم شریر اور کینہ پرور قوم کا انجام بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا (ثم اغرقنا الاٰخرین)۔
آسمان سے بارش کا طوفان ٹوٹ پڑا اور زمین سے پانی ابلنے لگا اور سارے کا سارا کرۂ ارض تھپیڑیں مارتے ہوئے سمندر میں بدل گیا، اس نے ظالموں کے محل درہم برہم کر دیئے اور ان کے بے جان جسم صفحۂ آب پر باقی رہ گئے
قابل توجہ بات یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کے ساتھ اپنے الطاف و اکرام کی بات تو اللہ تعالیٰ نے کئی آیات میں بیان کی ہے لیکن اس سرکش قوم کے عذاب کا بیان تحقیر و بے اعتنائی کے ساتھ ایک مختصر سے جملے میں تمام کر دیا ہے، کیونکہ مؤمنین کے افتخارات اور کامیابیوں اور ان کے لیے خدا کی مدد و نصرت کا بیان توضیح کا حق دار ہے اور سرکشوں کی حالت بے اعتنائی و بے پرواہی سے بیان ہونا چاہیے۔

ایک نکتہ

کیا روئے زمین کے تمام لوگ نوحؑ کی اولاد ہیں؟

بزرگ مفسرین کی ایک جماعت نے "وجعلنا ذریتہ ھم الباقین" "ہم نے نوح کی اولاد کو زمین میں باقی رہ جانے والا قرار دیا" سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نوح کے بعد تمام نسلِ بشر انھی کی اولاد میں سے وجود میں آئی ہے اور اس وقت کے تمام انسان انھی کی اولاد ہیں۔
اس بات کو بہت سے مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ نوح کے تین بیٹے باقی رہ گئے تھے۔ سام، حام اور یافث۔ اور اس وقت کرۂ زمین پر موجود تمام نسلیں انھی پر منتہی ہوتی ہیں۔ یہ حضرات عرب، فارس اور رُوم کے لوگوں کو سام کی نسل سمجھتے ہیں اور ترک کی نسل اور کچھ دوسرے گروہوں کو "یافث" کی اولاد سے اور سوڈان، سندھ، ہند، نوبہ، حبشہ، قبط اور بربر کے لوگوں کو حام کی اولاد میں سے شمار کرتے ہیں۔
اب بحث اس مسئلہ میں نہیں ہے کہ فلاں نسل نوحؑ کے کس بیٹے کی اولاد ہے کیونکہ اس مسئلے میں مؤرخین و مفسرین کے درمیان مختلف نظریات ہیں۔ بحث اس بارے میں ہے کہ کیا یہ سب انسانی نسلیں انھی تینوں کی طرف لوٹتی ہیں؟

"توریہ" (بروزن "توصیہ") کو بعض اوقات "معاریض" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد ہے ایسی بات کہنا جس کا ایک ظاہری مفہوم ہو لیکن کہنے والے کی مراد کچھ اور ہو، اگرچہ سامع کی نظر ظاہری مفہوم کی طرف ہی جاتی ہو۔ مثلاً کوئی شخص کسی آدمی سے سوال کرتا ہے: تم سفر سے کب آئے ہو؟ وہ کہتا ہے: غروب سے پہلے، حالانکہ وہ ظہر سے پہلے آیا ہے۔ سننے والا اس کلام سے غروب سے تھوڑا سا پہلے سمجھتا ہے، جبکہ کہنے والے کا ارادہ زوال سے پہلے ہے، کیونکہ وہ بھی غروب سے پہلے ہے۔

یا کوئی شخص دوسرے سے سوال کرتا ہے: "کیا تو نے کھانا کھایا ہے"؟ وہ کہتا ہے: ہاں! سامع اس بات سے یہ سمجھتا ہے کہ اس نے آج کھالیا ہے جبکہ اس کی مراد یہ ہے کہ اس نے کل کھانا کھایا ہے۔

یہ نکتہ فقہ کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ کیا توریہ جھوٹ شمار ہوتا ہے یا نہیں؟ بعض بزرگ فقہاء جن میں شیخ انصاری (رضوان اللہ علیہ) بھی شامل ہیں کا نظریہ ہے کہ توریہ جھوٹ میں داخل نہیں ہے نہ عرفاً اس پر جھوٹ صادق آتا ہے اور نہ ہی اسلامی روایات سے اس کا جھوٹ سے تعلق معلوم ہوتا ہے، بلکہ چند روایات میں باقاعدہ اس کے جھوٹ ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

امام صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے۔

الرجل یستأذن علیه فیقول للجاریة قولی لیس هو هیهنا، فقال (ع) لا بأس لیس بکذب

کوئی شخص دروازے پر آتا ہے اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہتا ہے، صاحب خانہ (کو اس کی پذیرائی میں کوئی امر مانع ہے) اپنی کنیز سے کہتا ہے کہ دے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ (اور اس سے مراد مثلاً گھر کے دروازے کے پیچھے ہے)۔ امام نے فرمایا: یہ جھوٹ نہیں ہے[1]

حق یہ ہے کہ یہاں کچھ تفصیل کی ضرورت ہے اور ایک ضابطہ کلی کے طور پر کہنا چاہیے کہ جہاں لفظ لغوی و عرفی مفہوم کے لحاظ سے دو معانی کی قابلیت رکھتا ہے لیکن مخاطب کا ذہن اس سے ایک معنی مراد لیتا ہے جبکہ کہنے والے کی نظر میں دوسرا معنی ہے، اس قسم کا توریہ جھوٹ نہیں ہے مثلاً یہ کہ مشترک لفظ استعمال کریں۔ سننے والے کا ذہن ایک معنی کی طرف متوجہ ہو جبکہ کہنے والے کی نظر دوسرے معنی کی طرف ہو۔

مثلاً سعید بن جبیر کے حالات میں منقول ہے کہ حجاج نے ان سے پوچھا کہ تمہارا نظریہ میرے متعلق کیسا ہے؟ انھوں نے کہا: میرے نظریہ کے مطابق "تو عادل ہے"۔ حجاج کے مصاحبین اور حامی خوش ہو گئے۔ حجاج نے کہا: اس نے اس بات سے میرے کفر کا حکم صادر کیا ہے۔ کیونکہ عادل کا ایک معنی حق کے باطل کی طرف عدول کرنے والا اور منہ پھیر لینے والا ہے۔

لیکن اگر لفظ لغوی اور عرفی مفہوم کے لحاظ سے ایک ہی معنی رکھتا ہے اور کہنے والا اسے چھوڑ کر، قرینہ مجاز ذکر کیے بغیر مجازی معنی مراد لے تو اس قسم کا توریہ بلاشک و شبہ حرام ہے اور ممکن ہے۔ اس تفصیل کے ذریعے فقہاء کے مختلف نظریات یکجا اور جمع کیے

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۸ ص ۵۸۰ (باب ۱۴۱ از ابواب العشرۃ حدیث ۸)

جاسکیں۔

البتہ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ ایسے مواقع پر بھی، جہاں توریہ جھوٹ کا مصداق نہیں ہے بعض اوقات اس کے مفاسد کا حامل ہوتا ہے اور جہالت میں پڑنے اور لوگوں کو غلطی میں ڈالنے کا سبب بنتا ہے اور اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ وہ بعض اوقات حرام کے مرحلہ تک پہنچ جائے لیکن جب اس میں نہ تو اس قسم کا کوئی مفسدہ ہو اور نہ ہی وہ جھوٹ کا مصداق ہو تو اس کی حرمت پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور امام صادقؑ کی روایت اسی پہلو سے ہے۔ اس بنا پر صرف جھوٹ نہ ہونا توریہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ دوسرے مفاسد بھی اس میں نہ ہوں۔

البتہ وہ مواقع جہاں ضرورت کا تقاضا ہو کہ انسان جھوٹ بولے وہاں یقیناً جب تک توریہ ممکن ہے اسے توریہ کرنا چاہیے تاکہ اس کی بات جھوٹ کا مصداق نہ بنے۔

باقی رہی یہ بات کہ انبیاء کے لیے توریہ جائز ہے یا نہیں؟ تو کہنا چاہیے کہ وہ صورت جس میں توریہ عام لوگوں کے اعتماد کے تزلزل کا موجب بنتا ہے، وہاں جائز نہیں ہے کیونکہ تبلیغ کی راہ میں انبیاء کا سرمایہ عام لوگوں کا اعتماد ہی تو ہے۔ لیکن ایسے مواقع جس کی مثال مذکورہ بالا آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی داستان ہے میں کوئی اشکال نہیں۔ اس میں حضرت ابراہیمؑ نے بیماری کا اظہار کیا، منجمین کی طرح آسمان کی طرف دیکھا۔ البتہ خیال ہے کہ ایسے کام میں ایک اہم مقصد پیش نظر ہو اور اس سے حق طلب لوگوں کا اعتماد بھی ڈانواں ڈول نہ ہوتا ہو۔

۲۔ ابراہیمؑ اور "قلب سلیم":۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی اصطلاح میں "قلب" روح اور عقل کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "قلب سلیم" اس پاک اور سالم روح کے لیے بولا جاتا ہے جو ہر قسم کے شرک، شک اور گناہ سے پاک ہو۔

قرآن مجید نے بعض قلوب کو "قاسیۃ" (فساوت مند) قرار دیا ہے۔ (مائدہ ـــــ ۱۳)

بعض قلوب کا "ناپاک" کے عنوان سے تعارف کروایا ہے۔ (مائدہ ـــــ ۴۱)

کچھ دلوں کو "بیمار" کہا ہے۔ (بقرہ ـــــ ۱۰)

بعض دلوں کو "مہرزدہ" اور بند کہا ہے۔ (توبہ ـــــ ۸۷)

ان کے مقابل میں قرآن "قلب سلیم" کو پیش کرتا ہے کہ جس میں ان عیوب میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ پاک بھی ہے اور نرم و مہربان بھی، سالم بھی ہے اور حق کو قبول کرنے والا بھی۔

یہ وہی قلب ہے کہ روایات میں جس کی "حرم خدا" کہہ کر تعریف کی گئی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے

القلب حرم الله فلا تسكن حرم الله غير الله

قلب حرم خدا ہے، خدا کے حرم میں خدا کے غیر کو نہ بساؤ[1]

---

[1] بحار جلد ۷۰، صفحہ ۲۵ "باب حب اللہ حدیث ۲۷"۔

یہی وہ قلب ہے جو غیب کے حقائق دیکھ سکتا ہے اور عالم بالا کے ملکوت کا نظارہ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں منقول ہے :۔

لولا ان الشیاطین یحومون علی قلوب بنی آدم لنظروا الی الملکوت

اگر شیاطین اولادِ آدم کے دلوں کو گھیر نہ لیں تو وہ عالم ملکوت کو دیکھ سکتے ہیں۔[1]

بہرحال قیامت میں نجات کے لیے بہترین سرمایہ قلب سلیم ہے اور یہی قلب سلیم تھا جس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پروردگار کی بارگاہ کی طرف چلے اور فرمانِ رسالت حاصل کیا۔

یہ بیان ہم ایک اور حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، ایک روایت میں آیا ہے :

ان اللہ فی عبادہ آنیۃ وھو القلب فاحبھا الیہ "اصفاھا" و "اصلبھا" و "ارقھا" : اصلبھا فی دین امہ، واصفاھا من الذنوب، وارقھا علی الاخوان

خدا کا اس کے بندوں میں ایک ظرف اور پیمانہ ہے۔ جس کا نام "دل" ہے۔ ان میں سے سب سے بہتر وہی ہے جو زیادہ صاف و شفاف، زیادہ محکم اور زیادہ لطیف ہو۔ خدا کے دین میں سب سے زیادہ محکم ہو، گناہوں سے سب سے زیادہ پاک ہو اور دینی بھائیوں کے لیے زیادہ لطیف اور مہربان ہو۔[2]

---

[1] بحار جلد ۰، ص ۵۹ "باب القلب وصلاحہ" حدیث ۳۹

[2] بحار جلد ۰، ص ۵۶ "باب القلب وصلاحہ" حدیث ۳۶

۹۵۔ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۙ
۹۶۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ
۹۷۔ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِى الْجَحِيْمِ
۹۸۔ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ
۹۹۔ وَقَالَ اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ
۱۰۰۔ رَبِّ هَبْ لِىْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ

ترجمہ

۹۵۔ اس (ابراہیم) نے کہا: کیا تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جسے اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو۔؟
۹۶۔ حالانکہ خدا نے تمھیں بھی پیدا کیا ہے اور (ان بتوں کو بھی) جنھیں تم بناتے ہو۔
۹۷۔ انھوں نے کہا: اس کے لیے ایک اونچی سی جگہ بناؤ اور اسے آگ کے جہنم میں پھینک دو۔
۹۸۔ انھوں نے تو ابراھیم کو ختم کرنے کی تدبیر کر لی تھی لیکن ہم نے ان سب کو پست اور مغلوب کر دیا۔
۹۹۔ (وہ اس ہلاکت خیزی میں سے سلامتی کے ساتھ نکل آیا) اور اس نے کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں وہ میری راہنمائی کرے گا۔
۱۰۰۔ پروردگارا! مجھے صالح (اولاد) عطا فرما۔

تفسیر

مشرکین کے منصوبے خاک میں مل گئے

آخر بت شکنی کے واقعے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو اسی الزام میں عدالت میں لے گئے۔
وہ انھیں ملزم ٹھہراتے ہوئے ان سے پوچھنے لگے کہ:۔
"اس بات کی وضاحت کرو کہ بت خانے کا وحشت ناک حادثہ کس کے ہاتھ سے انجام پایا ہے؟"

قرآن نے اس واقعے کی تفصیل سورۂ انبیاء میں بیان کی ہے اور زیر بحث آیات میں اس کے صرف ایک حساس حصے کا ذکر کیا ہے اور وہ ہے بت پرستی کے باطل ہونے کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی ان سے آخری گفتگو۔ ابراہیم نے کہا: کیا تم ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جسے تم اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو (قال اتعبدون ما تنحتون)۔

کیا کوئی بھی عقل مند انسان اپنی بنائی ہوئی چیز کی عبادت کرتا ہے؟ کیا کوئی ذی شعور اپنی مخلوق کے سامنے زمین پر زانو جھکاتا ہے؟ کون سی عقل و منطق تمھیں ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے؟

معبود تو وہ ہونا چاہیے جو انسان کا خالق ہو نہ وہ کہ جو خود انسان کا تراشیدہ ہو۔ اب اچھی طرح سے غور کرو اور معبودِ حقیقی کو تلاش کرو۔ "خدا نے تمھیں بھی پیدا کیا ہے اور ان بتوں کو بھی جنھیں تم بناتے ہو" (واللہ خلقکم و ما تعملون)۔

آسمان و زمین سب اسی کی مخلوق ہیں اور زمان و مکان سب اسی کے بنائے ہوئے ہیں ایسے خالق کے آستانے پر سر رکھنا چاہیے اور اس کی پرستش و عبادت کرنا چاہیے۔

یہ ایک بہت ہی قوی اور دندان شکن دلیل ہے، جس کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"ما تعملون" میں "ما" اصطلاح کے مطابق "ما موصولہ" ہے (نہ کہ ما مصدریہ) حضرت ابراہیمؑ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خدا نے تمھیں بھی پیدا کیا ہے اور تمھاری مصنوعات کو بھی۔ اگر بتوں پر انسان کے "مصنوع" یا "معمول" کے لفظ کا اطلاق ہو تو یہ اس صورت کی بنا پر ہے جو انسان اسے دیتا ہے، ورنہ اس کا مادہ تو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ یہ بات بالکل اس طرح ہے کہ کہتے ہیں یہ فرش، یہ گھر اور یہ گاڑی اور بس انسان کی بنائی ہوئی ہے۔ یقیناً اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان نے اس کے مواد کو بنایا ہے بلکہ ان کی شکل و صورت انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہے۔

لیکن اگر "ما" کو مصدری معنی میں لیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے تمھیں بھی پیدا کیا ہے اور تمھارے اعمال کو بھی۔ البتہ یہ معنی بھی غلط نہیں ہے اور بعض کے نظریہ کے برخلاف جبر پر بھی دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ ہمارے اعمال اگرچہ ہمارے ارادہ و اختیار سے انجام پاتے ہیں لیکن کسی کام کے کرنے کے لیے ارادہ و قدرت اور دوسری قوتیں جن کے ساتھ انسان اپنے افعال انجام دیتا ہے سب خدا کی طرف سے ہیں لیکن اس کے باوجود آیت اس معنی پر دلالت نہیں کرتی بلکہ یہ بتوں پر دلالت کرتی ہے۔ آیت یہ کہتی ہے کہ "خدا تمھارا بھی خالق ہے اور ان بتوں کا بھی جنھیں تم نے تراشا ہے" اور بات کا لطف بھی اسی میں ہے، کیونکہ بحث بتوں کے بارے میں تھی نہ کہ انسانی اعمال کے بارے میں۔

درحقیقت یہ آیت اس بات کے مشابہ ہے جو حضرت موسیٰؑ اور جادوگروں کی داستان میں آئی ہے، جہاں قرآن بیان کرتا ہے۔

فاذا ھی تلقف ما یأفکون

موسیٰ نے عصا پھینکا، تو وہ بہت بڑا اژدہا بن گیا اور جو کچھ انھوں نے جھوٹ موٹ بنا رکھا تھا انھیں نگل گیا۔ (اس سے مراد جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپ ہیں)۔ (اعراف ——— ۱۱۷)

لیکن ہم جانتے ہیں کہ جھوٹے اور سرکش لوگ کبھی بھی منطق و استدلال سے آشنا نہیں رہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کی طاقتور اور عمدہ دلیل کا بابل کے جابر نظام کے سرداروں کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ہوسکتا ہے مستضعف عوام کے ایک گروہ کو اس نے بیدار بھی کیا ہو۔ لیکن وہ مستکبرین جو اس توحیدی منطق کو اپنے مفادات کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے، طاقت، نیزے کی نوک اور آگ کی منطق کے ساتھ میدان میں آگئے۔ یہ وہ منطق جس کے سوا اور کوئی بات انھیں سمجھائی نہ دیتی تھی۔ انھوں نے اپنی طاقت کا سہارا لیا اور چلاّ کر کہا: اس کے لیے ایک اونچی سی جگہ بناؤ اور اس کے اندر آگ روشن کرو اور اسے اس جلانے والی جہنم میں پھینک دو۔ (قالوا ابنوا له بنيانًا فألقوه في الجحيم)۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ حکم دیا گیا کہ ایک بہت بڑی چار دیواری بنائی جائے اور پھر اس کے اندر آگ جلائی جائے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک تو آگ کو پھیلنے اور احتمالی خطرات سے روکا جائے۔ دوسرے وہ دوزخ جس کی ابراہیم بت پرستوں کو دھمکی دیتے تھے عملی طور پر تیار کردی جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ابراہیمؑ جیسے ایک انسان کو جلانے کے لیے لکڑیوں کا ایک چھوٹا سا گٹھا ہی کافی تھا۔ لیکن بتوں کے ٹوٹنے سے ان کے دل میں جو آگ بھڑک رہی تھی وہ اسے ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے اور جہاں تک انتقام لیا جاسکتا تھا لینا چاہتے تھے اور ضمنی طور پر وہ بتوں کی شوکت و عظمت بھی ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ شاید ان کی برباد ہونے والی آبرو پلٹ آئے۔ نیز اپنے تمام مخالفین کو وہ درسِ عبرت دینا چاہتے تھے تاکہ یہ حادثہ پھر بابل کی تاریخ میں نہ دہرایا جائے۔ اس لیے وہ آگ کا الاؤ تیار کرنا چاہتے تھے (اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ "جحیم" لغت میں اس آگ کے معنی میں ہے جو ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ رکھی گئی ہو)۔

بعض نے "بنیان" سے "منجنیق" مراد لی ہے جس سے دور سے بھاری چیزیں پھینکی جاتی تھیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے پہلی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ "بنیان" سے مراد عمارت اور بڑی چار دیواری ہے۔

یہاں قرآن اس مسئلے کے جزئیات کی طرف جو سورۂ انبیاء میں آچکے ہیں، اشارہ نہیں کرتا۔ صرف یکجائی طور پر ایک مختصر اور عمدہ پیرائے میں اس قصے کے آخری حصے کو اس طرح بیان کرتا ہے: انھوں نے ابراہیم کو ختم کرنے کے لیے ایک زبردست منصوبہ تیار کیا تھا لیکن ہم نے انھیں پست اور مغلوب کردیا (فاراد وا به كيدًا فجعلناهم الاسفلين)۔

"کید" اصل میں ہر قسم کی "تدبیر سوچنے" کے معنی میں ہے۔ چاہے وہ صحیح راستے کے لیے ہو یا غلط کے لیے، اگرچہ عام طور پر یہ لفظ مذموم موقعوں کے بارے ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ لفظ نکرہ کی صورت میں آیا ہے، جبکہ نکرہ عظمت و اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک وسیع و عریض منصوبے کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ختم کرنے اور ان کی قولی و عملی تبلیغ کے اثرات ختم کرنے کے لیے بنایا تھا۔

ہاں خدا نے انھیں اسفل اور نچلے درجے میں قرار دیا اور ابراہیم کو اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ جیسا کہ ان کی منطق میں بھی برتری تھی نیز آگ میں جلانے کے واقعے میں بھی خدا نے انھیں برتر رکھا اور ان کے طاقتور دشمنوں کو پست کردیا۔ آگ کو ابراہیمؑ کے لیے سرد اور سلامتی والا بنا دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک بال تک بھی نہ جلا سکی اور وہ اس آگ کے دریا سے صحیح و سالم باہر نکل آئے۔

ایک دن میں تو وہ نوحؑ کو "غرق" ہونے سے نجات دیتا ہے اور دوسرے دن ابراہیمؑ کو "حرق" (جلنے) سے تاکہ سب پر

واضح کردے کہ پانی اور آگ اس کے تابع فرمان ہیں اور جو کچھ خدا حکم دیتا ہے وہ وہی کرتے ہیں۔

ابراہیمؑ اس ہولناک حادثہ اور خطرناک سازش سے جو دشمن نے ان کے خلاف کی تھی صحیح وسالم اور سربلند باہر نکل آئے، اور چونکہ بابل میں آپ نے اپنی پیغام رسانی کی ذمہ داری کو ادا کردیا تھا لہٰذا شام کی مقدس سرزمین کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا اور کہا "میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں وہ مجھے ہدایت کرے گا" (و قال انی ذاھب الی ربی سیھدین)۔

یہ بات واضح ہے کہ خدا کوئی مکان نہیں رکھتا، لیکن آلودہ اور گندے ماحول سے پاک ماحول کی طرف ہجرت کرنا، خدا کی طرف ہجرت کرنا ہے۔

سرزمینِ انبیاء واولیاء کی طرف ہجرت اور وحی الٰہی کے مراکز کی طرف ہجرت خدا کی طرف ہجرت ہے۔ جیسا کہ مکّہ کی طرف سفر کرنے کو "سفر الی اللہ" کہا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں انجامِ فریضۂ الٰہی کی طرف ہجرت دوست کی طرف سفر کرنا ہے اور اس سفر میں ہر جگہ ہادی ورہنما خدا ہے

یہاں خدا سے ان کا پہلا تقاضا اور درخواست جو مذکورہ بالا آیات میں مذکور ہے، صالح اور نیک فرزند کی درخواست ہے۔ ایسا فرزند جو ان کے راستے کو دوام بخشے اور ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کرے۔ یہ وہ منزل تھی کہ انھوں نے عرض کیا: "پروردگارا! مجھے ایک فرزندِ صالح عطا فرما"۔ (رب ھب لی من الصالحین)۔

کتنی عمدہ تعبیر ہے "صالح اور نیک فرزند" اعتقاد وایمان کے لحاظ سے صالح، گفتار وعمل کے لحاظ سے صالح اور تمام جہات سے صالح۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک جگہ تو ابراہیمؑ اپنے لیے درخواست کرتے ہیں کہ وہ صالحین میں سے ہوں، جیسا کہ قرآن ان کے قول کو نقل کرتا ہے:۔

رب ھب لی حکمًا والحقنی بالصالحین

پروردگارا! مجھے علم ودانش مرحمت فرما اور مجھے صالحین سے ملحق کردے۔ (شعراء ـــــ ۸۳)

جبکہ یہاں یہ تقاضا کرتے ہیں کہ مجھے اولادِ صالح مرحمت فرما کیونکہ صالح ایک جامع صفت ہے جس میں ایک کامل انسان کی تمام خوبیاں جمع ہوتی ہیں۔

خدا نے بھی اس دعا کو قبول کرلیا اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے صالح بیٹے انھیں مرحمت فرمائے۔ چنانچہ اسی سورہ کی بعد والی آیات میں یہ بیان ہوا ہے۔

وبشرناہ باسحاق نبیًا من الصالحین

ہم نے اسے اسحٰق کی پیدائش کی بشارت دی جو صالحین میں سے نبی ہے۔

نیز اسماعیل کے بارے میں کہتا ہے:۔

واسماعیل و ادریس و ذاالکفل کل من الصابرین و ادخلناھم فی رحمتنا انھم من الصالحین

اور اسماعیل، ادریس اور ذالکفل کو یاد کرو، وہ سب صابرین میں سے تھے اور ہم نے انھیں اپنی رحمت میں داخل کیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے۔ (انبیاء ـــــ ۸۵، ۸۶)

چند اہم نکات

۱۔ ہر چیز کا خالق وہی ہے: زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے واللہ خلقکم و ما تعملون ابراہیمؑ بُت پرستوں سے کہتے ہیں: "تم بھی خدا کی مخلوق ہو اور تمھارے بنائے ہوئے بُت بھی"۔

بعض نے اس آیت کو اپنے فاسد مذہب جبر کے لیے توجیہ خیال کیا ہے (اس طرح سے کہ "ماتعملون" میں "ما" کو انھوں نے "مامصدریہ" لیا ہے اور کہا ہے کہ جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے تمھیں اور تمھارے اعمال کو خلق کیا ہے اور جب ہمارے اعمال مخلوقِ خدا ہیں تو پھر اپنی طرف سے ہمیں کچھ اختیار نہیں۔

یہ بات کئی جہات سے بے بنیاد ہے۔

اوّلاً جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ "ماتعملون" سے مراد یہاں بُت ہیں، جنھیں انھوں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا نہ کہ اعمالِ انسانی، اور اس میں شک نہیں کہ وہ ان کے مادے کو عالمِ خلقت سے لے کر ایک شکل دیتے تھے (اس بنا پر ما موصولہ ہے)

ثانیاً: اگر آیت کا مفہوم وہ ہو جو انھوں نے خیال کیا ہے تو یہ تو بُت پرستوں کے فائدے میں ایک دلیل ہے نہ کہ ان کے برخلاف۔ کیونکہ وہ کہہ سکتے تھے کہ ہماری بُت سازی اور بُت پرستی کا عمل چونکہ خدا نے خلق کیا ہے لہٰذا ہم تو اس معاملے میں بالکل بے قصور ہیں۔

ثالثاً: اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ آیت کا مفہوم اور معنی اسی طرح ہو (جس طرح وہ کہتے ہیں) تو پھر بھی یہ جبر کی دلیل نہیں ہے کیونکہ ارادہ و اختیار کی آزادی کی صورت میں ایک معنی کے لحاظ سے خدا ہی ہمارے اعمال کا خالق ہے، کیونکہ خدا کے سوا ارادے کی یہ آزادی اور ارادہ کرنے کی طاقت اور جسمانی، فکری، مادّی اور روحانی قوتیں ہمیں کس نے دی ہیں؟ پس خالق وہی ہے باوجودیکہ فعل ہمارا اختیاری ہے۔

۲۔ ابراہیمؑ کی ہجرت: بہت سے پیغمبروں نے اپنی زندگی میں اپنے فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے ہجرت کی ہے ان میں سے ایک ابراہیمؑ ہیں۔ ان کی ہجرت کے بارے میں قرآن کی مختلف آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔

سورۂ عنکبوت کی آیہ ۲۶ میں بیان ہے:۔

وقال انی مہاجر الی ربی انہ ھو العزیز الحکیم

اس نے کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں بیشک وہ عزیز و حکیم ہے۔

اس مقام پر قرآن نے یہ بات ابراہیم کے آگ میں ڈالے جانے کے مسئلے کے بعد بیان کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدائی رہبر جب اپنا فریضۂ رسالت ایک جگہ مکمل کر لیتے تھے یا ماحول کو اپنی دعوت کے پھیلنے کے لیے سازگار نہیں پاتے تھے تو اس غرض سے کہ کہیں ان کی ذمہ داری اور پیام رسانی میں رکاوٹ نہ پڑ جائے ہجرت کر جاتے تھے۔ ادیان کی تاریخ میں یہ ہجرتیں بہت زیادہ برکتوں کا سرچشمہ بنیں۔ یہاں تک کہ تاریخ اسلام ظاہری و معنوی لحاظ سے پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کے محور کے گرد ہی گھومتی ہے اور اگر ہجرت نہ ہوتی تو اسلام مکہ کے بت پرستوں کی چالبازیوں کے سامنے ہمیشہ کے لیے دب جاتا۔ یہ ہجرت ہی تھی جس نے اسلام اور مسلمانوں کو نئی روح عطا کی اور ہر چیز کو ان کے فائدے میں بدل کر رکھ دیا اور انسانیت کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔

بلکہ ایک لحاظ سے ہجرت ہر فرد مؤمن کے لیے ایک عمومی حکمت عملی ہے کہ وہ جب بھی اپنی زندگی کے دوران میں ماحول کو اپنے مقدس مقاصد کے لیے غیر مناسب دیکھے اور اسے ایسی متعفن صورت میں پائے جس میں ہر چیز خراب ہو جاتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہجرت کر جائے۔ اسے چاہیے کہ سامانِ سفر باندھ کر زیادہ مناسب سرزمین کی طرف کوچ کر جائے کیونکہ خدا کا ملک محدود نہیں ہے لیکن اس سے پہلے کہ ذات سے باہر کی طرف ہجرت کرے، اپنی ذات کے اندر ہجرت کا اہتمام کرے، پہلے داخلی ہجرت کی ضرورت ہے۔ آلودگیوں سے پاکیزگی کی طرف ہجرت، شرک سے ایمان کی طرف ہجرت، گناہ سے پروردگار بزرگ کی اطاعت کی طرف ہجرت۔

یہ اندرونی ہجرت فرد اور معاشرہ کے لیے تبدیلی اور انقلاب کی ابتدا ہو گی اور بیرونی ہجرت کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید بنے گی۔ ہم تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد سورہ نساء کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں "اسلام و مہاجرت" کے عنوان کے تحت اس ضمن میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔

۱۰۱۔ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ○

۱۰۲۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○

۱۰۳۔ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۚ ○

۱۰۴۔ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۙ ○

۱۰۵۔ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○

۱۰۶۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ○

۱۰۷۔ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ○

۱۰۸۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۖ ○

۱۰۹۔ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ○

۱۱۰۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○

ترجمہ

۱۰۱۔ ہم نے اسے (ابراہیم کو) ایک بردبار اور با استقامت لڑکے کی بشارت دی۔

۱۰۲۔ جس وقت وہ اس کے ساتھ سعی و کوشش کے قابل ہو گیا تو اس نے کہا: بیٹا! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ تم دیکھو، تمھاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا: اباجان! آپ کو جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجیے، انشاء اللہ آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔

۱۰۳۔ جب دونوں آمادہ و تیار ہو گئے اور ابراہیم نے اسے پیشانی کے بل لٹایا۔

۱۰۴۔ تو ہم نے اسے ندا دی کہ اے ابراہیم!
۱۰۵۔ جو حکم تجھے خواب میں دیا گیا تھا تو نے اسے پورا کر دیا، ہم اسی طرح سے نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں۔
۱۰۶۔ بے شک یہ ایک کھلی آزمائش ہے۔
۱۰۷۔ ہم نے ذبحِ عظیم کو اس کا فدیہ بنایا۔
۱۰۸۔ اور اس کے نیک نام کو بعد والی اُمتوں میں باقی رکھا۔
۱۰۹۔ ابراھیم پر سلام ہو۔
۱۱۰۔ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں۔

تفسیر

ابراہیم قربان گاہ میں

گزشتہ آیات میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ابراہیم نے بابل میں اپنی رسالت کی ادائیگی کے بعد وہاں سے ہجرت کی اور اپنے پروردگار سے ان کا پہلا تقاضا یہ تھا کہ انھیں فرزند صالح عطا فرمائے کیونکہ ابھی تک وہ صاحبِ اولاد نہ تھے۔

زیر بحث پہلی آیت حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کی قبولیت کو بیان کر رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اسے ایک حلیم و بردبار اور با استقامت نوجوان کی بشارت دی (فبشرناہ بغلام حلیم)۔

حقیقت میں اس جملے میں تین بشارتیں جمع ہیں، ایک بیٹے کی، دوسری اس کے نوجوانی کے سن تک پہنچنے کی اور تیسری اس کے حلم جیسی صفت کا حامل ہونے کی۔

"حلیم" کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو توانائی ہوتے ہوئے کسی کام میں اس کے وقت سے پہلے جلدی نہیں کرتا اور مجرموں کو سزا دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا، جو ایک عظیم روح کا مالک ہوتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات پر کنٹرول رکھتا ہے۔

"راغب"، مفردات میں کہتا ہے:۔

حلم زیادہ غصّے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھنے کے معنی میں ہے اور چونکہ ایسی حالت عقل و خرد سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا بعض اوقات یہ لفظ عقل و خرد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

البتہ "حلم" کا حقیقی معنی وہ ہے جو پہلے بتایا گیا ہے۔ ضمنی طور پر اس توصیف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس فرزند کے بقاء کی بشارت اس زمانہ تک کے لیے دی ہے جب وہ ایسے سن تک پہنچ جائے کہ حلم کے ساتھ متصف ہو جائے اور جیسا کہ ہم

بعد والی آیات میں دیکھیں گے، اس نے اپنے حلیم ہونے کا "ذبح" کے موقع پر مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اپنے حلیم ہونے کا مظاہرہ اس وقت بھی اور آگ میں ڈالے جانے کے موقع پر بھی کیا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ لفظ "حلیم" قرآن مجید میں پندرہ بار آیا ہے یہ لفظ زیادہ تر خدا کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ سوائے دو موقعوں کے، جن میں یہ ابراہیمؑ اور ان کے فرزند کی صفت کے طور پر کلامِ خدا کے طور پر آیا ہے اور ایک موقع پر دو تنوں کی زبان سے حضرت شعیب کی صفت میں بیان ہوا ہے۔

لفظ "غلام" بعض کے نظریہ کے مطابق سنِ جوانی تک پہنچنے سے پہلے ہر بچے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض نے اس بچہ پر اس کا اطلاق کیا ہے جو دس سال سے اوپر ہو لیکن ابھی سنِ بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔

عربی لغت میں جو مختلف تعبیریں بیان ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ "غلام" دراصل "طفل" (بچہ) اور "شاب" (جوان) کے درمیان حدِ فاصل ہے، جسے ہم فارسی زبان میں "نوجوان" سے تعبیر کرتے ہیں۔

آخر حضرت ابراہیمؑ کا فرزندِ موعود خدائی بشارت کے مطابق پیدا ہوا اور باپ کا دل تو سالہا سال سے فرزندِ صالح کی انتظار میں تھا۔ فرزند کی پیدائش سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملی پھر وہ فرزند بچپن کے دور کو گزار کر جوانی کے سن میں داخل ہوا۔

قرآن اس موقع پر کہتا ہے: جس وقت وہ اس کے ساتھ سعی و کوشش کے قابل ہوا (فلمّا بلغ معه السعی)۔

یعنی وہ ایسے مرحلہ میں پہنچ گیا کہ زندگی کے مختلف مسائل میں باپ کے ہمراہ سعی و کوشش کر سکے اور اس کی مدد کر سکے۔

بعض نے یہاں "سعی" کو عبادت اور خدا کے لیے کام کرنے کے معنی میں سمجھا ہے۔ البتہ "سعی" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں یہ معنی بھی شامل ہے لیکن اس میں منحصر نہیں ہے اور "معه" باپ کے ساتھ کا معنی دیتا ہے۔ اس سے مراد امورِ زندگی میں باپ کی معاونت و مدد ہے۔

بہرحال مفسرین کے قول کے مطابق بیٹا ۱۲ سال کا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک عجیب اور حیرت انگیز خواب دیکھا۔ یہ خواب اس عظیم الشان پیغمبر کے لیے ایک اور آزمائش شروع ہونے کو بیان کرتا تھا۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ انھیں خدا کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے قربانی کریں اور اسے ذبح کر دیں۔

ابراہیم وحشت زدہ خواب سے بیدار ہوئے، وہ جانتے تھے کہ پیغمبروں کے خواب حقیقت ہوتے ہیں اور شیطانی وسوسوں سے دور ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود دو اور راتوں میں بھی یہی خواب دیکھا جو اس امر کے لازم ہونے اور اسے جلد انجام دینے کے لیے تاکید تھی۔

کہتے ہیں کہ پہلی مرتبہ "شب ترویہ" (آٹھ ذی الحجہ کی رات) یہ خواب دیکھا اور "عرفہ" اور "عید قربان" (نویں اور دسویں ذی الحجہ) کی راتوں میں خواب کا تکرار ہوا۔ لہٰذا اب ان کے لیے ذرا سا بھی شک باقی نہ رہا کہ یہ خدا کا قطعی فرمان ہے۔

ابراہیم جو بارہا امتحانِ خداوندی کی گرم بھٹی سے سرفراز ہو کر باہر آئے تھے اس دفعہ بھی چاہیے کہ بحرِ عشق میں کود پڑیں اور حق تعالیٰ کے فرمان کے سامنے سر جھکا دیں اور اس فرزند کو جس کے انتظار میں عمر کا ایک حصہ گزار دیا تھا اور اب وہ ایک آبرومند نوجوان تھا،

اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کردیں۔

لیکن ضروری ہے کہ ہر چیز سے پہلے اپنے فرزند کو اس کام کے لیے آمادہ کریں۔ لہٰذا اس کی طرف رخ کرکے فرمایا: میرے بیٹے! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کروں۔ اب تم دیکھو! تمھاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ (قال یا بنیّ انی اری فی المنام انی اذبحك فانظر ما ذا ترٰی)۔

بیٹا بھی تو ایثار پیشہ باپ کے وجود کا ایک حصہ تھا اور جس نے صبر و استقامت اور ایمان کا درس اپنی چھوٹی سی عمر میں اسی کے مکتب میں پڑھا تھا، اس نے خوشی خوشی خلوصِ دل کے ساتھ اس فرمانِ الٰہی کا استقبال کیا اور صراحت اور قاطعیت کے ساتھ کہا: اباجان! جو حکم آپ کو دیا گیا ہے اس کی تعمیل کیجیے (قال یا ابت افعل ما تؤمر)۔

میری طرف سے بالکل مطمئن رہیے۔" انشاء اللہ آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے (ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین)۔

باپ اور بیٹے کی یہ باتیں کس قدر معنی خیز ہیں اور کتنی باریکیاں ان میں چھپی ہوئی ہیں۔

ایک طرف تو باپ ۱۲ سالہ بیٹے کے سامنے اسے ذبح کرنے کی بات بڑی صراحت کے ساتھ کرتا ہے اور اس سے اس کی رائے معلوم کرتا ہے۔ اس کے لیے مستقل شخصیت اور ارادے کی آزادی کا قائل ہوتا ہے، وہ ہرگز اپنے بیٹے کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا اور اسے اندھیرے میں رکھتے ہوئے امتحان کے اس عظیم میدان میں آنے کی دعوت نہیں دیتا۔ وہ چاہتا ہے کہ بیٹا بھی اس عظیم امتحان میں پورے دل کے ساتھ شرکت کرے اور باپ کی طرح تسلیم و رضا کا مزہ چکھے۔

دوسری طرف بیٹا بھی یہ چاہتا ہے کہ باپ اپنے عزم و ارادہ میں پکا اور مضبوط رہے۔ یہ نہیں کہتا کہ مجھے ذبح کردیں۔ بلکہ کہتا ہے: جو آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے بجالائیں میں اس کے امر و فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم ہوں۔ خصوصاً باپ کو" یا ابت " (اباجان!) کہہ کر مخاطب کرتا ہے، تاکہ اس بات کی نشاندہی کردے کہ اس مسئلے پر جذبات فرزند و پدر کا سوئی کی نوک کے برابر بھی اثر نہیں، کیونکہ فرمانِ خدا ہر چیز پر حاکم ہے۔

اور تیسری طرف سے پروردگار کی بارگاہ میں مراتبِ ادب کی اعلیٰ ترین طریقے سے پاسداری کرتا ہے، ہرگز اپنے ایمان اور عزم و ارادہ کی قوت پر بھروسہ نہیں کرتا، بلکہ خدا کی مشیت اور اس کے ارادے پر تکیہ کرتا ہے اور اس عبارت کے ساتھ اس سے پامردی اور استقامت کی توفیق چاہتا ہے۔

اس طرح سے باپ بھی اور بیٹا بھی اس عظیم آزمائش کے پہلے مرحلے کو مکمل کامیابی کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔

اس دوران کیا کیا حالات پیش آئے، قرآن نے انھیں تشریح کے ساتھ بیان نہیں کیا اور صرف اس عجیب ماجرے کے نہایت حساس پہلو ذکر کیے ہیں۔

بعض نے لکھا ہے کہ فداکار بیٹے نے اس بنا پر کہ باپ کی اس ماموریت کی انجام دہی میں مدد کرے اور ماں کے رنج و اندوہ میں کمی کرے۔ جس وقت وہ اسے سرزمین" منیٰ کے" خشک اور جلا ڈالنے والے گرم پہاڑوں کے درمیان، قربان گاہ میں لائے تو باپ سے کہا: اباجان! رسی کو مضبوطی کے ساتھ باندھ دیجیے، تاکہ میں فرمانِ خداوندی کے اجراء کے وقت ہاتھ پاؤں ہلا سکوں

مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس سے میرے اجر میں کمی واقع نہ ہو جائے ۔

ابا جان ! چھری تیز کر لیجیے اور تیزی کے ساتھ میرے گلے پر چلائیے تاکہ اسے برداشت کرنا مجھ پر بھی (اور آپ پر بھی) زیادہ آسان ہو جائے ۔

ابا جان ! میرا کرتا پہلے ہی میرے بدن سے اتار لیجیے تاکہ وہ خون آلود نہ ہو ، کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں میری ماں اسے دیکھے تو دامن صبر اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے ۔

پھر مزید کہا ، میرا سلام میری ماں کو پہنچا دیجیے گا اور اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو میرا کرتا اس کے لیے لے جائیے گا جو اسکی تسلی خاطر اور تسکین کا باعث بنے گا کیونکہ وہ اس سے بیٹے کی خوشبو سونگھے گی اور جس وقت دل بے قرار ہو گا تو اسے اپنی آغوش میں لے لے گی اس طرح یہ اس کے دردِ دل میں تخفیف کا باعث ہو گا ۔

آخر وہ حساس لمحے آن پہنچے جب فرمانِ الٰہی کی تعمیل ہونا تھی ۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب بیٹے کے مقامِ تسلیم کو دیکھا تو اسے اپنی آغوش میں لے لیا ، اس کے رخساروں کے بوسے لیے اور اس گھڑی دونوں رونے لگے ۔ ایسا گریہ تھا کہ ان کے جذبات اور لقائے خدا کے لیے ان کا شوق ظاہر ہوتا تھا ۔

قرآن مختصر اور معنی خیز عبارت میں صرف اتنی سی بات کہتا ہے : جب دونوں آمادہ و تیار ہو گئے اور (باپ) ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا ۔ (فلمّا اسلما و تلّه للجبين)[1]

قرآن یہاں پھر اختصار کے ساتھ گزر گیا ہے اور سننے والے کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے احساسات کی موجوں کے ساتھ قصے کو سمجھے ۔

بعض نے کہا ہے کہ " تلّه للجبين " سے مراد یہ تھی کہ بیٹے کی پیشانی خود اس کی فرمائش پر زمین پر رکھی کہ مبادا ان کی نگاہ بیٹے کے چہرے پر پڑے اور پدری جذبات جوش میں آجائیں اور فرمانِ خدا کے اجراء میں مانع ہو جائیں ۔

بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کے چہرے کو خاک پر رکھا اور چھری کو حرکت دی اور تیزی اور طاقت کے ساتھ اسے بیٹے کے گلے پر پھیر دیا جب کہ ان کی روح ہیجان میں تھی اور صرف عشقِ خدا ہی انھیں اپنی راہ میں کسی شک کے بغیر آگے بڑھا رہا تھا ۔

لیکن تیز دھار چھری نے بیٹے کے لطیف و نازک گلے پر معمولی سا بھی اثر نہ کیا ۔

حضرت ابراہیمؑ حیرت میں ڈوب گئے ، دوبارہ چھری کو چلایا لیکن پھر بھی وہ کارگر ثابت نہ ہوئی ۔ ہاں ! خلیل تو کہتے ہیں کہ " کاٹ " لیکن خداوند جلیل یہ حکم دے رہا ہے کہ " نہ کاٹ " اور چھری تو صرف اسی کی فرمانبردار ہے ۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں قرآن ایک مختصر اور معنی خیز جملے کے ساتھ انتظار کو ختم کرتے ہوئے کہتا ہے : اس وقت ہم نے ندا دی

---

[1] " تلّه " " تل " کے مادے سے اصل میں اونچی جگہ کے معنی میں ہے اور " تلّه للجبين " کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو ایک اونچی جگہ پر چہرے کی ایک طرف زمین پر لٹایا ۔ " جبين " چہرے کی طرف کے معنی میں ہے اور اس کی دونوں طرفوں کو " جبينان " کہتے ہیں ۔

(اور پکار کر کہا) کہ اے ابراہیم! (و نادیناہ ان یا ابراھیم)۔

خواب میں جو حکم تمھیں دیا گیا تھا وہ تم نے پورا کر دیا (قد صدقت الرءیا)
ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں (انا کذلک نجزی المحسنین)۔
ہم ہی انھیں امتحان میں کامیابی کی توفیق دیتے ہیں اور ہم ایسا بھی نہیں ہونے دیں گے کہ ان کا فرزند دل بدان کے ہاتھ ہی سے چلا جائے۔ ہاں! جو شخص سرتاپا ہمارے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے اور اس نے نیکی کو اعلیٰ حد تک پہنچا دیا ہے، اس کی اس کے سوا اور کوئی جزا نہیں ہوگی۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: بے شک یہ اہم اور آشکار امتحان ہے (ان ھٰذا لھو البلاء المبین)۔
بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا، وہ بھی نیک اور لائق بیٹا، اس باپ کے لیے جس نے ایک عمر ایسے فرزند کے انتظار میں گزاری ہو سادہ اور آسان کام نہیں ہے۔ ایسے فرزند کی یاد کس طرح دل سے نکال سکتا تھا؟ اس سے بھی بالاتر یہ کہ وہ انتہائی تسلیم و رضا کے ساتھ ماتھے پر شکن لائے بغیر ایسے فرمان کی تعمیل کے لیے آگے بڑھے اور اس کے تمام مقدمات کو آخری مرحلے تک انجام دے، اس طور پر کہ روحانی اور عملی آمادگی کے لحاظ سے کوئی کسر باقی نہ چھوڑے۔
اس سے بھی بڑھ کر عجیب، اس فرمان کے آگے اس نوجوان کی اطاعت شعاری کی انتہا، وہ خوشی خوشی، اطمینانِ قلب کے ساتھ، پروردگار کے لطف سے، اس کے ارادہ کے سامنے، سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے، ذبح کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔
اسی لیے بعض روایات میں ہے کہ جس وقت یہ کام انجام پا چکا تو جبرئیل نے (تعجب کرتے ہوئے) پکار کر کہا "اللہ اکبر" "اللہ اکبر" ابراہیمؑ کے فرزند نے کہا: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ اَکْبَرُ" اور عظیم فداکار باپ نے بھی کہا "اللہ اکبر و للہ الحمد"[1]
اور یہ ان تکبیروں کے مشابہ ہے جو ہم عیدِ قربان کے دن پڑھتے ہیں۔

لیکن اس غرض سے کہ ابراہیم کا پروگرام بھی نامکمل نہ رہ جائے اور خدا کی بارگاہ میں ان کی طرف سے قربانی بھی ہو جائے اور ابراہیم کی آرزو پوری ہو جائے، خدا نے ایک بہت بڑا مینڈھا بھیج دیا تاکہ بیٹے کی جگہ اس کی قربانی کریں اور مراسم "حج" اور سرزمین "منیٰ" میں آنے والوں کے لیے اپنی سنت چھوڑ جائیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: ہم نے ذبحِ عظیم کو اس کا فدیہ قرار دیا (و فدیناہ بذبح عظیم)۔
اس بارے میں کہ اس ذبح کی عظمت کس لحاظ سے تھی، جسمانی اور ظاہری لحاظ سے یا اس جہت سے کہ فرزندِ ابراہیمؑ کا فدیہ تھی

---

[1] تفسیر قرطبی اور تفسیر روح المعانی

یا اس لحاظ سے کہ خدا کی راہ میں اور خدا کے لیے تھی یا اس لحاظ سے کہ یہ قربانی خدا کی طرف سے ابراہیمؑ کے لیے بھیجی گئی تھی [1]

مفسرین نے اس سلسلے میں بہت کچھ کہا، لیکن کوئی مانع نہیں کہ یہ تمام جہات ذبحِ عظیم میں جمع ہوں اور وہ مختلف جہات سے عظمت کی حامل ہو۔

اس ذبح کی عظمت کی ایک نشانی یہ ہے کہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ ہر سال زیادہ وسعت پا رہی ہے۔

اس وقت ہر سال اس ذبحِ عظیم کی یاد میں دس لاکھ سے زیادہ جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور اس یاد کو زندہ کیا جاتا ہے۔

"فدینا" "فدا" کے مادہ سے اصل میں کسی شخص یا چیز کی بلا دور کرنے یا دفع ضرر کے لیے کسی دوسری چیز کو صدقہ قرار دینے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے وہ مال جو قیدی کو آزاد کرنے کے لیے دیتے ہیں اسے "فدیہ" کہتے ہیں۔ نیز اس کفارہ کو بھی فدیہ کہتے ہیں جو بعض بیمار روزہ کے بجائے دیتے ہیں۔

وہ بہت بڑا مینڈھا ابراہیمؑ کو کس طرح دیا گیا اس بارے میں زیادہ تر اس بات کے معتقد ہیں کہ اسے جبرئیل لائے تھے، بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ "منیٰ" کے پہاڑوں کے دامن سے نیچے اترا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا خدا کے حکم اور اس کے ارادے سے تھا۔

خدا نے نہ صرف اس دن کے عظیم امتحان میں حضرت ابراہیمؑ کی کامیابی کی تعریف و توصیف کی، بلکہ اس کی یاد کو جاودانی بنا دیا۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ابراہیم کے نیک نام کو بعد کی امتوں میں باقی رہنے والا بنایا (و ترکنا علیہ فی الآخرین)۔

وہ آنے والی سب نسلوں اور لوگوں کے لیے نمونہ اور تمام پاکباز اور کوئے دوست کے دلدادہ عاشقوں کے لیے راہنما بن گئے اور ہم نے ان کے طرزِ عمل کو رہتی دنیا تک کے لیے حج کی سنّت کے طور پر جاودانی بنا دیا۔ وہ عظیم پیغمبروں کے باپ تھے وہ امتِ اسلامی اور پیغمبرِ اسلامؐ کے باپ تھے۔

ابراہیم پر سلام (جو مخلص اور پاکباز تھا)۔ (سلام علی ابراھیم)۔

ہاں ہم اسی طرح سے نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں (کذالک نجزی المحسنین)۔

عظمتِ دنیا کا صلہ، تمام زمانوں میں ہمیشگی کا صلہ، خدائے بزرگ کے لائق درود و سلام کا صلہ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "کذالک نجزی المحسنین" کا جملہ ایک دفعہ تو یہاں آیا ہے اور اس سے پہلے کی چند

---

[1] ظاہر ہے کہ جانور کتنا ہی باعظمت کیوں نہ ہو وہ کسی عام انسان کے مقابلے میں بھی عظیم نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وہ ایک نبی و رسول اور وہ بھی ذبیح اللہ جیسے نبی کے مقابلے میں۔ لہٰذا ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، ورنہ مسئلہ واضح ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ نہیں تو پھر ذبحِ عظیم سے کون مراد ہے؟ اس سلسلے میں شاعر مشرق کہتے ہیں:

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنیٔ "ذبحِ عظیم" آمد پسر

جبکہ شیعہ و سنی طرق سے کئی ایک روایات بھی اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ذبحِ عظیم سے مراد امام حسینؑ کی قربانی ہے (مترجم)۔

آیات میں بھی آیا ہے۔ اس تکرار میں حتماً کوئی نکتہ ہے۔

ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے مرحلے میں تو خدا تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کی ان کے عظیم امتحان میں کامیابی کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی کامیابی پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ یہ خود ایک عظیم جزا ہے، یہ ایک اہم خوشخبری تھی جو خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو دی تھی اس کے بعد ذبحِ عظیم کے فدیہ کرنے، ان کے نام اور سنت کے جاوداں رہنے اور ان پر خدا کے سلام بھیجنے کا ذکر ہے جو تین دوسری بڑی نعمتیں ہیں اور اسے نیکوکاروں کے اجر کے عنوان سے بیان کرتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ذبیح اللہ کون ہے؟: اس بارے میں کہ حضرت ابراہیمؑ کے دونوں فرزندوں (اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ) میں سے کون قربان گاہ میں لایا گیا اور کس نے ذبیح اللہ کا لقب پایا؟ مفسّرین کے درمیان شدید بحث ہے۔ ایک گروہ حضرت اسحاقؑ کو "ذبیح" جانتا ہے اور ایک جماعت حضرت اسماعیلؑ کو۔ پہلے نظریئے کو بہت سے مفسّرین اہل سنت اور دوسرے نظریہ کو مفسّرین شیعہ نے اختیار کیا ہے۔

لیکن جو کچھ قرآن کی مختلف آیات کے ظاہر سے ہم آہنگ ہے وہ یہی ہے کہ "ذبیح" "اسماعیلؑ" تھے کیونکہ:

اوّلاً: ایک جگہ بیان ہوا ہے:

وبشرناہ باسحاق نبیًا من الصالحین

ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی جو صالحین میں سے ایک پیغمبر تھا۔ (صافات ـــــ ۱۱۲)

یہ تعبیر بخوبی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا نے اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت اس واقعے کے بعد دی ہے اور حضرت ابراہیمؑ کی قربانیوں کی وجہ سے انھیں یہ بشارت دی گئی۔ اس بنا پر ذبح کا واقعہ ان کے ساتھ مربوط نہیں تھا۔

علاوہ ازیں جب خدا کسی کی نبوت کی بشارت دیتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ زندہ رہے گا اور یہ بات بچپن میں ذبح کے مسئلے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

ثانیاً سورۂ ہود کی آیہ ۷۱ میں بیان ہوا ہے:

فبشرناھا باسحاق ومن وراء اسحاق یعقوب

ہم نے اسے اسحٰق کے پیدا ہونے کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کے پیدا ہونے کی بھی۔

یہ آیت اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مطمئن تھے کہ اسحاقؑ زندہ رہیں گے اور ان سے یعقوبؑ جیسا فرزند پیدا ہوگا اس بنا پر ان کے ذبح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ حضرت اسحاقؑ کو ذبیح جانتے ہیں، حقیقت میں انھوں نے ان آیات کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ثالثاً: منابع اسلامی میں بہت سی روایات ایسی آئی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ "ذبیح" اسماعیلؑ تھے

نمونہ کے طور پر :۔

ایک معتبر حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے :

انا ابن الذبیحین

میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں

اور دو ذبیحوں سے مراد ایک آپؐ کے والد گرامی حضرت عبداللہ ہیں ۔ کیونکہ پیغمبر اکرمؐ کے جد امجد حضرت عبدالمطلب نے نذر مانی تھی کہ وہ انھیں خدا کے لیے قربان کریں گے ۔ اس کے بعد حکم خدا سے ایک سو اونٹ ان کے فدیہ کے طور پر دیئے گئے اور ان کی داستان مشہور ہے ۔ دوسرے حضرت اسماعیلؑ تھے کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ پیغمبر اسلامؐ جناب اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھے نہ کہ حضرت اسحاقؑ کی رسل[1]

اس دعا میں جو علی علیہ السلام نے پیغمبر گرامیؐ سے نقل کی ہے ، یہ بیان ہوا ہے :

یامن فدا اسماعیل من الذبح

اے وہ جس نے اسماعیل کے لیے فدیہ قرار دیا[2]

ان احادیث میں جو امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت لوگوں نے سوال کیا کہ "ذبیح" کون تھا ؟ تو آپؑ نے فرمایا : " اسماعیل "۔

اس حدیث میں جو امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے ، یہ بیان ہوا ہے ۔

لو علم اللہ عز وجل شیئاً اکرم من الضأن لفدا بہ اسماعیل

اگر کوئی جانور (خدا کے نزدیک) دنبے سے بہتر ہوتا تو اسے اسماعیل کا فدیہ قرار دیتا[3]

خلاصہ یہ کہ اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں اگر ہم ان سب کو نقل کرنا چاہیں تو گفتگو لمبی ہو جائے گی[4]

ان فراواں روایات کے مقابلے میں جو قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم سے بھی ہم آہنگ ہیں ایک شاذ روایت بھی ہے ، جو حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے پر دلالت کرتی ہے جو پہلی روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی ظاہر آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ مسئلہ مسلّم ہے کہ وہ بچہ جسے ابراہیمؑ حکم خدا سے اس کی ماں کے ساتھ مکہ لائے اور وہاں پر

---

[1] تفسیر " مجمع البیان " زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

[2] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۱

[3] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۲

[4] ان روایات کے بارے میں مزید اطلاع کے لیے تفسیر " برہان " (جلد ۴ ، ص ۲۸) اور تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۰ ۔ اس کے بعد کی طرف رجوع کریں ۔

دامے چھوڑا۔

پھر خانہ کعبہ اس کی مدد کے ساتھ بنایا اور اس کے ساتھ طواف وسعی بجالائے وہ اسماعیل تھے۔ یہ امور اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ذبیح بھی اسماعیلؑ ہی تھے کیونکہ ذبح کا عمل مذکورہ بالا پروگرام کی تکمیل کرتا ہے۔

البتہ جو کچھ کتب عہد عتیق (موجودہ تورات) سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ذبیح اسحاقؑ تھے [1]

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں بعض غیر معروف روایات جن میں حضرت اسحاقؑ کو ذبیح قرار دیا گیا ہے، اسرائیلی روایات سے متاثر ہیں اور احتمالاً یہودیوں کے جعلیات میں سے ہیں۔ یہودی چونکہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں سے تھے لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ یہ افتخار و اعزاز اپنے لیے ثبت کریں اور مسلمانوں کہ جن کے رسولؐ نسلِ اسماعیلؑ سے ہیں ان سے یہ اعزاز چھین لیں، چاہے اس کے لیے حقائق کا انکار ہی کیوں نہ ہو۔

بہر حال ہمارے لیے جو کچھ سب سے زیادہ محکم ہے وہ آیاتِ قرآن کے ظواہر ہیں جو بخوبی نشاندہی کرتے ہیں کہ ذبیح اسماعیلؑ تھے اگرچہ ہمارے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ذبیح اسماعیلؑ ہوں یا اسحاقؑ، دونوں ابراہیمؑ کے فرزند تھے اور دونوں ہی خدا کے عظیم پیغمبر تھے۔ مقصد تو اس تاریخی واقعے کا واضح و روشن ہونا ہے۔

۲۔ کیا ابراہیمؑ فرزند کو ذبح کرنے پر مامور تھے؟ ایک اور سوال جو یہاں مفسرین کو درپیش ہے یہ ہے کہ کیا ابراہیمؑ واقعاً بیٹے کو ذبح کرنے پر مامور تھے یا انھیں اس کے مقدمات کا حکم تھا؟ اگر وہ ذبح پر مامور تھے تو پھر یہ حکمِ الٰہی انجام پانے سے پہلے ہی کس طرح منسوخ ہو گیا؟ جب کہ عمل سے پہلے منسوخ ہونا جائز نہیں ہے اور یہ معنی علم اصولِ فقہ میں ثابت ہو چکا ہے۔

اگر وہ ذبح کے لیے اقدامات کرنے پر مامور تھے تو یہ افتخار کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس مسئلے کی اہمیت اس امر سے پیدا ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا خیال تھا کہ مقدمات فراہم کرنے اور ابتدائی امور انجام دینے کے بعد شاید ذبح کا اصل حکم دیا جائے اور یہی ان کا عظیم امتحان تھا۔ ہمارے نزدیک اس نظریئے میں کوئی خاص جاذبِ نظر بات نہیں ہے ہماری رائے میں یہ سب باتیں اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ امتحانی اور غیر امتحانی اوامر میں فرق نہیں رکھا گیا، ابراہیمؑ کو جو امر ہوا تھا وہ ایک امتحانی امر تھا اور ہم یہ جانتے ہیں کہ امتحانی اوامر میں حتمی ارادہ اور چیز ہے اور اصل عمل کچھ اور شے۔ ایسے اوامر میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ موردِ آزمائش شخص کہاں تک فرمان کی اطاعت پر آمادگی رکھتا ہے اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ موردِ آزمائش شخص پشت پردہ اسرار سے آگاہ نہیں ہوتا۔

لہٰذا یہاں نسخ واقع نہیں ہوا کہ عمل سے پہلے اس کی صحت کے بارے میں بحث و گفتگو ہو۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس واقعے کے بعد حضرت ابراہیمؑ سے کہتا ہے:

قد صدقت الرءیا

اے ابراہیم! تم نے جو خواب دیکھا تھا سچ کر دکھایا۔

---

[1] تورات، سفر تکوین فصل ۲۲

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فرزند دلبند کو ذبح کرنے کے سلسلے میں جو کچھ ان کے بس میں تھا انھوں نے انجام دیا اور اس سلسلے میں اپنی روحانی اور دلی آمادگی ہر حیثیت سے درجۂ ثبوت تک پہنچادی اور آزمائش کی اس ذمہ داری کو خوب اچھی طرح سے پورا کر دکھایا۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ کا خواب کس طرح حجت ہو سکتا ہے؟ خواب اور خواب دیکھنے کے بارے میں بہت سی باتیں ہیں، جس کی ایک مبسوط تفصیل ہم سورۂ یوسف کی آیہ ۴ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں[1]

یہاں پر جو بات ضروری ہے کہ جس کی طرف توجہ کی جائے یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب کو کس طرح حجت سمجھا اور اسے کیوں اپنے عمل کا معیار قرار دیا؟ اس سوال کے جواب میں کبھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء کے خواب ہرگز شیطانی خواب نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ قوتِ واہمہ کی فعالیت کی پیداوار ہوتے ہیں، بلکہ وہ ان کی نبوت اور وحی کا ایک گوشہ ہوتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں انبیاء کا مصدر وحی کے ساتھ ارتباط کبھی تو دل میں القاء کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی فرشتۂ وحی کو دیکھنے کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی صوتی امواج کی راہ سے جو خدا کے فرمان سے پیدا ہوتی ہیں اور کبھی خواب کے طریقے سے۔ لہٰذا ان کے خوابوں میں کسی قسم کی خطا یا غلطی پیدا نہیں ہوتی، اور جو چیز وہ خواب میں دیکھتے ہیں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ بیداری میں دیکھتے ہیں۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بیداری کی حالت میں وحی کے ذریعے آگاہی حاصل کی تھی کہ وہ "ذبح" کے بارے میں جو خواب دیکھیں اس پر عمل کریں۔

نیز کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس خواب میں مختلف قرائن تھے۔ ایک یہ کہ تین شب پے در پے بعینہٖ اس کا تکرار ہوا کہ جس نے اُنکے لیے یہ علم و یقین پیدا کر دیا کہ یہ ایک خدائی ماموریت ہے کوئی اور چیز نہیں ہے۔

بہرحال ممکن ہے کہ یہ تمام ہی تفاسیر صحیح ہوں اور آپس میں کوئی تضاد بھی نہیں رکھتیں اور ظواہر آیات کے خلاف بھی نہیں ہیں۔

۴۔ شیطانی وسوسے ابراہیمؑ کی عظیم روح پر اثر نہ کر سکے: ابراہیمؑ کا امتحان پوری تاریخ میں ایک عظیم امتحان تھا۔ ایسا امتحان جس کا مقصد یہ تھا کہ ان کے دل کو غیر خدا کی مہر و محبت اور عشق سے پاک رکھنا اور عشقِ الٰہی کو ان کے سارے کے سارے دل پر سایہ فگن کرنا تھا۔ بعض روایات کے مطابق شیطان نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ کوئی ایسا کام کرے کہ حضرت ابراہیمؑ اس میدان سے کامیاب ہو کر نہ نکلیں۔ کبھی وہ (اسمٰعیلؑ کی) ماں ہاجرہ کے پاس آیا اور ان سے کہا تمھیں معلوم ہے کہ ابراہیم نے کیا ارادہ کیا ہے؟ وہ چاہتا ہے کہ آج اپنے بیٹے کو ذبح کر دے۔

ہاجرہ نے کہا: دور ہو جا، محال اور نہ ہونے والی بات نہ کر، کیونکہ وہ تو بہت مہربان ہے اپنے بیٹے کو کیسے ذبح کر سکتا ہے؟ اصولاً کیا دنیا میں کوئی ایسا انسان پیدا ہو سکتا ہے جو اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دے؟

---

[1] جلد ۹ میں ملاحظہ کیجیے۔

شیطان نے اپنے وسوسہ کو جاری رکھتے ہوئے کہا: اس کا دعوٰی ہے کہ خدا نے اسے حکم دیا ہے۔

ہاجرہ نے کہا: اگر خدا نے اسے حکم دیا ہے تو پھر اسے اطاعت کرنا چاہیے، اور سوائے رضا و تسلیم کے کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔

پھر شیطان ان کے بیٹے اسماعیلؑ کے پاس آیا، اور انھیں ورغلانے لگا۔ ان سے بھی اسے کچھ حاصل نہ ہو سکا، کیونکہ اس نے اسماعیلؑ کو تسلیم و رضا کا پیکر پایا۔

آخر میں حضرت ابراہیمؑ کے پاس آیا اور ان سے کہا: ابراہیم! جو خواب تم نے دیکھا ہے وہ شیطانی خواب ہے، تم شیطان کی اطاعت نہ کرو۔

ابراہیمؑ نے نورِ ایمان اور نبوت کے پرتو میں اسے پہچان لیا؛ چلا کر کہا: "دور ہو جا اے دشمنِ خدا"[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پہلے مشعر الحرام میں آئے تاکہ بیٹے کی قربانی دیں، تو شیطان ان کے پیچھے دوڑا۔ وہ جمرہ اولٰی کے پاس آئے۔ شیطان وہاں بھی ان کے پیچھے لگ گیا۔ ابراہیمؑ نے سات پتھر اٹھا کر اسے مارے۔ جس وقت دوسرے جمرہ کے پاس پہنچے تو پھر شیطان کو دیکھا، دوبارہ سات پتھر اسے مارے یہاں تک کہ "جمرہ عقبہ" میں آئے تو سات اور پتھر اسے مارے۔ (اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنے سے مایوس کر دیا)[2]

یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ شیطانی وسوسے امتحان کے عظیم میدانوں میں ایک طرف سے ہی نہیں بلکہ مختلف سمتوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔

ہر زمانے میں ایک نئے رنگ میں اور ایک نئے طریقے سے۔ مردانِ خدا کو چاہیے کہ وہ ابراہیمؑ کی طرح شیاطین کو تمام چہروں میں پہچانیں اور وہ جس طریقے سے بھی وارد ہوں، ان کے راستے بند کر دیں اور انھیں سنگسار کریں اور کیا ہی عظیم درس ہے یہ۔

۵۔ "منٰی" میں تکبیرات کا فلسفہ: ہم جانتے ہیں کہ اسلامی روایات میں عید الاضحٰی کے بارے میں جو احکام آئے ہیں ان میں کچھ مخصوص تکبیریں ہیں۔ جو تمام مسلمان پڑھتے ہیں چاہے وہ مراسم حج میں شریک ہوں اور منٰی میں موجود ہوں اور چاہے دوسرے مقامات پر ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ جو منٰی میں ہیں وہ ۱۵ نمازوں کے بعد پڑھتے ہیں جن میں سے پہلی عید کے دن کی نمازِ ظہر ہے اور جو منٰی میں نہیں ہوتے وہ ۱۰ نمازوں کے بعد تکرار کرتے ہیں اور ان تکبیرات کی صورت اس طرح ہے:

اللہ اکبر، اللہ اکبر. لا الٰہ الّا اللہ، و اللہ اکبر، اللہ اکبر، و للہ الحمد،
اللہ اکبر علٰی ما ھدانا

جس وقت ہم اس حکم کا اس حدیث کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھتے ہیں، جسے ہم پہلے نقل کر چکے

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۹ ص ۲۲۶، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] ایضاً

ہیں ۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تکبیریں حقیقت میں جبرئیلؑ اور اسماعیلؑ اور ان کے باپ ابراہیمؑ کی تکبیروں کا مجموعہ ہیں اور کچھ اس پر اضافہ ہے ۔

دوسرے لفظوں میں یہ الفاظ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اس عظیم آزمائش میں کامیابی کی یاد لوگوں کی نظروں میں زندہ کرتے ہیں، اور تمام مسلمانوں کو ایک پیغام الٰہی دیتے ہیں ۔ چاہے وہ منیٰ میں ہوں یا منیٰ کے علاوہ دوسرے مقامات پر ۔

ضمنی طور پر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "منیٰ" کا نام اس بنا پر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب اس زمین پر پہنچے اور اپنے امتحان سے گزر چکے تو جبرئیلؑ نے ان سے کہا: جو کچھ آپ چاہتے ہیں، اپنے پروردگار سے کہیں انھوں نے خدا سے تمنا کی کہ خدا یہ حکم دے کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل کے فدیہ کے طور پر دنبہ ذبح کریں اور ان کی یہ تمنا پوری ہوگئی [۱]

۶۔ حج ایک اہم انسان ساز عبادت ہے : سفرِ حج حقیقت میں ایک عظیم ہجرت ہے، ایک خدائی سفر ہے، خود سازی اور جہادِ اکبر کا ایک وسیع میدان ہے ۔

مراسمِ حج حقیقت میں ایک ایسی عبادت کی نشاندہی کرتے ہیں جو ابراہیمؑ، ان کے فرزند اسمٰعیلؑ اور ان کی زوجہ ہاجرہ کی جدوجہد اور جہاد کی گہری یاد کے ساتھ وابستہ ہیں ۔ ہم اگر اسرارِ حج کے مطالعے میں اس نکتہ سے غفلت برتیں تو اس کے بہت مراسم معمّا دکھائی دیں ۔ ہاں! اس معمّا کے حل کی چابی اس گہرے تعلق کی طرف توجہ کرنے میں ہے ۔

جب ہم منیٰ کی قربان گاہ میں آتے ہیں تو ہم تعجب کرتے ہیں کہ یہ سب قربانیاں کس لیے ہیں؟ اصولی طور پر کیا جانور ذبح کرنا بھی عبادتوں میں سے ایک عبادت ہو سکتی ہے؟

لیکن جب ہم حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کو یاد کرتے ہیں، جنھوں نے اپنے عزیز ترین اور اپنی عمر کے شیریں ترین ثمر کو راہِ خدا میں قربان کیا تھا اور اس کے بعد ایک سنت قربانی کے عنوان سے منیٰ میں وجود میں آئی ، تو ہمیں اس کام کا فلسفہ معلوم ہو جاتا ہے ۔

یہ قربانی معبود کی راہ میں ہر چیز کو چھوڑ دینے کی دلیل ہے ۔ یہ قربانی غیرِ خدا کی یاد سے دل کو خالی کرنے کا مظہر ہے ۔ ان مناسک سے اسی وقت پورا پورا تربیتی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ حضرت اسماعیلؑ کے ذبح ہونے کا منظر اور قربانی کے وقت اس باپ اور بیٹے کی روحانی حالت اور جذبات کا منظر آنکھوں میں پھر جائے ۔ تب، اور وہ حالت و جذبات انسان کے وجود پر اپنا پرتو ڈالیں [۲]

---

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۰ (حدیث ۶۸)

[۲] افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دورِ حاضر میں قربانی کے مراسم نے غیر مطلوب شکل اختیار کر لی ہے جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے علماءِ اسلام کو کوشش کرنی چاہیے ہم اس سلسلے میں اور حج کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جلد ۱۴ سورہ حج کی آیات ۲۶ تا ۲۸ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں ۔

جس وقت جمرات (پتھر کے تین مخصوص ستون جنھیں حجاج کرام مراسم حج میں سنگسار کرتے ہیں اور ہر دفعہ سات پتھر مراسم مخصوص کے ساتھ انھیں مارتے ہیں) کے پاس جائیں تو یہ معما ہماری نظر میں واضح ہوتا ہے کہ یہ سب پتھر ایک بے روح ستون کی طرف پھینکنے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے اور اس سے کون سا مسئلہ حل ہوتا ہے؟ لیکن اس وقت اس کا مفہوم کھل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے جب ہم دل میں یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تو مکتب توحید کے ہیرو ابراہیمؑ کے شیطان کے وسوسوں سے مقابلے اور جہاد کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہے کہ جب شیطان تین مرتبہ ان کے راستے میں حائل ہونے کے لیے آیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ انھیں اس "جہاد اکبر" کے میدان میں سستی اور شک و شبہ میں مبتلا کر دے لیکن ابراہیمؑ جیسے بہادر ہیرو نے تینوں مرتبہ پتھر مار کر اسے اپنے سے دور کر دیا۔

ان مراسم کا مفہوم یہ ہے کہ تم سب کو بھی اپنی پوری زندگی میں جہادِ اکبر کے میدان میں شیاطین کے وسوسوں کا سامنا ہے اور جب تک تم انھیں سنگسار نہ کرو گے اور اپنے سے دُور نہ بھگا دو گے، کامیاب نہ ہو گے۔

اگر تم یہ چاہتے ہو کہ جس طرح خداوند تعالیٰ نے ابراہیمؑ پر سلام بھیجا ہے اور ان کے مکتب اور یاد کو جاودانی بنا دیا ہے۔ تم پر بھی لطف و رحمت کی نظر کرے، تو ضروری ہے کہ ان کے راستے پر ہمیشہ چلو۔

یا جس وقت ہم صفا اور مروہ کی طرف آتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ گروہ در گروہ ایک چھوٹی سی پہاڑی سے اس سے بھی زیادہ چھوٹی پہاڑی کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے پھر اسی کی طرف پلٹ آتے ہیں اور بار بار کچھ حاصل کیے اس عمل کو دہراتے ہیں کبھی دوڑتے ہیں اور کبھی چلتے ہیں، یقیناً ہم تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیا کام ہے اور اس کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟

لیکن پھر ہم پیچھے کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اس باایمان خاتون (ہاجرہؑ) کی اپنے شیر خوار بچے اسماعیلؑ کی جان بچانے کے لیے، اس خشک اور گرمی سے جلتے ہوئے بیابان میں سعی و کوشش کو یاد کرتے ہیں کہ کس طرح اس سعی و کوشش کے بعد خدا نے اسے اس کے مقصد تک پہنچایا۔ زمزم کا چشمہ اس کے نوزائیدہ بچے کے پاؤں کے پنجے سے پھوٹا۔ اچانک زمانے کی گردش پیچھے کی طرف لوٹتی ہے، پردے ہٹ جاتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو اس لمحے ہاجرہ کے پاس پاتے ہیں اور اس کے ساتھ سعی و تلاش میں ہمگام ہو جاتے ہیں کیونکہ راہِ خدا میں کوئی بھی شخص سعی و تلاش کے بغیر منزل تک نہیں پہنچتا۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، اس سے انسان آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ حاصل کر سکتا ہے کہ حج کے ان رموز کی تعلیم دینا چاہیے۔ اور ابراہیمؑ، ان کے فرزند اور ان کی زوجہ کی یادوں کی قدم بہ قدم پیروی کرنی چاہیے تاکہ حج کے فلسفے کا بھی ادراک ہو اور حج کے اخلاقی عمیق اور گہرے اثرات بھی حجاج کے دلوں پر سایہ فگن ہوں کیونکہ ان آثار کے بغیر ظاہری پھلکے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۱۱۱۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ○
۱۱۲۔ وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○
۱۱۳۔ وَ بٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَ عَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ○

ترجمہ

۱۱۱۔ بیشک وہ (ابراہیم) ہمارے باایمان بندوں میں سے ہے۔
۱۱۲۔ ہم نے اسے صالح پیغمبر اسحاق کی بشارت دی۔
۱۱۳۔ ہم نے اسے اور اسحاق کو برکت دی اور ان دونوں کی اولاد میں کچھ تو نیک ہیں اور کچھ کھلم کھلا اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔

تفسیر

ابراہیمؑ خدا کا مؤمن بندہ

زیر نظر تین آیات حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزندوں کے بارے میں جاری گفتگو کے اعتبار سے آخری آیات ہیں۔ ان میں درحقیقت جو کچھ گذر چکا ہے اس کی ایک دلیل بھی بیان کی گئی ہے اور ایک نتیجہ بھی۔ پہلے فرمایا گیا ہے: وہ (ابراہیم) ہمارے باایمان بندوں میں سے ہے (انہ من عبادنا المؤمنین)۔

دراصل یہ جملہ ایک دلیل ہے اس چیز کی جو گزر چکی ہے۔ اس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اگر ابراہیمؑ نے اپنی ساری ہستی اور وجود کو یہاں تک کہ اپنے عزیز فرزند کو بھی پورے اخلاص کے ساتھ اپنے معبود کی راہ میں قربان کر دیا، تو یہ اپنے عمیق اور طاقت ور ایمان کی وجہ سے کیا تھا۔

ہاں! یہ تمام چیزیں ایمان کے جلوے ہیں اور یہ ایمان کے کیا ہی عجیب وغریب جلوے ہوتے ہیں۔

یہ تعبیر لاکر قرآن ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے کے واقعے کو وسعت اور ہمہ گیری دے رہا ہے اور اسے ایک شخصی اور انفرادی واقعے سے ممتاز کر رہا ہے۔ گویا قرآن اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ جہاں کہیں ایمان ہے وہاں ایثار، عشق، فداکاری اور قربانی ہے۔ ابراہیمؑ اُسی چیز کو پسند کرتے تھے جسے خدا پسند کرتا تھا اور وہی چاہتے تھے جو خدا چاہتا تھا اور ہر

مؤمن ایسا ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے لیے خدا کی ایک اور نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی جس کے مقدر میں تھا کہ پیغمبر ہو اور صالحین میں سے ہو (و بشرناہ باسحاق نبیًا من الصالحین)۔

"فبشرناہ بغلام حلیم" کی آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو اس واقعے کے آغاز میں ذکر ہوئی ہے، بخوبی واضح و روشن ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں بشارتیں دو بیٹوں کے ساتھ مربوط ہیں۔ اگر آخری بشارت زیر بحث آیت کی صراحت کے مطابق "اسحاقؑ" سے مربوط ہے تو پھر "غلام حلیم" (بردبار و صابر) کی بشارت یقیناً "اسماعیلؑ" سے ربط رکھتی ہے اور جن لوگوں کا یہ اصرار ہے کہ اسحاقؑ ہی ذبیح ہیں انھوں نے دونوں آیات کا ایک ہی مطلب کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلی آیت کو خود بیٹے کی اصل بشارت سمجھا ہے اور دوسری آیت کو نبوت کی بشارت۔ لیکن یہ معنی بہت بعید ہے۔

زیر بحث آیات وضاحت کے ساتھ کہتی ہیں کہ یہ دونوں بشارتیں دو الگ الگ بیٹوں کے ساتھ مربوط ہیں۔

(غور کیجیے گا)

اس سے قطع نظر بشارتِ نبوت بتاتی ہے کہ اسحاقؑ زندہ رہیں گے اور فرائض نبوت انجام دیں گے، لیکن یہ بات ذبح کے مسئلے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں ہم ایک مرتبہ پھر صالحین کے مقام و مرتبہ کی عظمت ملاحظہ کر رہے ہیں۔ حضرت اسحاقؑ کی توصیف و تعریف میں فرمایا گیا ہے، کہ وہ پیغمبر ہوں گے اور صالحین میں سے ہوں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں صالحین کا مقام کتنا بلند و بالا ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں اس برکت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو خدا نے ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسحاقؑ کو عطا فرمائی، فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے اور اسحاق کو برکت سے نوازا (و بارکنا علیہ و علیٰ اسحاق)۔

لیکن کس چیز میں برکت دی گئی؟ اس کی وضاحت نہیں کی گئی اور ہم جانتے ہیں کہ عام طور پر جس وقت کوئی فعل مطلق آئے اور اس میں کوئی قید و شرط نہ ہو تو وہ ہمہ گیری کے معنی دیتا ہے اس بنا پر برکت سب چیزوں پر محیط ہو گی یعنی عمر اور زندگی میں آئندہ کی نسلوں میں، تاریخ و مکتب میں گویا ہر ایک چیز میں۔ اصولی طور پر "برکت" اصل میں "برک" (بروزنِ "ورک") اونٹ کے سینے کے معنی میں ہے۔ جس وقت اونٹ اپنا سینہ زمین پر رکھتا ہے تو یہی مادہ اس کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ "برک البعیر"

رفتہ رفتہ یہ مادہ کسی چیز کے ثبات و دوام کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ "برکہ آب" کو بھی اسی بنا پر "برکہ" کہتے ہیں کہ اس میں پانی ثابت و برقرار رہتا ہے اور مبارک کو بھی اس لحاظ سے مبارک کہتے ہیں کہ اس کی خیر و خوبی باقی اور برقرار رہتی ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر بحث آیت ابراہیمؑ و اسحٰقؑ (اور ان کے خاندان پر) نعمات الٰہی کے ثابت و برقرار رہنے اور

دوام کی طرف اشارہ ہے اور ایک برکت جو خدا نے ابراہیمؑ کو دی، یہ تھی کہ بنی اسرائیل کے تمام انبیاء حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں سے ہوئے، جبکہ اسلام کے عظیم پیغمبرؐ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ہیں۔

لیکن اس بنا پر کہ یہ توہم نہ ہو کہ یہ برکت ابراہیمؑ کے خاندان میں نسب اور قبیلے کے طور پر ہے بلکہ یہ تو مذہب و مکتب اور ایمان کے ساتھ رابطہ رکھنے کی بنا پر ہے۔ آیت کے آخر میں مزید ارشاد ہوتا ہے: ان دونوں کی اولاد میں سے نیک بھی تھے اور ایسے افراد بھی جنھوں نے عدم ایمان کی بنا پر اپنے اوپر ظلم کیا (و من ذریتھما محسن و ظالم لنفسہ مبین)۔

"و محسن" یہاں مومن اور فرمانِ خدا کے مطیع کے معنی میں ہے اور کون سا احسان اور نیکی اس سے برتر و افضل تصور ہو سکتی ہے؟ جبکہ "ظالم" کافر و گنہ گار کے معنی میں ہے اور "لنفسہ" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کفر و گناہ پہلے درجے میں خود اپنے اوپر ظلم ہے اور وہ بھی واضح و آشکار ظلم۔

اس طرح سے مذکورہ بالا آیت یہود و نصاریٰ کے ان لوگوں کو جو اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں جواب دیتی ہے کہ صرف رشتہ باعثِ افتخار نہیں ہے جبکہ اس کے ساتھ فکری و مکتبی رشتہ برقرار نہ ہو۔

اس بات پر شاہد پیغمبر اکرمؐ کی وہ حدیث ہے جو پیغمبر گرامیؐ اسلام سے نقل ہوئی ہے کہ آپ نے بنی ہاشم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

لا یأتینی الناس باعمالھم و تأتونی بانسابکم

اے بنی ہاشم! کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن باقی لوگ تو میرے پاس اپنے اعمال کے ساتھ آئیں اور تم اپنے نسب اور رشتہ داری کا تعلق جتاتے ہوئے آؤ۔[1]

---

[1] روح البیان، جلد ۷، ص ۴۷۹

۱۱۴۔ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۚ
۱۱۵۔ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۚ
۱۱۶۔ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۚ
۱۱۷۔ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ۚ
۱۱۸۔ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۚ
۱۱۹۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِى الْاٰخِرِيْنَ ۙ
۱۲۰۔ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ
۱۲۱۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ
۱۲۲۔ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ

ترجمہ

۱۱۴۔ ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا
۱۱۵۔ ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم کو عظیم کرب سے نجات بخشی۔
۱۱۶۔ اور ہم نے ان کی مدد کی یہاں تک کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آ گئے۔
۱۱۷۔ ہم نے انھیں آسمانی کتاب عطا کی۔
۱۱۸۔ ہم نے انھیں راہِ راست کی ہدایت کی۔
۱۱۹۔ اور ان کا ذکرِ خیر ہم نے بعد والی اقوام میں باقی رکھا۔
۱۲۰۔ موسیٰ اور ہارون پر سلام۔
۱۲۱۔ ہم اسی طرح سے نیکوکاروں کو جزا دیا کرتے ہیں۔
۱۲۲۔ وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

تفسیر

مُوسیٰ و ہارون پر خدائی نعمتیں

ان آیات میں "موسیٰ" اور ان کے بھائی "ہارون" کے بارے میں الطافِ الٰہی کے ایک گوشے کی طرف اشارہ ہوا ہے، اور جو کچھ گذشتہ آیات میں حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں بیان ہوا ہے اس سے ہم آہنگ بحثیں آئی ہیں۔ آیات کے مضامین بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور کئی لحاظ سے الفاظ بھی مشابہت رکھتے ہیں۔ تاکہ مومنین کے لیے ایک منظم تربیتی پروگرام پیش کیا جائے۔

ان آیات میں پھر بیانِ واقعات کے متعلق اجمال و تفصیل کی مخصوص قرآنی روش سے استفادہ کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "ہم نے موسیٰ پر اور ہارون پر احسان کیا اور انھیں اپنی نعمتوں کا مرہونِ منت بنایا (ولقد منّا علیٰ موسیٰ و ھارون)۔

"منت" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے، اصل میں "من" سے ہے جو اس پتھر کے معنی میں ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے، رفتہ رفتہ بڑی اور بھاری نعمتوں کے لیے بولا جانے لگا اگر وہ عملی پہلو رکھتی ہوں تو زیبا اور پسندیدہ ہیں اور اگر الفاظ اور باتیں ہی ہوں تو قبیح اور بدنما ہیں۔ اگرچہ "منت" روزمرہ کے استعمال میں زیادہ تر دوسرے معنی میں بولا جاتا ہے اور یہی امر زیرِ بحث آیات جیسی آیات کے مطالعے کے وقت نامطلوب امور کی طرف توجہ مبذول کرنے کا سبب بنتا ہے، لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ لفظ "منت" لغت اور قرآنی استعمال کے اعتبار سے ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو مذکورہ پہلے مفہوم (بڑی بڑی نعمتیں بخشنے) کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

بہرحال خدا اس آیت میں سربستہ اور اجمالی طور پر ان بڑی اور گراں قدر نعمتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ان دونوں بھائیوں کو عطا کی گئیں اور بعد والی آیات میں ان نعمتوں کے سات مواقع بیان کرتا ہے۔ ان نعمتوں میں سے ہر ایک دوسری سے زیادہ گراں قدر ہے۔

پہلے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ان دونوں بھائیوں اور ان کی قوم کو عظیم کرب سے نجات بخشی (ونجیناھما و قومھما من الکرب العظیم)۔

اس سے بڑا کرب اور کیا ہوگا کہ بنی اسرائیل جابر اور خونخوار فرعونیوں کے چنگل میں گرفتار تھے جو ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے۔ ان کی عورتوں کو خدمت گاری اور مردوں کو غلامی اور بیگار کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔

ہاں! حُرّیت و آزادی کھو بیٹھنا اور ایسے بے رحم بادشاہ کے چنگل میں گرفتار ہونا کہ جو نہ چھوٹوں پر رحم کرتا تھا اور نہ بڑوں پر، یہاں تک کہ وہ قوم و ملت کی آبرو اور نسل کو پامال کرتا تھا جو ایک بہت ہی بڑا دکھ اور عظیم کرب تھا اور یہ پہلا احسان تھا جو

خدا نے بنی اسرائیل پر کیا۔

دوسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ان (موسیٰ، ہارون اور بنی اسرائیل) کی مدد کی یہاں تک کہ وہ اپنے طاقتور دشمن پر غالب آ گئے" (ونصرناھم فکانوا ھم الغالبین)۔

جس دن فرعونی خونخوار لشکر عظیم طاقت کے ساتھ حرکت میں آیا، جس کے آگے آگے خود فرعون تھا، بنی اسرائیل ایک ضعیف اور ناتوان قوم تھی۔ ان کے پاس نہ جنگجو سپاہی تھے اور نہ ہی ہتھیار۔ لیکن خدا نے اپنے لطف و کرم سے ان کی مدد کی۔ فرعونیوں کو پانی کی لہروں میں غرق کر دیا اور ان (بنی اسرائیل) کو ڈوبنے سے بچا لیا اور فرعونیوں کے محلات، مال و دولت، باغات اور تمام خزانے ان کے سپرد کر دیئے۔

تیسرے مرحلے میں اس نعمت کی طرف جو خدا نے قیدِ غلامی سے رہائی پانے والی اس قوم کو عنایت فرمائی، اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے ان دونوں کو آشکار و واضح کتاب دی (و اٰتیناھما الکتاب المستبین)۔

ہاں! تورات کتاب "مستبین" یعنی واضح و روشن کرنے والی کتاب تھی اور اس زمانے میں بنی اسرائیل کی تمام دینی و دنیاوی ضروریات کی کفیل تھی۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۴۴ میں بھی بیان ہوا ہے۔

انّا انزلنا التوراۃ فیھا ھدًی و نور

ہم نے تورات کو نازل کیا جس میں ہدایت بھی ہے اور نور و روشنی بھی۔

چوتھے مرحلے میں پھر ایک اور روحانی نعمت۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ان دونوں کو راہِ راست کی ہدایت کی (و ھدیناھما الصراط المستقیم)۔

وہی راہِ راست جو ہر قسم کی کجی سے خالی، انبیاء و اولیاء کی راہ ہے اور اس میں انحراف، گمراہی اور تباہی کا خطرہ موجود نہیں ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سورۂ حمد میں، جسے ہم تمام نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ ہم خدا سے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کی درخواست کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے نعمتیں نازل کی ہیں نہ کہ مغضوبین اور گمراہوں کی راہ۔ تو یہ دراصل انبیاء و اولیاء ہی کی راہ ہے۔

پانچویں مرحلے میں مکتب کی ہمیشگی اور نیک نامی کی بقاء کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے ان دونوں کا ذکرِ خیر بعد والی اقوام میں باقی اور برقرار رکھا (تاکہ وہ دو مومنوں کے عنوان سے پہچانے جائیں اور پورے جہاں کے لوگ ان کی روش اور تاریخ سے ہدایت اور راہنمائی حاصل کریں (و ترکنا علیھما فی الاٰخرین)۔

یہی تعبیر گذشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ کے بارے میں آئی تھی، اصولی طور پر سب ہی مردانِ خدا اور راہِ حق کے عظیم راہیوں کی تاریخ اور نام ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ یہ لوگ کسی خاص قوم و ملت کے ساتھ

متعلق نہیں، بلکہ تمام عالم انسانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

چھٹے مرحلے میں موسیٰؑ اور ہارونؑ پر خدا کے سلام کا ذکر ہے، فرمایا گیا ہے: موسیٰ اور ہارون پر سلام ہو (سلام علی موسٰی و ھارون)۔

ایسا سلام جو بزرگ و مہربان خدا کی طرف سے ہے۔

ایسا سلام، جو دین، ایمان، اعتقاد، مکتب اور مذہب میں سلامتی کی طرف اشارہ ہے۔

ایسا سلام، جو اس جہان اور اس جہان کی سزاؤں اور عذاب سے نجات بیان کرنے والا ہے۔

ساتویں اور آخری مرحلے میں ان کے لیے اپنی عظیم جزا کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ہم نیکوکاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں (انّا کذالك نجزی المحسنین)۔

اگر انھوں نے یہ افتخارات اور اعزازات حاصل کیے ہیں تو یہ بلا وجہ نہیں تھے، وہ محسن تھے وہ مومن، مخلص، فداکار اور نیکوکار تھے اور اس قسم کے لوگوں کو ایسا ہی صلہ اور بدلہ ملنا چاہیے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعینہٖ یہی عبارت "انّا کذالك نجزی المحسنین" اسی سورہ میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور حضرت الیاسؑ کے بارے میں آئی ہے۔

نیز اسی سے ملتی جلتی ایک تعبیر سورۂ یوسف کی آیہ ۲۲ میں حضرت یوسفؑ کے بارے میں اور سورۂ انعام کی آیہ ۸۴ میں بعض انبیاء کے بارے میں بھی نظر آتی ہے، یہ سب تعبیریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ الطافِ الٰہی سے بہرہ مند ہونے کے لیے پہلے محسنین کے زمرے میں قرار پانا چاہیے، جس کے بعد برکات الٰہی کا ہونا قطعی ہے (غور کیجیے گا)

انجام کار آخری زیر بحث آیت میں اسی دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس سے پہلے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ کی داستان میں آچکی ہے، ارشاد ہوتا ہے: وہ دونوں (موسیٰ و ہارون) ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھے (انھما من عبادنا المؤمنین)۔

یہ ایمان ہی ہے جو انسان کی روح کو اس طرح سے روشن اور قوی کر دیتا ہے کہ وہ احسان، نیکی، پاکیزگی اور تقویٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ایسا احسان جو رحمتِ الٰہی کے دروازے انسان کے سامنے کھول دیتا ہے اور پھر اس کی انواع و اقسام کی نعمتیں انسان پر نازل ہوتی ہیں۔

۱۲۳۔ وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

۱۲۴۔ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

۱۲۵۔ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ۝

۱۲۶۔ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

۱۲۷۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝

۱۲۸۔ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝

۱۲۹۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ۝

۱۳۰۔ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ۝

۱۳۱۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

۱۳۲۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۲۳۔ اور بے شک الیاس ہمارے رسولوں میں سے تھا۔

۱۲۴۔ اس وقت کو یاد کرو، جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟

۱۲۵۔ کیا تم بعل بت کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑے ہوئے ہو؟

۱۲۶۔ وہ خدا جو تمھارا بھی پروردگار ہے اور تمھارے گزشتہ آباؤ اجداد کا بھی پروردگار ہے۔

۱۲۷۔ لیکن انھوں نے اسے جھٹلایا، مگر یقینی طور پر وہ سب کے سب خدائی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔

۱۲۸۔ سوائے خدا کے مخلص بندوں کے۔

۱۲۹۔ ہم نے اس (الیاس) کا نیک نام بعد کی امتوں میں باقی و برقرار رکھا۔

۱۲۰۔ الیاسین پر سلام ہو۔
۱۲۱۔ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔
۱۲۲۔ وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے ہے۔

تفسیر

پیغمبر خدا الیاسؑ مشرکین کے مقابلے میں

زیر نظر آیات میں گزشتہ انبیاء میں سے ایک اور نبی کی سرگزشت بیان کی جارہی ہے یہ اس سورہ میں آنے والی چوتھی سرگزشت ہے۔ یہ حضرت الیاس کی ایک مختصر سی سرگزشت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: الیاس خدا کے رسولوں میں سے تھا (وان الیاس لمن المرسلین)۔

حضرت الیاسؑ ان کے نسب اور ان کی زندگی کی خصوصیات کے بارے میں انشاء اللہ کچھ گفتگو ان آیات کے آخر میں نکات کے ضمن میں آئے گی۔

اس کے بعد اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب اس نے اپنی قوم کو خبردار کیا اور کہا: "کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے (اذ قال لقومه الا تتقون)۔

تقوائے الٰہی۔ شرک و بت پرستی سے پرہیز، ظلم و گناہ سے پرہیز اور انسانیت کے لیے تباہ کن سب باتوں سے پرہیز۔

بعد والی آیت میں اس مسئلہ کے بارے میں، اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بات کی گئی ہے: کیا تم بعل بت کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑ رہے ہو (اتدعون بعلاً و تذرون احسن الخالقین)۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا ایک معروف بت تھا، جس کا نام "بعل" تھا اور وہ اس کے سامنے سجدہ کیا کرتے تھے۔

حضرت الیاسؑ نے انھیں اس قبیح عمل سے روکا اور عظیم آفریدگارِ عالم اور توحید خالص کی طرف دعوت دی۔

اسی وجہ سے ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ حضرت الیاسؑ کی فعالیت کا مرکز شامات کے شہروں میں سے شہر "بعلبک" تھا۔[1]

کیونکہ "بعل" اس مخصوص بت کا نام تھا اور "بک" کا معنی ہے شہر۔ ان دونوں کی آپس میں ترکیب سے "بعلبک" ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ سونے کا اتنا بڑا بت تھا کہ اس کا طول بیس ہاتھ تھا۔ اس کے چار چہرے تھے اور اس بت کے چار سو

---

[1] بعلبک موجودہ زمانے میں لبنان کا حصہ ہے اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔

زیادہ خادم تھے[1]

البتہ بعض کسی معین بُت کو "بعل" نہیں سمجھتے بلکہ بت کے مطلق معنی میں لیتے ہیں مگر بعض دوسرے اسے "رب اور معبود" کے معنی میں سمجھتے ہیں۔

راغب۔ مفردات میں کہتا ہے "بعل" اصل میں شوہر کے معنی میں ہے لیکن عرب اپنے ان معبودوں کو جن کے ذریعے وہ خدا کا تقرب چاہتے تھے "بعل" کا نام دیتے تھے۔

احسن الخالقین بہترین خالق کی تعبیر۔ حالانکہ عالم میں خالق حقیقی خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ظاہراً ان مصنوعات کیطرف اشارہ ہے جنھیں انسان مواد طبیعی سے شکل بدل کر بناتا ہے اور اس لحاظ سے اس پر خالق کا اطلاق ہوتا ہے، اگرچہ انسان مجازی خالق ہے۔

بہرحال الیاسؑ نے اس بُت پرست قوم کی سخت مذمت کی اور مزید کہا: اس خدا کو چھوڑ رہے ہو جو تمھارا اور تمھارے گزشتہ آباؤ اجداد کا پروردگار ہے (اللہ ربکم و رب اٰباٰئکم الاوّلین)۔

تم سب کا مالک و مربّی وہی تھا اور ہے۔ جو نعمت بھی تمھارے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے اور ہر مشکل کا حل اسی کے دستِ قدرت سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نہ تو خیر و برکت کا کوئی اور سرچشمہ موجود ہے اور نہ ہی شر و آفت کا کوئی اور دفع کرنے والا ہے۔

گویا حضرت الیاسؑ کے زمانے کے بُت پرست بھی پیغمبر اسلامؐ کے زمانے کے بُت پرستوں کی طرح اپنے کام کی توجیہ کے لیے اپنے آباؤ اجداد اور بڑوں کے طریقے ہی کا سہارا لیتے تھے کیونکہ حضرت الیاسؑ ان کے جواب میں کہتے ہیں: اللہ ہی تمھارا اور تمھارے آباؤ اجداد کا رب ہے۔

"رب" (مالک و مربّی) کی تعبیر غور و فکر کے لیے بہترین محرک ہے کیونکہ انسانی زندگی میں اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ وہ یہ جانے کہ اسے کس نے پیدا کیا ہے، اور آج اس کا مربی، ولی نعمت اور صاحبِ اختیار کون ہے؟

لیکن اس سرپھری اور خود پسند قوم نے خدا کے اس عظیم پیغمبر کے استدلالی پند و نصائح اور واضح ہدایات پر کان نہ دھرے اور "اس کی تکذیب کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے" (فکذّبوہ)۔

خدا نے بھی ان کی سزا کو ایک مختصر سے جملے میں بیان کرتے ہوئے کہہ دیا: وہ بارگاہِ عدلِ الٰہی اور اس کی دوزخ کے عذاب میں حاضر کیے جائیں گے (فانھم لمحضرون)۔

اور اپنے قبیح اور بداعمال کی سزا کا مزہ چکھیں گے۔

---

[1] روح المعانی۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں

لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹا سا نیک، پاک اور مخلص گروہ حضرت الیاسؑ پر ایمان لے آیا تھا لہذا ان کا حق فراموش نہ کرتے ہوئے بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: مگر خدا کے مخلص بندے (الا عباد اللہ المخلصین)۔[1]

اس داستان کی آخری آیات میں وہی چار مسائل جو دوسرے انبیاء (موسیٰؑ و ہارونؑ اور ابراہیمؑ و نوحؑ) کے واقعات میں آئے تھے، ان کی اہمیت کے پیشِ نظر پھر دہرائے گئے ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے الیاس کا نیک نام بعد والی امتوں میں جاوداں کر دیا (و ترکنا علیہ فی الاٰخرین)۔

دوسری امتیں ان بزرگ انبیاء کی انتہائی زحمتوں کو جو انھوں نے راہِ توحید کی پاسداری اور تخمِ ایمان کی آبیاری کے لیے اٹھائی ہیں، کبھی فراموش نہیں کریں گی اور جب تک دنیا قائم ہے ان مردانِ بزرگ اور فداکاروں کا مکتب اور یاد زندہ و جاوید رہے گی۔

دوسرے مرحلے میں قرآن مزید کہتا ہے: الیاسین پر سلام و درود ہو (سلام علیٰ الیاسین)۔

"الیاس" کی بجائے "الیاسین" کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ "الیاسین" لفظِ "الیاس" کی ایک لغت ہے اور دونوں ایک ہی معنی میں ہیں اور یا الیاسؑ اور ان کے پیروکاروں کی طرف اشارہ ہے اور جمع کی شکل میں آیا ہے۔[2]

تیسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نیکوکاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں (انا کذلک نجزی المحسنین)۔

نیکی اور احسان سے اس لفظ کا وسیع معنی مراد ہے، جس میں دین اور اس کے تمام احکام پر عمل کرنا شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شرک، انحراف، گناہ اور فساد سے مقابلہ کرنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

چوتھے مرحلے میں ان تمام باتوں کی اصل بنیاد یعنی ایمان کا ذکر ہے: یقیناً وہ (الیاس) ہمارے مؤمن بندوں میں سے ہے (انہ من عبادنا المؤمنین)۔

"ایمان" و "عبودیت" "احسان" کا سرچشمہ ہے اور احسان مخلصین کی صف میں شامل ہونے اور خدا کے سلام کا حقدار ہونے کا سبب ہے۔

---

[1] جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے مطابق یہ استثناء "استثناء متصل" ہے "کذبوہ" کی واؤ سے یعنی تمام قوم نے تو تکذیب کی اور وہ سب عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے سوائے خدا کے مخلص بندوں کے۔

[2] پہلے الیاس منسوب ہوا اور "الیاسی" ہوا پھر جمع کی شکل میں آکر "الیاسیین" ہو گیا اور اس کے بعد مخفف ہو کر "الیاسین" ہو گیا ہے (غور کیجیے گا)۔

چند اہم نکات

۱۔ الیاسؑ کون ہیں؟ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حضرت الیاسؑ خدا کے عظیم انبیاء میں سے ایک ہیں اور زیر بحث آیات نے یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ "انّ الیاس لمن المرسلین"

اس پیغمبر کا نام قرآن مجید کی دو آیات میں آیا ہے ایک تو اسی سورۂ صافات میں اور دوسرا سورۂ انعام میں چند انبیاء کے ساتھ، جہاں فرمایا گیا ہے:۔

وزکریا و یحییٰ وعیسٰی والیاس کل من الصّالحین (انعام: ۸۵)

لیکن اس بارے میں کہ قرآن میں جن انبیاء کا نام آیا ہے انھی میں سے ایک پیغمبر کا نام الیاس ہے یا یہ کسی پیغمبر کا مستقل نام ہے نیز اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس ضمن میں مفسرین میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے:۔

الف:۔ بعض کہتے ہیں کہ "الیاس"، "ادریس" کا دوسرا نام ہے کیونکہ ادریس کا ادراس بھی تلفظ ہوا ہے اور وہ مختصر سی تبدیلی کے ساتھ الیاس ہوگیا۔

ب:۔ بعض کا کہنا ہے کہ الیاس بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے ہیں۔ "یاسین" کے فرزند ہیں اور موسیٰ کے بھائی ہارون کے نواسوں میں سے ہیں۔

ج:۔ کچھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ الیاس خضر کا دوسرا نام ہے جبکہ بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ الیاس خضر کے دوستوں میں سے ہیں اور دونوں زندہ ہیں اس فرق کے ساتھ کہ الیاس تو خشکی پر مامور ہیں لیکن خضر جزیروں اور دریاؤں پر مامور ہیں، بعض دوسرے الیاس کی ماموریت بیابانوں میں اور خضر کی ماموریت پہاڑوں پر خیال کرتے ہیں اور دونوں کے لیے عمر جاودانی کے قائل ہیں۔ بعض الیاس کو "الیسع" کا فرزند سمجھتے ہیں۔

د:۔ بعض کہتے ہیں کہ الیاس بنی اسرائیل کے وہی "ایلیا" پیغمبر ہیں جو "آجاب" بادشاہ بنی اسرائیل کے ہمعصر تھے جنھیں خدا نے اس ظالم بادشاہ کو ڈرانے اور ہدایت کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

بعض نے انھیں "یحییٰ" بھی جانا ہے جو مسیح کے تمہید دہندہ تھے۔

لیکن قرآن کی آیات کے ظاہر کے ساتھ جو بات ہم آہنگ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ مستقلاً ایک پیغمبر کا نام ہے اور قرآن میں جن دیگر پیغمبروں کے نام آئے ہیں یہ ان کے علاوہ ہیں جو ایک بت پرست قوم کی ہدایت کے لیے مامور ہوئے تھے اور اس قوم کی اکثریت ان کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن مخلص مؤمنین کے ایک گروہ نے ان کی پیروی کی۔

اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں اور بعض اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ اس قوم کے بڑے بت کا نام "بعل" تھا یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ پیغمبر سرزمین شامات میں مبعوث ہوئے تھے اور ان کی فعالیت کا مرکز شہر "بعلبک" تھا جو اس وقت لبنان کا حصہ ہے اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔

بہر حال اس پیغمبر کے بارے میں مختلف داستانیں کتابوں میں بیان کی گئی ہیں اور چونکہ وہ قابلِ اعتماد و اطمینان نہیں لہٰذا

ہم نے انھیں نقل نہیں کیا[1]

۲۔ "الیاسین" کون ہیں؟ مفسرین اور مؤرخین کے "الیاسین" کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔

الف:۔ بعض اسے الیاس کی ایک لغت سمجھتے ہیں یعنی جس طرح "میکان" و "میکائیل" ایک مخصوص فرشتے کے لیے دو لفظ ہیں، اور "سینا" اور "سینین" دونوں ایک معروف سرزمین کے نام ہیں۔ اسی طرح "الیاس" اور "الیاسین" بھی اس عظیم پیغمبر کے نام ہیں[2]

ب:۔ بعض دوسرے اسے جمع سمجھتے ہیں۔ اس طرح سے کہ "الیاس" کے ساتھ یاء نسبتی کا اضافہ ہوا تو "الیاسی" ہوگیا اور اس کے بعد یاء اور نون کے ساتھ اس کی جمع بنائی گئی اور "الیاسیین" ہوگیا اور تخفیف کے بعد "الیاسین" رہ گیا۔ اس بنا پر اس کا مفہوم وہ تمام اشخاص ہیں جو الیاس کے ساتھ مربوط تھے اور ان کے مکتب کے پیروکار بن گئے تھے[3]

ج:۔ بعض کا خیال ہے کہ "آلیاسین" الف ممدودہ کے ساتھ ہے جو لفظ "آل" اور "یاسین" کا مرکب ہے۔ ایک روایت کے مطابق "یاسین" حضرت الیاس کے باپ کا نام ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق پیغمبر گرامی اسلامؐ کا نام ہے۔ اس بنا پر "آل یاسین" پیغمبر گرامی اسلامؐ کی آل و اولاد کے معنی میں ہے یا الیاس کے باپ یاسین کا خاندان مراد ہے۔

واضح قرائن خود قرآن میں موجود ہیں جو اسی پہلے معنی کی تائید کرتے ہیں۔ یعنی "الیاسین" سے مراد الیاس ہی ہیں کیونکہ "سلام علی الیاسین" کی آیت سے ایک آیت کے فاصلہ کے بعد فرمایا گیا ہے:۔

انہ من عبادنا المؤمنین

وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔

ضمیر مفرد کا "الیاسین" کی طرف لوٹنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک شخص سے زیادہ نہیں یعنی وہی جناب الیاسؑ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ چار آیات جو حضرت الیاسؑ کی داستان کے آخر میں ہیں بعینہٖ وہی آیات ہیں جو نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کی داستان کے آخر میں آئی ہیں اور جب ہم ان آیات کو ایک دوسرے کے پہلو میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جو سلام خدا کی طرف سے ان آیات میں آیا ہے وہ اسی پیغمبر کے لیے ہے جس کا بیان ابتداءِ گفتگو میں ہے (سلام علی نوح فی العالمین۔ سلام علی ابراھیم۔ سلام علی موسیٰ وھارون) اس بنا پر یہاں بھی سلام علی الیاسین: الیاس پر سلام ہوگا۔ (غور کیجیے گا)

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر المیزان، روح المعانی، تفسیر فخر رازی، ظلال، اعلام القرآن اور دائرۃ المعارف دھخدا

[2] "البیان" فی غریب اعراب القرآن جلد ۲ ص ۲۰۸

[3] ایضاً

وہ نکتہ جس پر یہاں خاص طور پر توجہ کی ضرورت ہے یہ ہے کہ بہت سی تفاسیر میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ جس کی سند ابن عباس کی طرف لوٹتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "آل یاسین" سے مراد آلِ محمدؐ ہیں۔ کیونکہ "یاسین" پیغمبر اسلامؐ کے اسماء میں سے ایک ہے۔

معانی الاخبار میں صدوق نے ایک باب جو "آل یاسین" کی تفسیر کے لیے ذکر کیا ہے، اس میں پانچ احادیث اس ضمن میں نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث کے سوا کوئی بھی ائمہ اہلِ بیت تک نہیں پہنچتی اور اس حدیث کا راوی ایک شخص "کادح" یا "قادح" نامی ہے[1] جس کے بارے میں کتب رجال میں کوئی خبر نہیں ہے۔

چونکہ یہ اخبار اس مفروضہ کی بنا پر ہیں کہ ہم اوپر والی آیت کی قرائت کو سلام علی آل یاسین کی صورت میں پڑھیں اور آیات کی ہم آہنگی کو نظر انداز کر دیں اور ان روایات کی اسناد بھی جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے قابلِ بحث ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان روایات کے بارے میں فیصلہ کرنے سے باز رہیں اور ان کا علم ان کے اہل کے سپرد کر دیں۔

---

[1] معانی الاخبار ص ۱۲۲ (جامعۃ المدرسین قم کی شائع کردہ)

۱۳۳۔ وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ؕ
۱۳۴۔ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ۙ
۱۳۵۔ اِلَّا عَجُوْزًا فِى الْغٰبِرِيْنَ ۝
۱۳۶۔ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝
۱۳۷۔ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۙ
۱۳۸۔ وَبِالَّيْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۳۳۔ لُوط ہمارے رسولوں میں سے تھا۔
۱۳۴۔ وہ وقت یاد کرو جب ہم نے اسے اور اس کے سارے خاندان کو نجات دی۔
۱۳۵۔ سوائے ایک بڑھیا کے جو اس قوم کے درمیان باقی رہ گئی (اور ان کے سے انجام میں گرفتار ہوئی)
۱۳۶۔ پھر باقی لوگوں کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔
۱۳۷۔ اور تم ہمیشہ (ان کے شہروں کے ویرانوں کے قریب سے) صبح کے وقت بھی عبور کرتے ہو...
۱۳۸۔ اور رات کے وقت بھی، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

تفسیر

اس قوم کی تباہ سرزمین تمہارے سامنے ہے

پانچویں پیغمبر جن کا اس سورہ میں اور آیات کے اس سلسلے میں نام آیا ہے اور ان کی تاریخ کا ایک مختصر حصہ، تربیتی اور اصلاحی درس کے طور پر بیان ہوا ہے وہ حضرت لوطؑ ہیں۔ قرآن کی صراحت کے مطابق وہ حضرت ابراہیمؑ کے ہمعصر تھے وہ خدا کے عظیم پیغمبروں میں سے ہیں (عنکبوت ۲۶، ہود ۷۴)

حضرت لوطؑ کا نام قرآن میں بہت سی آیات میں آیا ہے اور بارہا ان کے اور ان کی قوم کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

خاص طور پر اس منحرف قوم کا انجام، ایک واضح اور روشن صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ (شعراء ۱۶۷ تا ۱۷۳، اور ہود ۷۰ تا ۸۳، نمل ۵۴ تا ۵۸، اور دوسرے مقامات)

ارشاد ہوتا ہے: لوط ہمارے رسولوں میں سے تھا (و انّ لوطًا لمن المرسلین)۔

اس اجمال کو بیان کرنے کے بعد قرآن اجمال و تفصیل کی اپنی روش کے مطابق، اس ماجرے کے ایک حصّے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب ہم نے لوط اور اس کے سارے خاندان کو نجات دی۔ (اذ نجّیناہ و اھلہ اجمعین)۔

سوائے اس کی بڑھیا بیوی کے جو اس قوم کے درمیان باقی رہ گئی (الّا عجوزًا فی الغابرین)[1]۔

پھر باقی لوگوں کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا (ثم دمّرنا الآخرین)۔

یہ مختصر جملے اس قوم کی عجیب تاریخ کی طرف اشارے ہیں۔ اس کی تفصیل سورۂ ہود، شعراء اور عنکبوت میں گزر چکی ہے۔

حضرت لوطؑ نے تمام انبیاء کی طرح سب سے پہلے اپنی دعوت توحید سے شروع کی۔ اس کے بعد ماحول کے مفاسد اور خرابیوں کے خلاف شدید جنگ میں مصروف ہو گئے، خصوصًا وہ لوگ معروف اخلاقی انحراف یعنی ہم جنس بازی کا شکار تھے جس کی رسوائی تمام تواریخ میں منعکس ہے۔

اس عظیم پیغمبرؑ نے بہت سی سختیاں جھیلیں، خون جگر پیا اور ان سے جتنا ہو سکا اس قبیح سیرت اور قبیح صورت منحرف قوم کی اصلاح اور انھیں شرمناک اعمال سے روکنے کی کوشش کی، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور اگر کچھ تھوڑے سے افراد ان پر ایمان لائے بھی تو بہت جلد وہ اس گندے ماحول سے نجات پا گئے۔

آخر کار حضرت لوطؑ ان سے ناامید ہو گئے اور دعا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھوں نے خدا سے اپنی اور اپنے خاندان کی نجات کے لیے درخواست کی۔ خدا نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور اس چھوٹے سے گروہ کو نجات بخشی، سوائے ان کی بیوی کے، وہی بڑھیا جو نہ صرف آپ کی تعلیمات کی پیروی نہیں کرتی تھی بلکہ بعض اوقات آپ کے دشمنوں کی مدد بھی کیا کرتی تھی۔

خدا نے بھی اس قوم پر نہایت سخت عذاب نازل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ سب سے پہلے ان کے شہروں کو تہ و بالا کیا۔ پھر مسلسل اور پے در پے پتھروں کی بارش ان پر برسائی۔ یہاں تک کہ سب کے سب نابود ہو گئے اور ان کے جسموں کا بھی نام و نشان

---

[1] "غابر" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں "غبور" کے مادہ سے ("عبور" کے وزن پر) کسی چیز کے باقی ماندہ حصّہ کے معنی میں ہے اور جس وقت کوئی جمعیت کسی جگہ سے حرکت کرے اور کوئی اس جگہ سے رہ جائے تو اس کو "غابر" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر باقی ماندہ خاک کو "غبار" کہتے ہیں اور پستان میں باقی رہ جانے والے دودھ کو "غبرۃ" (بروزن "لقمۃ") کہتے ہیں۔

باقی نہ رہا۔

چونکہ یہ سب ذکر غافل اور مغرور لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید کے طور پر ہے لہذا اس گفتگو کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: تم ہمیشہ صبح کے وقت ان کے شہروں کے ویرانوں کے قریب سے گزرتے ہو (و انکم لتمرون علیھم مصبحین)۔

اور رات کو بھی وہاں سے گزرتے ہو، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ (و باللیل افلا تعقلون)۔

یہ تعبیر اس وجہ سے بیان ہوئی ہے کیونکہ قوم لوط کے شہر حجاز کے لوگوں کے قافلوں کو شام کی طرف راستے میں پڑتے تھے اور وہ اپنے دنوں اور راتوں کے سفر میں ان کے قریب سے گزرتے تھے۔ اگر وہ دل و جان کے کان رکھتے تو اس گنہ گار تباہ شدہ قوم کی دلخراش اور جانکاہ آواز سنتے، کیونکہ ان کے شہروں کے ویرانے اپنی زبانِ بے زبانی سے تمام گزرنے والوں کو درسِ عبرت دیتے ہیں اور ان جیسے حوادث کے چنگل میں گرفتار ہونے سے ڈراتے ہیں۔

ہاں:۔

ما اکثر العبر و اقل الاعتبار[1]

عبرت کے درس تو بہت ہیں لیکن عبرت حاصل کرنے والے تھوڑے ہیں۔

اسی معنی و مفہوم کی نظیر سورۂ حجر کی آیہ ۷۶، میں قوم لوط کی داستان کے بیان کے بعد آئی ہے:۔

و انّھا لبسبیل مقیم

یہ آثار پاس سے گزرنے والوں کے راستہ میں پڑتے ہیں۔

ایک روایت میں امام صادقؑ سے اس جملے کی ایک اور طرح سے تفسیر کی گئی ہے، ایک صحابی نے "و انکم لتمرون علیھم مصبحین وباللیل افلا تعقلون" کی آیات کی تفسیر کے بارے میں آپؑ سے سوال کیا تو فرمایا:۔

تمرون علیھم فی القرآن اذا قرأتم فی القرآن فاقرءوا ما قص اللہ علیکم من خبرھم

تم قرآن میں جب قرآن کی آیات کی تلاوت کرتے ہو تو ان کے پاس سے گزرتے ہو؛ قرآن ان اخبار کو جو خدا نے بیان کی ہیں تمھارے لیے واضح کرتا ہے[2]

ممکن ہے یہ تفسیر آیت کے دوسرے معنی اور اس کے بطون کی طرف اشارہ ہو، بہرحال دونوں تفسیروں کے جمع ہونے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، کیونکہ قوم لوط کے آثار بھی خارج میں ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھے اور قرآن مجید میں ان کے اخبار بھی سامنے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار، کلمہ ۲۹۷

[2] یہ روایت روضہ کافی سے نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۲۴ پر نقل کی گئی ہے۔

۱۳۹۔ وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ؕ
۱۴۰۔ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ
۱۴۱۔ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ ۚ
۱۴۲۔ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ
۱۴۳۔ فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ۙ
۱۴۴۔ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ النصف
۱۴۵۔ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ ۚ
۱۴۶۔ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ ۚ
۱۴۷۔ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ۚ
۱۴۸۔ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ ؕ

ترجمہ

۱۳۹۔ اور یونس ہمارے رسولوں میں سے تھا۔
۱۴۰۔ وہ وقت یاد کرو جب وہ (لوگوں اور وزن سے) لدی کشتی کی طرف نکل گیا۔
۱۴۱۔ اور ان کے ساتھ قرعہ ڈالا اور (قرعہ انھیں کے نام کا نکلا اور وہ) مغلوب ہو گیا۔
۱۴۲۔ (انھوں نے اسے دریا میں پھینک دیا) اور ایک بہت بڑی مچھلی نے اسے نگل لیا، اس حال میں کہ وہ ملامت کا مستحق تھا۔
۱۴۳۔ اور اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا.....
۱۴۴۔ تو قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا۔
۱۴۵۔ (بہرحال ہم نے اسے رہائی بخشی اور) اسے ایک خشک زمین میں جو گھاس اور سبزے سے خالی تھی پھینک دیا

اس حالت میں کہ وہ بیمار تھا۔

۱۴۶۔ اور ہم نے کدو کی بیل اس کے اوپر اگادی (تاکہ وہ اس کے چوڑے اور مرطوب پتوں کے سایے میں آرام پائے)۔

۱۴۷۔ اور ہم نے اسے ایک لاکھ افراد یا اس سے زیادہ جمعیّت کی طرف بھیجا۔

۱۴۸۔ تو وہ ایمان لے آئے اور ہم نے انھیں ایک مدّت معلوم تک زندگی کی نعمات سے بہرہ مند کیا۔

تفسیر

یونس امتحان کی بھٹی میں

اس سورہ میں یہ گذشتہ انبیاء اور اقوام کی چھٹی اور آخری سرگزشت ہے۔ ان آیات میں یونسؑ اور ان کی توبہ کرنے والی قوم کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ پانچ سرگزشتیں جن نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ و ہارونؑ، الیاسؑ اور لوطؑ کا ذکر تھا وہ سب کی سب یہاں آکر ختم ہوئیں کہ وہ قومیں ہرگز بیدار نہ ہوئیں اور عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوگئیں اور خدا نے ان میں سے ان عظیم انبیاء کو نجات بخشی۔

لیکن اس داستان میں معاملے کا اختتام ان کے برعکس ہے۔ یونسؑ کی کافر قوم عذابِ الٰہی کی ایک نشانی کو دیکھتے ہی بیدار ہوگئی اور اس نے توبہ کرلی اور خدا نے اس پر اپنا لطف و کرم فرمایا۔ اور اسے مادی و روحانی برکات سے بہرہ مند کیا۔ یہاں تک کہ یونسؑ کو اس ترکِ اولیٰ کی بنا پر جو اس قوم کے درمیان سے ہجرت کرنے میں جلدی کرنے کی وجہ سے ان سے سرزد ہوا تھا، مصائب و مشکلات میں پھنسا دیا، یہاں تک کہ ان کے بارے میں لفظ "ابق" استعمال کیا کہ جو عام طور پر بھاگ جانے والے غلاموں کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ داستانیں اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ اے مشرکینِ عرب اور اے دیگر انسانو! کیا تم ان پانچ قوموں کی طرح بننا چاہتے ہو یا قومِ یونسؑ کی طرح؟ کیا تم اس بُری اور دردناک عاقبت اور انجام کے طالب ہو یا اس خیر و سعادت کے؟ یہ بات خود تمھارے اپنے ارادے کے ساتھ وابستہ ہے۔

بہرحال قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں (منجملہ سورۂ انبیاء، یونس، قلم اور زیرِ بحث سورۂ صافات میں) اس عظیم پیغمبر کی داستان بیان ہوئی ہے اور ہر ایک میں ان کے حالات کا ایک حصّہ ذکر ہوا ہے۔ سورۂ صافات میں زیادہ تر یونسؑ کے فرار، ان کی گرفتاری اور پھر نجات کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔

پہلے گزشتہ داستانوں کی طرح ان کے مقامِ رسالت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے: یونس خدا کے رسولوں میں سے تھا (و انّ یونس لمن المرسلین)۔

یونسؑ نے بھی دیگر انبیاء کی طرح اپنی دعوت کی ابتداء توحید اور بت پرستی کے خلاف قیام سے شروع کی۔ اس کے بعد ان برائیوں کے خلاف نبرد آزمائی کی جو اس ماحول میں رائج تھے۔

لیکن وہ متعصب قوم، جو آنکھیں اور کان بند کرکے، اپنے بڑے بوڑھوں کی تقلید کر رہی تھی، ان کی دعوت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

حضرت یونسؑ اسی طرح ایک مہربان باپ کے مانند دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس گمراہ قوم کو وعظ و نصیحت کرتے رہے، لیکن اس حکیمانہ منطق کے مقابلے میں دشمنوں کے پاس مغالطے اور ڈھٹائی کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔

صرف ایک چھوٹا سا گروہ جو شاید دو افراد (ایک عابد اور ایک عالم) پر مشتمل تھا ان پر ایمان لایا۔

حضرت یونسؑ نے اس قدر تبلیغ کی کہ ان سے تقریباً مایوس ہو گئے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ عابد کے کہنے پر (اور گمراہ قوم کی کیفیت اور حالات کو دیکھتے ہوئے) آپ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ان کے خلاف بددعا کریں۔[1]

یہ پروگرام پورا ہو گیا اور حضرت یونسؑ نے ان پر نفرین کی اور انھیں بددعا دی۔ جو آپ پر وحی آئی کہ فلاں وقت عذابِ الٰہی نازل ہوگا۔ جب عذاب کے وعدے کا وقت قریب آیا تو حضرت یونسؑ اس عابد کے ساتھ اس قوم کے درمیان سے باہر چلے گئے، ایسی حالت میں کہ آپ نہایت غصّے میں تھے یہاں تک کہ دریا کے کنارے پر پہنچ گئے وہاں لوگوں اور وزن سے بھری ایک کشتی دیکھی۔ آپ نے ان سے خواہش کی کہ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلیں۔

اسی واقعے کی طرف قرآن بعد والی آیت میں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، اس وقت کو یاد کرو جب اس نے وزن اور لوگوں سے بھری ہوئی کشتی کی طرف فرار کیا (اذ ابق الی الفلک المشحون)۔

"ابق" "اباق" کے مادہ سے غلام کے اپنے آقا و مولا کے پاس سے بھاگ جانے کے معنی میں ہے اس مقام پر یہ ایک عجیب و غریب تعبیر ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہت ہی چھوٹا سا ترکِ اولیٰ کہ جو عالی مقام پیغمبروں سے سرزد ہو جائے، خدا کی طرف سے کس قدر سخت گیری اور عتاب کا باعث بنتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پیغمبر کو بھاگ جانے والے غلام کا نام دیتا ہے۔

بلاشک و شبہ یونس معصوم پیغمبر تھے اور وہ کبھی بھی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ وہ تحمل سے کام لیتے اور نزولِ عذاب سے قبل کے آخری لمحات تک اپنی قوم میں رہتے کہ شاید وہ بیدار ہو جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض روایات کے مطابق آپ نے چالیس سال تک تبلیغ کی تھی، لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ چند روز یا چند گھنٹے اور ٹھہر جاتے۔ آپ نے چونکہ ایسا نہیں کیا لہٰذا آپ کو بھاگ جانے والے غلام سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بہرحال یونس کشتی پر سوار ہو گئے۔ روایات کے مطابق ایک بہت بڑی مچھلی نے کشتی کی راہ روک لی اور منہ کھول دیا گویا وہ

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۵

کچھ کھانے کو مانگ رہی ہو۔ کشتی میں بیٹھنے والوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گنہ گار ہمارے درمیان ہے (کہ جسے اس مچھلی کا لقمہ بننا چاہیے اور قرعہ اندازی سے کام لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے)۔ اس موقع پر انھوں نے قرعہ ڈالا تو قرعہ حضرت یونس کے نام نکل آیا۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے تین مرتبہ قرعہ ڈالا اور ہر دفعہ حضرت یونسؑ ہی کا نام نکلا۔ ناچار انھوں نے یونسؑ کو پکڑ کر اس بہت بڑی مچھلی کے منہ میں پھینک دیا۔

قرآن زیر بحث آیات میں ایک مختصر سے جملے کے ذریعے اس ماجرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: یونس نے ان کے ساتھ قرعہ ڈالا اور مغلوب ہوگیا (فساهم فكان من المدحضين)۔

"ساهم" "سهم" کے مادہ سے دراصل تیر کے معنی میں ہے اور "ساهمه" قرعہ اندازی کے معنی میں ہے، کیونکہ گزشتہ زمانے میں قرعہ اندازی کے وقت تیر کی لکڑیوں پر نام لکھا کرتے تھے اور انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیتے تھے، پھر ان میں سے ایک تیر کی لکڑی باہر نکالتے تھے، جس کے نام کا ہوتا اسی کا قرعہ کہلاتا۔

"مدحض" "ادحاض" کے مادہ سے باطل کرنے، زائل کرنے اور مغلوب کرنے کے معنی میں ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ قرعہ ان کے نام نکلا۔

یہ تفسیر بھی بیان کی جاتی ہے کہ دریا میں طوفان آگیا تھا اور کشتی پر وزن بہت زیادہ تھا اور کشتی میں بیٹھنے والوں کو ہر لمحے غرق ہونے کا خطرہ ہونے لگا۔ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ کشتی کو ہلکا کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو دریا میں پھینک دیا جائے اور قرعہ یونسؑ کے نام نکل آیا۔ انھوں نے آپ کو دریا میں پھینک دیا اور ٹھیک اسی وقت ایک مگرمچھ وہاں آن پہنچا اور اس نے آپ کو نگل لیا۔

بہرحال قرآن کہتا ہے کہ ایک بہت بڑی مچھلی نے اسے نگل لیا جب کہ وہ مستحق ملامت تھا (فالتقمه الحوت وهو مليم)۔

"التقمه" "التقام" کے مادہ سے نگل جانے کے معنی میں ہے۔

"مليم" دراصل "لوم" کے مادہ سے ہے جو ملامت کے معنی میں ہے (اور جب یہ بابِ افعال میں چلا جائے تو استحقاق ملامت کے معنی دیتا ہے)۔

یہ بات مسلّم ہے کہ یہ ملامت و سرزنش کسی کبیرہ یا صغیرہ گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس کا سبب صرف ترکِ اولیٰ تھا جو ان سے سرزد ہوا اور وہ تھا اپنی قوم کو چھوڑ جانے اور ان سے ہجرت کرنے میں جلدی کرنا۔

لیکن وہ خدا جو آگ کو پانی کے اندر اور شیشے کو پتھر کی آغوش میں محفوظ رکھتا ہے، اس نے اس عظیم جانور کو حکم تکوینی دیا کہ اس کے بندے یونسؑ کو معمولی سی تکلیف بھی نہ پہنچائے۔ حضرت یونسؑ کو ایک بے نظیر اور عجیب قید میں رہنا تھا تاکہ وہ اپنے ترکِ اولیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی تلافی کریں۔

ایک روایت میں آیا ہے:۔

اوحی اللہ الی الحوت لا تکسر منہ عظمًا ولا تقطع لہ وصلًا
خدا نے اس مچھلی کی طرف وحی کی کہ اس کی کوئی ہڈی نہ توڑنا اور اس کے کسی جوڑ کو نہ کاٹنا [1]

یونس بہت ہی جلد اصل قضیے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ نے پوری توجہ کے ساتھ بارگاہِ خداوندی کی طرف رُخ کیا اور اپنے ترکِ اولیٰ پر استغفار کی اور اس کی مقدس بارگاہ سے عفو کا تقاضا کیا۔

اس مقام پر ایک نہایت پر معانی اور معروف ذکر حضرت یونسؑ کی زبانی نقل ہوا ہے جو سورۂ انبیاء کی آیہ ۸۷ میں آیا ہے اور اہلِ عرفان کے درمیان ذکر "یونسیہ" کے نام سے مشہور ہے۔

فنادٰی فی الظلمات ان لا الٰہ الّا انت سبحانک انی کنت من الظالمین
اس نے تہہ بہ تہہ تاریکیوں میں پکارا کہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو پاک و منزہ ہے میں ہی ظالموں میں سے تھا۔

میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور تیری بارگاہ سے دور ہو گیا ہوں اور تیرے عتاب و سرزنش میں، جو میرے لیے جہنم سوزاں کے مانند ہے، گرفتار ہو گیا ہوں۔

اس مخلصانہ اعتراف اور ندامت سے ملی ہوئی تسبیح نے اپنا کام کیا اور جیسا کہ سورۂ انبیاء میں بیان ہوا ہے:۔

فاستجبنالہ و نجّیناہ من الغم وکذالک ننجی المؤمنین
ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اسے غم و اندوہ سے نجات دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح سے نجات دیا کرتے ہیں۔ (انبیاء — ۸۸)

اب دیکھیں زیرِ بحث آیات اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں، ایک مختصر سے جملے میں فرمایا گیا ہے: اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا..... (فلولا انہ کان من المسبّحین)۔

تو یقیناً وہ قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا (للبث فی بطنہ الی یوم یبعثون)۔
اور یہ وقتی قید خانہ دائمی زنداں میں بدل جاتا اور وہ دائمی زنداں اس کے لیے قبرستان میں بدل جاتا۔
حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں قیامت تک رہنا (بالفرض اگر وہ درگاہِ الٰہی میں تسبیح اور توبہ نہ کرتے) زندہ صورت میں ہونا یا مُردہ صورت میں، اس ضمن میں بعض مفسّرین نے کئی احتمال بیان کیے ہیں۔
پہلا احتمال تو یہ ہے کہ وہ دونوں ہی زندہ رہتے اور یونسؑ ایک قیدی کی صورت میں قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں قید رہتے۔

---

[1] تفسیر رازی جلد ۲۶ ص ۱۶۵۔ نیز یہی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۷ پر بیان کی گئی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یونسؑ تو مر جاتے اور مچھلی چلتی پھرتی قبر کی صورت میں زندہ رہتی۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ یونسؑ اور مچھلی دونوں ہی مر جاتے اور مچھلی کا پیٹ یونسؑ کی قبر بن جاتا اور زمین مچھلی کی قبر۔ وہ مچھلی کے اندر اور مچھلی زمین کے اندر قیامت کے دن تک دفن ہو جاتے۔

زیر بحث آیت ان اقوال میں سے کسی کے لیے بھی دلیل نہیں بن سکتی۔ لیکن متعدد آیات جو یہ کہتی ہیں کہ اختتام دنیا پر سب مر جائیں گے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قیامت کے دن تک یونس کا زندہ رہنا یا مچھلی کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے اس لیے ان تینوں تفاسیر میں سے تیسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تعبیر طولانی مدت کے لیے کنایہ ہو یعنی وہ ایک طولانی مدت تک اسی زنداں میں رہتے۔ جیسا کہ یہ تعبیر اس سے ملتے جلتے موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے کہ مجھے فلاں کام کے انتظار میں قیامت تک رہنا ہوگا۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہوتا جب وہ تسبیح اور توبہ نہ کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ انھوں نے تسبیح پروردگار کی اور اس کی خاص بخشش اور عفوان کے شامل حال ہوئی۔

پھر جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے اسے ایک خشک اور درخت اور سبزے سے خالی سرزمین میں پھینک دیا۔ اس حالت میں کہ وہ بیمار تھا (فنبذناہ بالعراء وھو سقیم)۔

وہ بہت بڑی مچھلی خشک دبے گیاہ ساحل کے نزدیک آئی اور حکم خدا سے اس لقمے کو جو اس سے زائد تھا باہر پھینک دیا۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس عجیب وغریب زنداں نے یونسؑ کے جسم کی سلامتی کو درہم برہم کر دیا تھا۔ لہذا وہ بیمار و ناتواں اس زنداں سے آزاد ہوئے۔

ہمیں صحیح طور پر معلوم نہیں ہے کہ حضرت یونسؑ کتنی مدت تک مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ لیکن یقینی طور پر جتنا عرصہ بھی رہے اس کے عوارض سے بچ نہیں سکتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فرمان الٰہی صادر ہوا تھا کہ یونسؑ مچھلی کے بدن میں ہضم اور جذب نہ ہوں، لیکن یہ اس معنی میں نہیں تھا کہ اس زنداں کے کچھ آثار بھی وہ اپنے ساتھ نہ لائیں لہذا مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ وہ ایک نومولود، ضعیف و ناتواں اور بے پر و بال، پرندے کے بچے کی طرح مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے۔ اس طرح سے کہ ان میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔

---

[1] قابل توجہ بات یہ ہے کہ مفسر عظیم طبرسی مرحوم جو عام طور پر مختلف اقوال آیات کے ذیل میں جمع کرتے ہیں۔ یہاں انھوں نے صرف اسی احتمال پر قناعت کی ہے اور کہتے ہیں:۔

لصار بطن الحوت قبرًا له الیٰ یوم القیامة

مچھلی کا پیٹ قیامت تک کے لیے ان کی قبر بن جاتا۔

پھر لطفِ الٰہی ان کے شاملِ حال ہوا، کیونکہ ان کا بدن بیمار اور خستہ حال تھا اور ان کا جسم کمزور و ناتواں تھا، ساحل کی دھوپ انھیں تکلیف پہنچاتی تھی۔ لہٰذا ان کے لیے ایک نرم و گداز اور لطیف قسم کے لباس کی ضرورت تھی تاکہ ان کے بدن کو اس کے پنجے آرام حاصل ہو۔ اس مقام پر قرآن کہتا ہے: "ہم نے ایک کدو کی بیل اس کے اوپر اگادی" تاکہ وہ اس کے چوڑے اور مرطوب پتوں کے پنجے آرام کرے۔ (و انبتنا علیه شجرة من یقطین)۔

"یقطین" کا معنی بہت سے اربابِ لغت اور مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ یہ اس پودے کو کہتے ہیں جس کی شاخ اور تنا نہ ہو، اور جس کے پتے چوڑے ہوں۔ مثلاً خربوزہ، کدو، کھیرا اور تربوز وغیرہ۔ البتہ بہت سے مفسرین اور راویانِ حدیث نے تصریح کی ہے کہ اس مقام پر اس سے مراد کدو کی بیل ہے۔ توجہ رہے کہ "شجرة" عربی زبان میں ان نباتات کو بھی کہا جاتا ہے جن کا تنا اور شاخ ہو اور ان کو بھی جو تنا اور شاخ نہ رکھتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ درخت اور پودے کے لیے عام ہے۔ یہاں تک کہ اس ضمن میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے ایک حدیث بھی نقل کی گئی ہے کہ ایک شخص نے آپؐ سے عرض کیا:۔

انك تحب القرع
آپ کدو کو پسند کرتے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا:۔

اجل هی شجرة اخی یونس
ہاں یہ میرے بھائی یونسؑ کی سبزی ہے[1]

کہتے ہیں کہ کدو کی بیل میں اس کے علاوہ کہ اس کے پتے چوڑے اور پانی سے پُر ہوتے ہیں اور اس سے اچھا نما سائبان بنایا جا سکتا ہے، مکھی بھی اس کے پتوں پر نہیں بیٹھتی اور یونسؑ کے بدن کی جلد مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے اس قدر نازک اور حساس ہو گئی تھی کہ اس پر حشرات کے بیٹھنے سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے بدن کو اس کدو کی بیل کے ساتھ چھپا لیا تاکہ سورج کی تپش سے بھی مامون رہیں اور حشرات الارض سے بھی۔

شاید خدا کو یہ مطلوب ہے کہ وہ سبق جو حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں دیا تھا اس کی اس مرحلہ میں تکمیل کرے۔ وہ سورج کی تپش اور اس کی حرارت کو اپنے بدن کی نازک جلد پر محسوس کریں۔ تاکہ آئندہ رہبر ہوتے ہوئے اپنی امت کی جہنم کی جلانے والی آگ سے نجات کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ یہی مضمون بعض روایات میں بھی آیا ہے[2]

اب ہم حضرت یونسؑ کا ذکر چھوڑتے ہیں اور ان کی قوم کا حال بیان کرتے ہیں۔
جب حضرت یونسؑ نے غیض و غضب کی حالت میں اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور خدا کے غضب کے آثار بھی اس پر ظاہر ہو گئے،

---

[1] روح البیان جلد ۷، ص ۴۸۹
[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۶ حدیث ۱۱۶

تو وہ لوگ شدّت کے ساتھ لرز اُٹھے۔ اب انھیں ہوش آیا۔ ایک عالم کہ جو ان کے درمیان رہتا تھا وہ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس کی رہبری اور ہدایت سے توبہ پر آمادہ ہو گئے۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ سب مل کر بیابان کی طرف چل پڑے اور عورتوں اور بچوں نیز جانوروں اور ان کے بچوں کے درمیان جدائی ڈال دی۔ پھر گریہ وزاری میں مشغول ہو گئے اور نالہ و فریاد کی صدا بلند کی۔ اور خلوص کے ساتھ اپنے گناہوں اور ان کوتاہیوں پر توبہ کی کہ جو انھوں نے خدا کے پیغمبر حضرت یونسؑ کے ساتھ روا رکھی تھیں۔

اس موقع پر عذاب کے پردے ہٹ گئے اور وہ حادثہ پہاڑوں پر جا گرا۔ اور توبہ کرنے والے اہلِ ایمان نے لطفِ الٰہی کے باعث نجات پائی[1]

حضرت یونس اس ماجرے کے بعد اپنی قوم کے پاس آئے تاکہ دیکھیں کہ عذاب سے ان پر کیا گزری؟

جب وہ آئے تو بہت متعجب ہوئے کہ گویا دنیا بدل گئی۔ وہ تو ان کی ہجرت کے وقت سب کے سب بُت پرست تھے لیکن اب وہ سب کے سب خدا پرست موحّد بن گئے ہیں۔

قرآن اس موقع پر کہتا ہے: ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ افراد کی طرف بھیجا (وارسلناہ الی مائۃ الف او یزیدون)۔

وہ ایمان لے آئے اور ہم نے انھیں ایک معیّن مُدّت تک دنیاوی نعمتوں اور زندگی سے بہرہ مند کیا (فآمنوا فمتّعناھم الی حین)۔

البتہ ان کا اجمالی ایمان اور توبہ تو پہلے ہو چکی تھی لیکن خدا اور اس کے پیغمبر حضرت یونسؑ اور ان کی تعلیمات و احکام پر تفصیلی ایمان اس وقت صورت پذیر ہوا جب جنابِ یونسؑ ان کے درمیان پلٹ کر آئے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماموریت نئے سرے سے اسی قوم کی طرف ہوئی تھی اور یہ جو بعض نے ان کی جدید ماموریت کو ایک نئی قوم کے لیے سمجھا ہے وہ ظاہر آیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ ایک طرف تو یہ بیان ہوا ہے کہ:

فآمنوا فمتّعناھم الی حین

یعنی یہ قوم جس کی ہدایت کے لیے یونسؑ مامور ہوئے تھے وہ ایمان لے آئی اور ہم نے انھیں ایک معین زمانے تک بہرہ مند کیا۔

اور دوسری طرف یہی تعبیر سورۂ یونس میں اسی سابق قوم کے بارے میں آئی ہے۔

فلولا کانت قریۃ اٰمنت فنفعھا ایمانھا الّا قوم یونس لمّا اٰمنوا

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۵ پر یہ حدیث امام صادقؑ سے منقول ہے۔

کشفنا عنهم عذاب الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا ومتّعناهم الی حین

(دوسری) قوموں میں سے کوئی قوم بروقت ایمان کیوں نہ لائی تاکہ وہ ان کے حال کے لیے مفید ہوتا۔ سوائے قوم یونس کے کہ جس وقت وہ ایمان لے آئی تو ہم نے دنیاوی زندگی میں خوار کرنے والا عذاب ان سے برطرف کر دیا اور ہم نے انھیں ایک مدت معین تک بہرہ مند کیا۔

(یونس ـــــ ۹۸)

ضمنی طور پر یہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ "الی حین" (معین مدت تک) سے مراد وہی ان کی زندگی اور اجل طبیعی کا اختتام ہے۔

زیر بحث آیات میں "ایک لاکھ یا اس سے زیادہ" کیوں فرمایا گیا ہے اور زیادہ سے مراد کتنی تعداد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے طرح طرح کی تفسیریں بیان کی ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ اس قسم کی تعبیریں کسی چیز کی عظمت اور تاکید کے لیے ہوتی ہیں نہ کہ کہنے والے کے شک وشبہ کے لیے[1]

چند اہم نکات

۱۔ حضرت یونس کی زندگی کی مختصر تاریخ:۔ "یونس" "متی" کے فرزند ہیں "ذوالنون" (مچھلی والا) آپ کا لقب ہے اور یہ لقب اس بنا پر ہے کہ چونکہ ان کی سرگزشت۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ ایک مچھلی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ آپ ان مشہور پیغمبروں میں سے ہیں جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے بعد اس دنیا میں آئے۔

بعض نے انھیں حضرت ہودؑ کی اولاد میں سے قرار دیا ہے اور ان کی ماموریت قوم ثمود کے باقی ماندہ لوگوں کی ہدایت قرار دیا ہے۔

ان کے ظہور کا مقام عراق کا ایک علاقہ تھا جس کا نام نینوا تھا[2]

بعض نے ان کا ظہور ۸۲۵ سال قبل مسیح لکھا ہے اور اب بھی کوفہ کے نزدیک شطِ فرات کے کنارے "یونس" کے نام کی ایک معروف قبر موجود ہے۔

بعض کتابوں نے لکھا ہے کہ آپ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر تھے جو حضرت سلیمانؑ کے بعد اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے۔

---

[1] اس بناء پر یہاں "او" "بل" (یعنی بلکہ) کے معنی میں ہے۔

[2] "نینوا" کئی مقامات کا نام ہے پہلا موصل کے نزدیک شہر ہے (یا قوت موصل) اور دوسرا اطراف کوفہ میں کربلا کی سمت کا ایک علاقہ ہے اور ایشیائے کوچک میں ایک شہر ہے جو دجلہ کے کنارے واقع مملکت آشور کا پایۂ تخت ہے (دائرۃ المعارف دھخدا) بعض دوسروں نے لکھا ہے کہ "نینوا" ملک آشور کا ایک بہت بڑا شہر ہے جو موصل کے بالکل سامنے دجلہ کے مشرقی کنارے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ (فرہنگ قصص قرآن)

کتاب "یوناہ" میں جو عہد عتیق (تورات) کی کتابوں میں سے ہے۔ "یونس" کے بارے میں تفصیلی ذکر "یوناہ بن متی" کے نام سے کیا گیا ہے۔

اس کے مطابق وہ اس بات کے لیے مامور ہوئے تھے کہ عظیم شہر نینوا جائیں اور لوگوں کی شرارت کے خلاف قیام کریں۔ اس کے بعد کچھ اور واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں جو قرآن کے بیان سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلامی روایات کے مطابق تو حضرت یونسؑ نے اپنی قوم کو دعوت دینے کے لیے قیام کیا اور اس سلسلے میں اپنے فریضے اور ذمہ داری کو انجام دیا اور جب انکی قوم نے ان کی دعوت کو رد کر دیا تو انھوں نے انھیں نفرین کی اور بد دعا دی۔ پھر ان کے درمیان سے چلے گئے اور کشتی اور مچھلی کا واقعہ انھیں پیش آیا۔ لیکن تورات کی عبارت بہت ناموزوں سی ہے اور تصریح کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ انجام ذمہ داری سے پہلے ہی یہ چاہتے تھے کہ استعفیٰ دے دیں۔ لہذا وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور کشتی اور مچھلی والا واقعہ پیش آیا۔

اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ "تورات" کہتی ہے۔

جب خدا نے اس قوم سے ان کی توبہ کی وجہ سے عذاب اٹھا لیا، تو یونسؑ کو بہت دُکھ ہوا اور وہ بھڑک اُٹھے [1]

تورات کی فصول سے معلوم ہوتا ہے کہ یونسؑ کو دو مرتبہ مامور کیا گیا پہلی ماموریت کے موقع پر انکار کر دیا اور اس دردناک انجام میں مبتلا ہوئے۔ دوبارہ انھیں مامور کیا گیا کہ اسی شہر "نینوا" کی طرف جائیں کہ نینوا کے لوگ بیدار ہو چکے ہیں اور خدا پر ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہے۔ اور وہ عفوِ الٰہی ان کے شاملِ حال ہو گیا ہے، لیکن یہ عفو و بخشش یونس کو اچھی نہیں لگی۔

قرآن اور اسلامی روایات کے بیانات کا موجودہ تورات کے بیانات سے موازنہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ "تورات" میں کتنی تحریف ہو گئی ہے کہ اس نے اس عظیم پیغمبرؑ کے مقام کو اس قدر گرا دیا ہے۔ کبھی ان کی طرف ماموریت اور ذمہ داری قبول نہ کرنے کی نسبت دیتی ہے اور کبھی ایک توبہ کرنے والی قوم پر پروردگار کے عفو و رحمت کو دیکھ کر خشمناک ہونے کی نسبت دیتی ہے۔ یہی چیزیں ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ موجودہ تورات کسی لحاظ سے بھی قابلِ اعتماد کتاب نہیں ہے بہرحال وہ ایک عظیم پیغمبر ہیں جن کو قرآن نے عظمت کے ساتھ یاد کیا ہے۔

۲۔ یونس مچھلی کے پیٹ میں کیسے زندہ رہے؟ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے کہ یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں کتنی مدت رہے؟ چند گھنٹے یا چند دن یا چند ہفتے؟ بعض روایات میں نو گھنٹے، بعض میں تین دن اور بعض میں اس سے زیادہ، یہاں تک کہ چالیس دن تک کی مدت بیان کی گئی ہے۔ لیکن ان اقوال کا کوئی یقینی ثبوت موجود نہیں ہے۔ صرف تفسیر علی بن ابراہیم میں امیرالمؤمنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ میں

---

[1] تورات کتاب یوناہ پیغمبر فصل اول دوم و سوم و چہارم

توقف ۹ گھنٹے بیان ہوا ہے[1]

بعض مفسرین اہل سنت نے اس کی مدت ایک گھنٹہ بھی بیان کی ہے[2]

لیکن جو کچھ بھی ہو بلاشک وشبہ یہ توقف ایک غیر معمولی امر ہے انسان ایسے ماحول میں جہاں ہوا نہ ہو چند منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بچہ ماں کے پیٹ میں کئی ماہ تک زندہ رہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اس کے تنفس کی مشینری نے اپنا کام کرنا شروع نہیں کیا ہوتا اور وہ ضروری آکسیجن صرف ماں کے خون کے راستے سے حاصل کرتا ہے۔

اس بنا پر حضرت یونسؑ کا ماجرا بلاشبہ ایک اعجاز ہے اور یہ پہلا اعجاز نہیں ہے جو ہمیں قرآن سے معلوم ہوا ہے۔ وہی خدا جس نے ابراہیمؑ کو آگ کے درمیان صحیح وسالم رکھا اور موسیٰ و بنی اسرائیل کو دریا کے وسط میں خشک راستے بنا کر غرق ہونے سے بچایا اور نوح کو ایک سادہ اور عام کشتی کے ذریعے اس عظیم اور وسیع طوفان سے نجات بخشی اور صحیح وسالم زمین پر اتارا۔ وہی خدا یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ اپنے مخصوص بندوں میں سے ایک بندے کو ایک بہت بڑی مچھلی کے پیٹ میں صحیح وسالم رکھے۔

البتہ گزشتہ اور موجودہ زمانے میں اس قسم کی بڑی مچھلیوں کا موجود ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اس وقت بھی بڑی بڑی مچھلیاں "وہیل" نام کی موجود ہیں۔ جن کی لمبائی ۲۰ میٹر سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور یہ اس زمین کا سب سے بڑا جانور ہے اور اس کا جگر ایک ٹن تک ہوتا ہے۔

ہم نے اسی سورہ میں گزشتہ انبیاء کی داستانیں پڑھی ہیں جنھوں نے اعجاز آمیز طریقے سے بلاؤں اور مصائب کے پنجے سے نجات پائی اور حضرت یونسؑ اس سلسلہ میان کے آخری نبی ہیں۔

۲۔ چھوٹی سی داستان میں بہت سے سبق:۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں ان قصوں کا بیان تربیتی مقاصد کے لیے ہے کیونکہ قرآن کوئی قصے کہانیوں کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ انسان سازی اور تربیت کی کتاب ہے۔

اس عجیب داستان سے بہت سے پند ونصائح حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

الف:۔ تخلف، چاہے ایک بزرگ پیغمبر سے، ایک "ترک اولیٰ" کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو خدا کی بارگاہ میں بہت اہم ہے اور موجب سزا ہے۔

البتہ چونکہ پیغمبروں کا مقام بہت اونچا ہوتا ہے لہذا ان کی ایک چھوٹی سی غفلت بھی کبھی دوسروں کے گناہ کبیرہ کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ اسی بنا پر ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اس داستان میں خدا نے انھیں بھاگ جانے والا غلام کہا ہے۔ روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ کشتی میں بیٹھنے والوں نے کہا تھا کہ کوئی گنہ گار آدمی ہمارے درمیان ہے اور انجام کار خدا نے انھیں ایک وحشت ناک زنداں میں گرفتار کیا۔ اور توبہ اور خدا کی طرف بازگشت کے بعد اس زنداں سے خستہ حال اور بیمار بدن کے ساتھ آزاد ہوئے تھے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۳۶ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم

[2] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۵۶۷

تاکہ سب لوگ جان لیں کہ تخلف اور گناہ کسی شخص سے بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ انبیاء و اولیاء خدا کے مقام کی عظمت بھی اسی میں ہے کہ وہ اس کے فرمان کے مطیع ہوتے ہیں۔ ورنہ کوئی بھی خدا کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں رکھتا۔ البتہ یہ اس عظیم پیغمبر کی عظمت کی نشانی ہے کہ خدا اس کے بارے میں اس قسم کی سخت گیری کر رہا ہے۔

ب:۔ اسی داستان (کے اس حصے میں جو سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷ میں آیا ہے) میں مؤمنین کے غم واندوہ اور مشکلات سے نجات کا بھی وہی راستہ بتایا گیا ہے جو خود حضرت یونسؑ نے طے کیا تھا اور وہ ہے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں خطا اور غلطی کا اعتراف، تسبیح و تنزیہ اور اس کی بارگاہ میں توبہ و انابت و بازگشت۔

ج:۔ یہ واقعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ایک گنہ گار اور مستحق عذاب قوم، کس طرح سے آخری لمحات میں اپنی تاریخ کا راستہ بدل سکتی ہے اور خدا کی رحمت و محبت بھری آغوش کی طرف پلٹ کر نجات پا سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ موقع ہاتھ سے نکلنے سے پہلے متوجہ ہو جائے اور اگر ہو سکے تو کسی عالم کو اپنی رہبری کے لیے منتخب کرے۔

د:۔ یہ ماجرا اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ خدا پر ایمان اور گناہ سے توبہ آثار و برکات کے علاوہ، دنیا کی ظاہری نعمتوں کا رُخ بھی انسان کی طرف موڑ دیتی ہے، آبادی بڑھاتی ہے نیز طولِ عمر اور زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا سبب بنتی ہے۔ اس مطلب کی نظیر حضرت نوحؑ کی داستان میں بھی آئی ہے۔ اس کی تفصیل و تشریح انشاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں بیان کی جائے گی۔

ھ:۔ خدا کی قدرت اس قدر وسیع و عریض ہے کہ اس کے سامنے کوئی بھی چیز مشکل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک انسان کو ایک عظیم اور وحشت ناک جانور کے منہ اور پیٹ میں سالم و محفوظ رکھ سکتا ہے اور سالم ہی باہر نکال سکتا ہے یہ امور اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس عالم کے تمام اسباب اس کے ارادے کے تحت اور اس کے فرمان کے سامنے سرنگوں ہیں۔

۴۔ ایک سوال کا جواب:۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسری اقوام کی سرگزشتوں کے بیان میں آیاتِ قرآنی میں آیا ہے کہ نزولِ عذاب کے وقت (عذاب استیصال جو سرکش اقوام کی نابودی کے لیے نازل ہوتا ہے) توبہ و انابت بے اثر ہوتی ہے تو پھر قوم یونسؑ کے لیے اس مسئلے میں استثناء کیسے ہوا۔

اس سوال کے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں:۔

پہلا جواب تو یہ ہے کہ عذاب ابھی نازل نہیں ہوا تھا ابھی کچھ علامات ہی جو تنبیہ اور خبردار کرنے کے لیے معین نظر آئی تھیں کہ انھوں نے ان تنبیہوں سے برمحل استفادہ کیا اور نزولِ عذاب سے پہلے ہی توبہ کر لی اور ایمان لے آئے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ عذاب "عذاب استیصال" نہیں تھا بلکہ گوشمالی کے طور پر تھا۔ ایسی گوشمالی قوموں پر عذاب نازل کرنے سے پہلے کی جاتی تھی، تاکہ وہ موقع ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے بیدار ہو جائیں اور تقویٰ کا راستہ اختیار کریں۔ جیسا کہ غرق ہونے سے پہلے فرعون کی قوم پر مختلف عذاب بھیجے گئے تھے۔

۵۔ اسلام میں قرعہ اندازی کی مشروعیت:۔ قرعہ اور اس کی مشروعیت سے مربوط روایات میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

ای قضیۃ اعدل من القرعۃ اذا فوض الامر الی اللہ عز وجل، یقول:
فساھم فکان من المدحضین

قرعہ سے بڑھ کر عادلانہ فیصلہ اور کون سا ہو سکتا ہے (کہ جب معاملہ مشکل ہو جائے) تو موضوع کو خدا کے سپرد کر دیا جائے، کیا خدا (قرآن مجید میں یونسؑ کے بارے میں) نہیں کہتا: "فساھم فکان من المدحضین" (یونس نے کشتی میں بیٹھنے والوں کے ساتھ قرعہ اندازی کی اور قرعہ یونس کے نام نکلا اور وہ مغلوب ہو گئے)۔[1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب معاملہ مشکل ہو جائے اور اس کے حل کی اور کوئی دوسری راہ موجود نہ ہو اور کام کو خدا کے سپرد کر دیا جائے تو واقعاً قرعہ راہ کشا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یونسؑ کی داستان میں حقیقت پر ٹھیک منطبق ہوا۔

یہی مطلب ایک دوسری حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:۔

لیس من قوم تنازعوا (تقارعوا) ثم فوضوا امرھم الی اللہ الا خرج سھم المحق

کسی قوم نے (جب مسئلہ کے حل کی تمام راہیں مسدود ہو گئی ہوں) قرعہ پر اقدام نہیں کیا جبکہ انھوں نے اپنے کام کو خدا کے سپرد کر دیا ہو۔ مگر یہ کہ قرعہ حقیقت کے مطابق نکلا اور حق آشکار و واضح ہو گیا۔[2]

اس مسئلے کی مزید تشریح و تفصیل ہم نے کتاب "القواعد الفقھیہ" میں بیان کی ہے۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۷ (حدیث ۶)

[2] وسائل، کتاب القضاء جلد ۱۸ باب الحکم بالقرعۃ فی القضایا المشکلۃ از ابواب کیفیۃ الحکم واحکام الدعویٰ (باب ۱۳) حدیث ۵

۱۴۹۔ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۙ

۱۵۰۔ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ۝

۱۵۱۔ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۙ

۱۵۲۔ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝

۱۵۳۔ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝

۱۵۴۔ مَا لَكُمْ ۚ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝

۱۵۵۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

۱۵۶۔ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ

۱۵۷۔ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

۱۵۸۔ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۙ

۱۵۹۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ

۱۶۰۔ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۴۹۔ ان سے پوچھ! کیا تیرے پروردگار کیلئے تو لڑکیاں ہیں اور ان کے لیے لڑکے؟

۱۵۰۔ کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیوں کی صورت میں پیدا کیا ہے اور وہ مشاہدہ کر رہے تھے؟

۱۵۱۔ جان لو کہ وہ اپنی بڑی تہمت باندھتے ہوئے کہتے ہیں:

۱۵۲۔ خدا صاحب اولاد ہے، لیکن یقیناً وہ قطعی جھوٹ بولتے ہیں۔

۱۵۳۔ کیا اس نے بیٹیوں کو بیٹوں پر ترجیح دی ہے ؟
۱۵۴۔ تمھیں کیا ہوگیا، تم یہ کیسا فیصلہ کر رہے ہو (کچھ سمجھتے بھی ہو کہ یہ کیا کہہ رہے ہو) ؟
۱۵۵۔ کیا تم متوجہ نہیں ہوتے ؟
۱۵۶۔ کیا تمھارے پاس اس بارے میں کوئی واضح دلیل ہے ؟
۱۵۷۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو اپنی کتاب لے آؤ !
۱۵۸۔ وہ اس کے اور جنوں کے درمیان (رشتہ داری اور) نسبت کے قائل ہوگئے ہیں، حالانکہ جن اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ بت پرست عدالتِ الٰہی میں حاضر کیے جائیں گے۔
۱۵۹۔ خدا اس توصیف سے جو وہ کرتے ہیں، منزّہ ہے۔
۱۶۰۔ مگر خدا کے مخلص بندے۔

تفسیر

قبیح تہمتیں

گذشتہ انبیاء کی چھ داستانوں اور ان میں سے ہر ایک میں جو اصلاحی و تربیتی درس پوشیدہ تھا، اسے ذکر کرنے کے بعد موضوعِ سخن تبدیل کرتے ہوئے ایک اور مطلب شروع کیا جا رہا ہے کہ جو مشرکینِ عرب کے ساتھ شدید ارتباط رکھتا ہے، ان کے شرک کی مختلف شکلوں کو پیش کر کے ان سے سخت اور شدید باز پرس کی جا رہی ہے۔ اور مختلف دلائل کے ذریعے ان کے بے ہودہ اور خرافاتی انکار کی سرکوبی کی جا رہی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ مشرکینِ عرب کی ایک جماعت انحطاط فکری اور کسی قسم کا علم و دانش نہ ہونے کی بنا پر خدا کو اپنے جیسا قیاس کرتے تھے اور اس کے لیے اولاد اور کبھی بیوی کے بھی قائل تھے۔

ان میں سے جہینہ، سلیم، خزاعہ اور بنی ملیح وغیرہ قبیلے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور بہت سارے مشرکینِ عرب جنوں کو بھی خدا کی اولاد سمجھتے تھے یا بعض پروردگار کے لیے جنّات میں سے بیوی کے قائل تھے۔

اس قسم کے بے بنیاد، بے ہودہ اور خرافاتی خیالات و تصورات نے انھیں بالکل راہِ حق سے منحرف کر دیا تھا۔ اس طرح سے کہ توحید اور خدا کی یگانگی کے آثار ان کے ہاں سے ختم ہوگئے تھے۔

حدیث میں آیا ہے کہ چیونٹی یہ خیال کرتی ہے کہ اس کا پروردگار اس کی طرح دو ڈنگ رکھتا ہے۔
ہاں، کوتاہ نظری، انسان کو موازنہ کرنے کی طرف کھینچ لے جاتی ہے، خالق کا مخلوق کے ساتھ موازنہ اور خدا کی شناخت اور معرفت کے

سلسلے میں یہ قیاس گمراہی کا بدترین سبب ہے۔

بہرحال قرآن پہلے ان کی طرف توجہ کرتا ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے اور انھیں تجرباتی، عقلی اور منقول تینوں طریقوں سے جواب دیتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ان سے پوچھ، کیا تیرے پروردگار کی تو بیٹیاں ہیں اور ان کے بیٹے ہیں (فاستفتهم الربك البنات و لهم البنون)[1]۔

جس چیز کو تم خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہو، اسے خدا کے لیے قرار دیتے ہو (یہ گفتگو ان کے باطل عقیدہ کے مطابق ہے کیونکہ وہ لڑکی سے سخت متنفر تھے اور لڑکے سے شدید لگاؤ رکھتے تھے کیونکہ لڑکے ان کی جنگوں اور غارت گریوں میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے جبکہ لڑکیاں ان کی کچھ مدد نہیں کر پاتی تھیں۔

بلاشک لڑکے اور لڑکیاں انسانی نکتہ نظر سے اور خدا کی بارگاہ میں قدر و قیمت کے لحاظ سے، یکساں اور برابر ہیں، دونوں کی شخصیت کا معیار پاکیزگی اور تقویٰ ہے لیکن یہاں پر قرآن کا استدلال اصطلاح کے مطابق "مسلمات خصم"[2] کو بیان کرنے کے طور پر ہے کہ طرف مقابل کے مطالب کو لے کر خود اسی کی طرف پلٹائے جائیں۔

اس معنی کی نظیر قرآن کی دوسری صورتوں میں بھی آئی ہے مثلاً سورۂ نجم کی آیا ۲۱، ۲۲ میں بیان ہوا ہے:

الكم الذكر و له الانثى تلك اذاً قسمة ضيزى

کیا تمھارے لیے تو بیٹا ہے اور اس کے لیے بیٹی، یہ تو ایک غیر عادلانہ تقسیم ہے۔

اس کے بعد اس مسئلے کی حسی دلیل پیش کی گئی ہے۔ پھر استفہام انکاری کی صورت میں قرآن کہتا ہے: کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیوں کی صورت میں پیدا کیا ہے اور وہ اس کے شاہد و ناظر تھے؟ (ام خلقنا الملائكة اناثاً وهم شاهدون)۔

بلاشک و شبہ اس سلسلے میں ان کا جواب منفی تھا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی خلقتِ ملائکہ کے وقت اپنے حضور و شہود کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔

بار دیگر دلیل عقلی کے جو ان کے مسلماتِ ذہنی سے لی گئی ہے کی طرف رجوع کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: جان لو کہ وہ اپنی اس قبیح اور بہت بڑی تہمت کے ساتھ کہتے ہیں..... (الا انهم من افكهم ليقولون)۔

خدا صاحب اولاد ہے (جبکہ) وہ قطعاً جھوٹے ہیں (و لد الله و انهم لكاذبون)۔

---

[1] "استفتهم" مادہ "استفتاء" سے اصل میں "فتویٰ" سے لیا گیا ہے جو مشکل مسائل کا جواب دینے کے معنی میں ہے۔

[2] مخالف کی تسلیم شدہ بات سے استدلال کرنا مراد ہے۔

کیا اس نے بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دی ہے؟ (اصطفی البنات علی البنین)۔

تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسے فیصلے کر رہے ہو؟! کچھ سمجھتے بھی ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟ (مالکم کیف تحکمون)۔

کیا ابھی اس بات کا وقت نہیں آیا کہ تم ان مہمل، فضول اور قبیح و رسوا خرافات سے دستبردار ہو جاؤ؟ کیا تم متوجہ نہیں ہوتے؟ (افلا تذکرون)۔

یہ باتیں اس قدر باطل اور بے بنیاد ہیں کہ اگر انسان تھوڑی سی بھی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتا ہو اور اس بارے میں غور کرے تو ان کے باطل ہونے کا ادراک کر لے گا۔

ایک حسی اور ایک عقلی دلیل کے ساتھ ان کے بیہودہ اور خرافاتی دعوے کو باطل کرنے کے بعد قرآن تیسری دلیل پیش کرتا ہے جو منقولات سے متعلق ہے۔ کہتا ہے: اگر اس قسم کی کوئی بات جو تم کہتے ہو صحیح ہوتی تو اس کا کوئی اثر و نشان گزشتہ کتابوں میں ہونا چاہیے کیا تمھارے پاس اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود ہے؟ (ام لکم سلطان مبین)۔

"اگر تمھارے پاس کوئی ایسی دلیل موجود ہے تو اپنی کتاب لے آؤ، اگر تم سچ کہتے ہو" (فأتوا بکتابکم ان کنتم صادقین)۔

کس کتاب میں؟ کس تحریر میں؟ اور کس وحی آسمانی میں اس قسم کی چیز آئی ہے اور کس پیغمبر پر نازل ہوئی ہے؟

ایسی ہی بات قرآن میں بت پرستوں کے لیے موجود ہے۔ اس ضمن میں قرآن کہتا ہے کہ انھوں نے فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں بیٹیاں قرار دے دیا ہے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔ قرآن مزید کہتا ہے:۔

ام اٰتینا ھم کتابًا من قبلہ فھم بہ مستمسکون

کیا ہم نے اس سے پہلے ان کے پاس کوئی ایسی کتاب بھیجی ہے جس سے وہ اپنے دعوے میں سہارا لیتے ہیں۔ (زخرف ـــــ ۲۱)

نہیں! یہ باتیں کتبِ آسمانی سے اخذ نہیں کی گئیں۔ یہ تو وہ خرافات ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف اور کچھ جاہلوں سے دوسرے جاہلوں کی طرف منتقل ہوئی ہیں اور اس کی عقل کے اعتبار سے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۂ زخرف کی اسی آیہ کے ذیل میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

بعد والی آیت میں مشرکینِ عرب کی خرافات میں سے ایک اور بے ہودگی بیان کی گئی ہے اور وہ وہ نسبت ہے جو وہ "خدا" اور "جن" کے درمیان سمجھتے تھے۔ اس موقع پر گفتگو خطاب کی صورت سے نکل کر غائب کی صورت میں آ گئی ہے، گویا وہ اس قدر

بے قدر و قیمت ہیں کہ آمنے سامنے بات کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں ۔ فرمایا گیا ہے : وہ اس کے اور جن کے درمیان رشتہ داری اور نسبت کے قائل ہو گئے ہیں (و جعلوا بینه و بین الجنة نسبًا) ۔

یہ کون سی نسبت تھی جس کے وہ خدا اور جن کے درمیان قائل تھے ؟ اس سوال کے جواب میں کئی تفاسیر بیان کی گئی ہیں ۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ وہ دوگانہ پرست تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ (نعوذ باللہ) خدا اور شیطان بھائی بھائی ہیں ، خدا تو نیکیوں کا خالق ہے اور شیطان برائیوں کا خالق ہے ۔

یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے کیونکہ دوگانہ پرست اور ثنوین دنیائے عرب میں مشہور نہیں تھے ۔ البتہ ساسانیوں کے دور میں ایران کے مانند کچھ علاقوں میں یہ بے ہودہ عقیدہ موجود تھا ۔

بعض دوسرے مفسرین نے جن اور ملک کو ایک ہی معنی میں سمجھا ہے ۔ کیونکہ جن اصل میں اس موجود کے معنی میں ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہو ۔ وہ کہتے ہیں کہ فرشتے چونکہ آنکھ سے نظر نہیں آتے لہذا یہ لفظ انھی کے لیے بولا جاتا ہے ۔ اس بنا پر وہ یہ کہتے ہیں کہ نسب سے مراد وہی نسبت ہے جس کی زمانہ جاہلیت کے عرب ان کے لیے قائل تھے اور انھیں خدا کی بیٹیاں کہتے تھے ۔

مشکل ہے کہ یہ تفسیر بھی صحیح ہو چونکہ زیر بحث آیات ظاہری اعتبار سے دو الگ الگ مطالب بیان کر رہی ہیں ۔ علاوہ ازیں لفظ "جن" کا "ملائکہ" پر اطلاق معمول و مانوس نہیں ہے ، خصوصاً قرآن مجید میں ۔

تیسری تفسیر جو بعض نے اس آیہ کے بارے میں بیان کی ہے یہ ہے کہ وہ جنوں کو خدا کی بیویاں خیال کرتے تھے اور ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں ۔

یہ تفسیر بھی بعید نظر آتی ہے چونکہ لفظ "نسب" کا "زوجیت" پر اطلاق بھی بعید ہے ۔

وہ تفسیر جو سب سے زیادہ مناسب ہے یہ ہے کہ "نسب" سے مراد ہر قسم کی نسبت و رابطہ ہے ، چاہے رشتہ داری کا کوئی پہلو اس میں نہ ہو اور ہم جانتے ہیں کہ بعض مشرکین عرب جنوں کی پرستش کرتے تھے اور انھیں خدا کا شریک سمجھتے تھے اور اسطرح سے وہ ان کے اور خدا کے درمیان ایک نسبت اور رابطے کے قائل تھے ۔

بہرحال قرآن مجید اس بے ہودہ اور خرافاتی عقیدے کا شدت کے ساتھ انکار کرتا ہے اور کہتا ہے : وہ جن جنھیں خرافاتی بت پرست اپنا معبود خیال کرتے تھے یا انھیں خدا کا رشتہ دار سمجھتے تھے ، ہاں ! وہی جن اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بے ہودہ بت پرست خدا کی عدالت میں حساب و کتاب اور عذاب و سزا کے لیے ضرور حاضر ہوں گے (و لقد علمت الجنة انهم لمحضرون) ۔

بعض نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے وہ یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ گمراہ کرنے والے جنات جانتے ہیں کہ وہ خود عدالتِ خداوندی میں حساب و کتاب اور عذاب کے لیے حاضر کیے جائیں گے ۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب لگتی ہے [1]

---

[1] پہلی صورت میں "هم" کی ضمیر مشرکین کی طرف لوٹتی ہے اور دوسری صورت میں "جن" کی طرف ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: خدا اس تعریف و توصیف سے جو یہ (جاہل و گمراہ) گروہ کرتا ہے، پاک و منزّہ ہے (سبحان اللہ عمّا یصفون)۔

اس توصیف کے سوا جو خدا کے مخلص بندے (از روئے آگاہی و معرفت اس کے بارے میں کرتے ہیں) کوئی توصیف اس مقدس ذات کے لیے شایان نہیں ہے (الّا عباد اللہ المخلصین)۔

اس طرح ہر قسم کی توصیف جو لوگ خدا کے بارے میں کرتے ہیں درست نہیں ہے اور خدا اس سے پاک و منزّہ ہے، سوائے اس توصیف کے جو مخلص بندے اس کی کرتے ہیں۔ وہ بندے ہر قسم کے شرک، ہوائے نفس، جہالت اور گمراہی سے مبرّا ہیں اور خدا کی اس کے سوا جس کی اس نے خود اجازت دی ہے توصیف نہیں کرتے[1]

"عباد اللہ المخلصین" کے بارے میں ہم نے اسی سورہ کی آیہ ۱۲۸ کے ذیل میں بحث کی ہے۔

ہاں! خدا کی شناخت اور معرفت کے لیے ان خرافات کے پیچھے نہیں جانا چاہیے جو زمانۂ جاہلیت کی اقوام سے باقی رہ گئی ہیں اور انسان کو انھیں بیان کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے بلکہ مخلص بندوں کی پیروی کرنا چاہیے، جن کی گفتار انسان کی روح کو آسمانوں کی بلندی کی طرف لے جاتی ہے اور اس کے نورِ وحدانیت میں محو کر دیتی ہے۔ شرک کے ہر طرح کے شک و شبہات کو اس کے دل سے دھو دیتی ہے اور ہر قسم کے تجسّم و تشبیہ کو ذہن سے مٹا دیتی ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات علی علیہ السلام کے نہج البلاغہ کے خطبات اور صحیفہ سجادیہ میں امام سجاد علیہ السلام کی پُر مغز دعاؤں کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان بندگانِ خدا کی توصیفوں سے خدا کو پہچاننا چاہیے۔ امیر المؤمنین علیہ السلام ایک مقام پر فرماتے ہیں:۔

لم یطلع العقول علی تحدید صفتہ، ولم یحجبھا عن واجب معرفتہ، فھو الذی تشھد لہ اعلام الوجود علی اقرار قلب ذی الجحود تعالی اللہ عما یقولہ المشبھون بہ والجاحدون لہ علوًا کبیرًا

نہ تو اس نے عقلوں کو اپنی صفات کی کنہ و حقیقت سے آگاہ کیا ہے اور نہ ہی انھیں اپنی معرفت و شناخت سے باز رکھا ہے۔ وہ وہی تو ہے جس کے وجود کے اقرار پر عالمِ ہستی کی نشانیاں منکرین کے دلوں کو ابھارتی ہیں، اور وہ ان لوگوں کی بات سے برتر و بالا ہے جو اسے اس کی مخلوقات کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں یا اس کے انکار کا راستہ اختیار کرتے ہیں[2]

ایک دوسری جگہ پروردگار کی تعریف و توصیف میں اس طرح فرماتے ہیں:۔

---

[1] اس تفسیر کی بنا پر (الّا عباد اللہ) کا جملہ (یصفون) کی ضمیر سے استثناء ہے لیکن بعض نے "محضرون" کی ضمیر سے استثناء سمجھتے ہیں اور اس کی مختلف تفسیریں کرتے ہیں۔ البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور ہر حالت میں استثناء "منقطع" ہے۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۴۹

لاتناله الاوهام فتقدره، ولاتتوهمه الفطن فتصوره. ولا تدرکه الحواس فتحسه، ولا تلمسه الایدی فتمسه، ولا یتغیر بحال، ولا یتبدل فی الاحوال، ولا تبلیه اللیالی والایام، ولا یغیره الضیاء والظلام، ولا یوصف بشیء من الاجزاء ولا بالجوارح والاعضاء، ولا بعرض من الاعراض، ولا بالغیریة والابعاض، ولا یقال له حد ولا نهایة، ولا انقطاع ولا غایة

بتدا وہام اور اندیشوں کے ہاتھ اس کی دامنِ کبریائی تک نہیں پہنچ سکتے کہ اسے کسی حد میں محدود کردیں اور صاحبانِ ہوش وخرد اس کے نقش کی اپنے خیال میں تصویر کشی نہیں کرسکتے۔ حواس اس کے ادراک سے عاجز ہیں اور ہاتھ اسے چھونے سے قاصر ہیں۔ تغیر وتبدل اس کے لیے نہیں ہے۔ زمانہ گزرنے سے اس کے وجود میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ راتوں اور دنوں کا آنا جانا اسے کہنہ اور پرانا نہیں کرتا۔ روشنی اور تاریکی اس میں تغیر پیدا نہیں کرتے۔ اس کی نہ تو اجزاء اور اعضاء وجوارح کے ساتھ توصیف ہوسکتی ہے اور نہ ہی عوارض وابعاض کے ساتھ۔ اور اس کے لیے کوئی حد بندی اور انتہا نہیں ہے۔ اور وہ کوئی انقطاع وانتہا نہیں رکھتا[1]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

ومن قال فیما؟ فقد ضمنه، ومن قال علام؟ فقد اخلی منه، کائن لاعن حدث، موجود لاعن عدم، مع کل شیء لا بمقارنة وغیر کل شیء لا بمزایلة

جو شخص یہ کہے کہ خدا کہاں ہے؟ اس نے اس کا کسی چیز میں تصور کیا ہے اور جو کوئی یہ پوچھے کہ وہ کس چیز پر برقرار ہے، اس نے کسی جگہ کو اس سے خالی سمجھا ہے، وہ ہمیشہ سے تھا اور کسی چیز سے وجود میں نہیں آیا۔ وہ ایسا وجود ہے کہ جس سے پہلے عدم ہے ہی نہیں۔ اور وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن اس کا قرین ہوکر نہیں اور ہر چیز سے الگ اور غیر ہے، لیکن اس سے بیگانہ اور جدا ہوکر نہیں[2]

امام علی بن الحسین سید الساجدین علیہ السلام صحیفہ سجادیہ میں فرماتے ہیں:۔

الحمد لله الاول بلا اول کان قبله، والآخر بلا آخر یکون بعده الذی قصرت عن رؤیته ابصار الناظرین وعجزت عن نعته اوهام الواصفین

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۶

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱

حمد و ستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے جس کی ہستی مبدأ آفرینش ہے بغیر اس کے کہ اس کی ذاتِ ازلی کی کوئی ابتدا ہو اور وجود میں آخری ہے بغیر اس کے کہ اس حقیقتِ ابدی کے لیے آخر و انتہا کا کوئی تصور ہو سکے۔ کوئی موجود اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسی ذات ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں اسے دیکھنے سے قاصر ہیں اور توصیف کرنے والوں کی عقل و فہم اس کی حمد و ثنا سے عاجز ہے[1]

ہاں خدا کی معرفت اور شناخت ان "عباد اللہ الصالحین" کے مکتب سے حاصل کرنا چاہیے۔ اور اس مدرسہ سے خداشناسی کا سبق پڑھنا چاہیے۔

---

[1] صحیفہ سجادیہ، پہلی دعا

۱۶۱۔ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۙ

۱۶۲۔ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ۙ

۱۶۳۔ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ

۱۶۴۔ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۙ

۱۶۵۔ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۚ

۱۶۶۔ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ

۱۶۷۔ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۙ

۱۶۸۔ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ

۱۶۹۔ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ

۱۷۰۔ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

ترجمہ

۱۶۱۔ تم اور جن کی تم پرستش کرتے ہو۔

۱۶۲۔ تم ہرگز کسی کو (اس سے) دھوکا نہیں دے سکتے۔

۱۶۳۔ مگر وہ، جو خود ہی یہ چاہتے ہیں کہ جہنم کی آگ میں جلیں۔

۱۶۴۔ ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک معلوم مقام ہے۔

۱۶۵۔ اور ہم سب کے سب (خدا کے حکم کی اطاعت کے لیے) صف باندھے کھڑے ہیں۔

۱۶۶۔ اور ہم سب کے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں۔

۱۶۷۔ اور وہ تو ہمیشہ یہی کہتے تھے۔

۱۶۸۔ اگر پہلے لوگوں کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ہمارے پاس ہوتی۔

۱۶۹۔ تو ہم خدا کے مخلص بندوں میں سے ہوتے۔
۱۷۰۔ (لیکن جس وقت یہ عظیم آسمانی کتاب ان کے لیے نازل ہوئی) تو وہ اس سے کافر ہو گئے، لیکن عنقریب وہ اپنے کام کا نتیجہ دیکھ لیں گے۔

تفسیر

جھوٹے دعوے

گذشتہ آیات میں مشرکین کے مختلف معبودوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں بھی وہی مسئلہ جاری ہے اور اس سلسلے میں چند آیات میں ایک ایک مطلب بیان ہو رہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ تم بت پرستوں کے وسوسے کا نیک اور پاک لوگوں کے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا، صرف آلودہ دل اور تمھاری برائی کی طرف مائل ہونے والی دوزخی روحیں ہی ان وسوسوں کو قبول کرتی ہیں۔ فرمایا گیا ہے: تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو..... (فانکم وما تعبدون)۔

"تم ہرگز کسی کو (اس سے) فریب نہیں دے سکتے۔ اور فتنہ و فساد کے ذریعے خدا سے منحرف نہیں کر سکتے (ما انتم علیہ بفاتنین)[1]۔

مگر وہی جو خود یہ چاہتے ہیں کہ جہنم کی آگ میں جلیں (الا من ھو صال الجحیم)۔

مسلک جبر کے طرفداروں نے ان آیات سے جو کچھ سمجھا ہے اس کے برخلاف یہ آیات اس مکتب کے برخلاف ایک دلیل ہے اور اس حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہے کہ کوئی بھی شخص انحرافات کے مقابلے میں اپنے آپ کو معذور نہیں جان سکتا اور یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مجھے دھوکہ دے کر بت پرستی کی طرف لے جایا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: تم بت پرست لوگوں کو "فتنہ اور فریب دینے کی طاقت

---

[1] یہ آیت اور اس سے پہلی آیت اور بعد والی آیت مشہور علماء کے قول کے مطابق ترکیب نحوی کے لحاظ سے اس طرح ہے "ما" "ما تعبدون" کے جملہ میں "ما" موصولہ ہے اور اس کا عطف "ان" کے اسم پر ہے اور "ما انتم علیہ بفاتنین" اس کی خبر ہے اس قید کے ساتھ کہ "ما انتم علیہ" کا "ما" "نافیہ" ہے اور "علیہ" کی ضمیر خدا کی طرف لوٹتی ہے اور اس کا مجموعی نتیجہ یہ بنتا ہے۔

انکم وآلھتکم التی تعبدونھا لا تقدرون علی اضلال احد علی اللہ بسببھا الا من یحترق بنار الجحیم بسوء اختیارہ

بعض دوسرے علماء نے "انکم وما تعبدون" کی آیت کو مستقل جملہ جانا ہے جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم اپنے معبودوں کے ساتھ رہو۔ اس کے بعد والی آیت میں کہتا ہے کہ تم اس کے ذریعے کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے مگر انھی کو جو خود دوزخی ہونا چاہیں۔

نہیں رکھتے ، مگر انھی کو جو خود اپنے ارادے کے ساتھ دوزخ کی راہ اختیار کرلیں ۔

اس بات کا شاہد "صال الجحیم" کی تعبیر ہے ، کیونکہ دراصل "صالی" اسم فاعل کی شکل میں تھا اور عام طور پر جس وقت اسم فاعل کے صیغے کو کسی موجود عاقل کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم کسی کام کو ارادہ و اختیار سے انجام دینا ہے ، مثلاً "قاتل" و "جالس" و "ضارب" اس بنا پر "صال الجحیم" یعنی وہ شخص جو اپنے آپ کو جہنم کی آگ میں جلانے کے لیے آمادہ ہوا اور اس طرح سے تمام انحراف کرنے والوں کے لیے عذر کی راہ بند ہوجاتی ہے ۔

بعض مشہور مفسرین کے بارے میں تعجب ہے کہ انھوں نے آیہ کا اس طرح معنی کیا ہے : "تم کسی کو دھوکہ اور فریب نہیں دے سکتے سوائے ان لوگوں کے جن کا جہنمی ہونا مقدر ہوچکا ہے ۔

واقعاً اگر آیت کا معنی یہ ہے تو پھر پیغمبر کس لیے آتے ہیں ؟ آسمانی کتابیں کس مقصد کے لیے نازل ہوئی ہیں ؟ حساب و کتاب اور قرآن کی آیات میں بت پرستوں کو لعنت و ملامت کا کیا مفہوم ہے ؟ اور خدا کی عدالت کہاں جائے گی ؟

ہاں ! مکتب جبر کا اعتراف کرنے سے اس حقیقت کو قبول کرلینا چاہیے کہ یہ مکتب انبیاء کی اصالت کو کلی طور پر مخدوش کردیتا ہے ، اس کے تمام مفاہیم کو مسخ کردیتا ہے اور تمام الٰہی اور انسانی قدروں کو برباد کردیتا ہے ۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ "صالی" "صلی" (بروزن "سرو") کے مادہ سے آگ جلانے ، آگ میں داخل ہونے یا آگ میں بھونے جانے کے معنی میں ہے اور "فاتنین" "فتنہ" کے مادہ سے "اسم فاعل" فتنہ گر اور گمراہ کرنے والے کے معنی میں ہے ۔

یہ تین آیات جو بت پرستوں کی فتنہ جوئی اور گمراہ کن حرکتوں کے مقابلہ میں انسانوں کے مسئلہ اختیار کو واضح کرتی ہیں ، ان کے بعد تین آیات میں فرشتوں کے بلند و بالا مقام کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ، وہی فرشتے جنھیں بت پرست خدا کی بیٹیاں خیال کرتے ہیں اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ گفتگو کو خود انھی کے زبان سے بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے : ہم میں سے ہر ایک کا ایک معلوم مقام ہے (وما منّا الّا لہ مقام معلوم)۔[1]

اور ہم سب فرمانِ خدا کی اطاعت کے لیے صف بستہ کھڑے ہیں اور اس کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار رہتے ہیں (و انّا لنحن الصّافّون)۔

اور ہم سب کے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کو ان چیزوں سے جو اس کی پاک ذات کے لائق نہیں ہیں ، منزہ شمار کرتے ہیں (و انّا لنحن المسبّحون)۔

ہاں ! ہم تو وہ بندے ہیں ، جو دل و جان کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں ، ہماری آنکھیں اور کان اس کے فرمان پر لگے ہوئے ہیں ۔

---

[1] بعض روایات جو اہل بیتؑ کے طریقے سے وارد ہوئی ہیں ، میں یہ تفسیر بیان کی گئی ہے کہ اس سے مراد آئمہ معصومینؑ ہیں ممکن ہے یہ تفسیر آئمہ کے مقام کی فرشتوں کے ساتھ تشبیہ کے عنوان سے ہو یعنی جس طرح وہ معین و معلوم مقامات اور فرائض اور ذمہ داریاں رکھتے ہیں ۔ اسی طرح ہم بھی ہیں ۔

ہم کہاں اور خدا کا بیٹا ہونا کہاں ؟ ہم اسے ان قبیح اور جھوٹی نسبتوں سے پاک اور منزہ سمجھتے ہیں اور ہم مشرکین کے ان خرافات اور اوہام سے متنفر اور بیزار ہیں ۔

حقیقت میں یہ تین آیات فرشتوں کی صفات کے تین حصوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔

پہلا یہ کہ ان میں سے ہر ایک ، ایک مرتبہ و منزلت رکھتا ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتا ۔

دوسرا یہ کہ فرشتے عرصۂ آفرینش میں اور وسیع عالم ہستی میں اوامرِ خداوندی کے اجراء کے سلسلے میں ہمیشہ فرمانِ خدا کی اطاعت کے لیے آمادہ و تیار رہتے ہیں ۔ یہ بات اس چیز سے مشابہ ہے جو سورۂ انبیاء کی آیہ ۲۶ ، ۲۷ میں آئی ہے کہ :

بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول و ھم بامرہ یعملون

وہ خدا کے اچھے بندے ہیں جو بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان پر عمل کرتے ہیں ۔

تیسرا یہ کہ وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کو اس چیز سے جو اس کے مقام کے لائق نہیں ہے ، منزہ شمار کرتے ہیں ۔

چونکہ ان دونوں جملوں (انا لنحن الصافون و انا لنحن المسبحون) کا عربی ادب کے لحاظ سے مفہوم "حصر" ہے ، لہٰذا بعض مفسرین نے اس سے یہ مطلب لیا ہے کہ فرشتے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صرف ہم خدا کے حکم کے مطیع ہیں اور اس کی حقیقی تسبیح کرنے والے بھی ہم ہی ہیں ۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بنی آدم کی اطاعت و تسبیح فرشتوں کے کام کے مقابلے میں کوئی اہم چیز نہیں ہے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے ان آیات کے ذیل میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا :۔

مافی السماوات موضع شبر الا و علیہ ملک یصلی و یسبح

تمام آسمانوں میں ایک بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں پر کوئی فرشتہ نماز اور خدا کی تسبیح میں مصروف نہ ہو[1]

ایک دوسری روایت میں یہی معنی ایک دوسری صورت میں بیان ہوا ہے :۔

مافی السماء موضع قدم الا علیہ ملک ساجد او قائم

تمام آسمانوں میں ایک قدم رکھنے کی جگہ بھی ایسی نہیں ہے کہ جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ حالتِ سجدہ یا قیام میں نہ ہے[2]

ایک اور روایت میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے ایک دن اپنے اصحاب سے جو آپ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے ، فرمایا :۔

---

[1] ، [2] تفسیر قرطبی جلد ۸ ، ص ۵۸۱۵

اطت السماء وحق لها ان تأط ! ليس فيها موضع قدم الا عليه ملك راكع او ساجد، ثم قرأ و انا لنحن الصافون و انا لنحن المسبّحون

آسمان نے (اپنے بار کی سنگینی سے) فریاد کی۔ اور وہ حق رکھتا ہے کہ نالہ و فریاد کرے کیونکہ اس میں ایک قدم رکھنے کی بھی جگہ ایسی نہیں جس پر کوئی نہ کوئی فرشتہ حالتِ رکوع میں یا حالتِ سجود میں نہ ہو۔ پھر آپؐ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی و انا لنحن الصافون.....[1]

یہ گوناگوں تعبیریں اس بات کی طرف ایک لطیف کنایہ ہیں کہ عالمِ ہستی پروردگار کے فرماں برداروں اور اس کی تسبیح کرنے والوں سے معمور ہے۔

اس کے بعد زیرِ بحث آخری چار آیتوں میں اسی بُت پرستی سے مربوط اور کچھ دوسرے مطالب کے لیے ان مشرکین کے ایک اور رنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن جواب دیتا ہے اور فرماتا ہے: وہ ہمیشہ کہتے تھے..... (و ان كانوا ليقولون)۔[2]

اگر ہمارے پاس پہلے لوگوں کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ہوتی ..... (لو انّ عندنا ذكرًا من الاوّلين)۔

تو ہم خدا کے مخلص بندوں میں سے ہوتے (لكنّا عباد الله المخلصين)۔

ان سب مخلص بندوں اور جنہیں خدا نے خالص کیا ہے، ان کے بارے میں گفتگو نہ کر۔ نوحؑ، ابراہیمؑ اور موسیٰؑ جیسے بزرگ پیغمبروں کو ہمارے سامنے پیش نہ کر۔ اگر ہمارے اوپر بھی لطفِ خدا ہوتا اور ہم پر بھی کوئی آسمانی کتاب نازل ہوئی ہوتی، تو ہم بھی ان ہی مخلص بندوں کے زمرے میں ہوتے۔

یہ بعینہٖ پیچھے رہ جانے والے اور فیل ہو جانے والے طالب علموں کی مانند گفتگو ہے، جو اپنی سستی پر پردہ ڈالنے کے لیے کہا کرتے ہیں کہ اگر ہمارا بھی کوئی اچھا استاد ہوتا تو ہم بھی اول آنے والے طالب علموں میں سے ہوتے۔

بعد والی آیت کہتی ہے کہ ان کی یہ آرزو بھی اب عملی جامہ پہن چکی ہے اور خدا کی عظیم ترین آسمانی کتاب قرآن مجید ان کے لیے نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ غلط دعوے کرنے والے جھوٹے اس سے کافر ہو گئے ہیں اور اس کی مخالفت انکار اور دشمنی پر

---

[1] در المنثور سے المیزان جلد ۱۷ ص ۱۸۸ پر نقل کیا گیا ہے۔

[2] "ان" یہاں پر مشقلہ سے مخففہ ہے یہ تقدیر میں اس طرح تھا "و انهم كانوا ليقولون"

تُل گئے ہیں لیکن وہ جلد ہی اپنے کام کا نتیجہ جان لیں گے (فکفروا به فسوف یعلمون)۔[1]

یہ لاف وگزاف کی باتیں نہ کرو اور اپنے آپ کو خدا کے مخلص بندوں کی صف میں شامل ہونے کے لائق شمار نہ کرو، تمھارا جھوٹ واضح ہوچکا ہے اور تمھارے دعوے کھوکھلے نکلے ہیں۔ قرآن سے بہتر کسی کتاب کا تصور نہیں ہوسکتا اور کوئی مکتب اسلام جیسے تربیتی مکتب سے بہتر نہیں ہے۔ لیکن اب تم خود ہی دیکھ لو کہ تم نے اس آسمانی کتاب کا کس طرح استقبال کیا ہے۔ لہٰذا اپنے کفر و بے ایمانی کے دردناک انجام کے منتظر رہو۔

---

[1] یہ جملہ حقیقت میں ایک محذوف رکھتا ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: "فلما اتاهم الکتاب و هو القرآن کفروا به فسوف یعلمون عاقبة کفرهم" جب قرآن ایسی کتاب ان کے پاس آگئی تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا اور کافر ہوگئے۔ عنقریب انھیں اپنے کفر کا انجام معلوم ہوجائے گا۔

۱۷۱۔ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ○ ج صلے

۱۷۲۔ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ ○ ص

۱۷۳۔ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ○

۱۷۴۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ○ ل

۱۷۵۔ وَأَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ○

۱۷۶۔ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ○

۱۷۷۔ فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنذَرِينَ ○

ترجمہ

۱۷۱۔ ہمارے مرسل بندوں کے لیے ہمارا قطعی وعدہ پہلے سے مسلّم ہو چکا ہے۔

۱۷۲۔ کہ ان کی مدد کی جائے گی۔

۱۷۳۔ اور ہمارا لشکر (تمام میدانوں میں) کامیاب ہوگا۔

۱۷۴۔ ان سے ایک معیّن وقت تک منہ پھیر لے (جب تک جہاد کا فرمان صادر نہیں ہوتا)۔

۱۷۵۔ اور ان کی حالت کی طرف دیکھ (کتنی بے معنی ہے) لیکن وہ عنقریب (اپنے کیے کا نتیجہ) دیکھ لیں گے۔

۱۷۶۔ کیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں؟

۱۷۷۔ لیکن جب ہمارا عذاب ان کے گھروں کے صحن میں نازل ہوگا تو (ان لوگوں کے لیے) جنھیں ڈرایا گیا ہے، وہ بُری صُبح ہوگی۔

تفسیر

اللہ کا گروہ کامیاب ہے

عظیم انبیاء کی جدوجہد اور بے ایمان مشرکین کی کارشکنیوں کے سلسلے میں ان گوناگوں مباحث کے بعد، جو اس سورہ کی آیات میں

بیان ہوئی ہیں۔ اب جبکہ ہم اس سورہ کی آخری آیات کے قریب ہو رہے ہیں تو اس سے مربوط اہم ترین مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے اور خاتمہ بالخیر کو اعلیٰ ترین صورت میں پیش کیا جا رہا ہے اور وہ خدا کے لشکر کی شیطان اور دشمنانِ حق کے لشکر پر مکمل فتح کی خبر ہے تاکہ وہ تھوڑے سے مومنین جو ان آیات کے نزول کے وقت مکہ میں دشمنانِ اسلام کی سختی اور دباؤ کا شکار تھے اور اسی طرح ہر عصر اور ہر زمانہ کے تمام محروم مومنین، خدا کے اس عظیم وعدے سے مطمئن ہو جائیں اور یاس و ناامیدی کا گرد و غبار اپنے قلب و روح سے دھو ڈالیں اور باطل کے لشکر کے ساتھ مقابلہ جاری رکھنے کے لیے آمادہ رہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: ہمارے مرسل بندوں کے ساتھ ہمارا قطعی وعدہ پہلے سے مسلّم ہو چکا ہے (و لقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین)۔

کہ ان کی مدد و نصرت کی جائے گی (انّھم لھم المنصورون)۔

اور ہمارے لشکر تمام میدانوں میں کامیاب ہوں گے (وانّ جندنا لھم الغالبون)۔

کتنی صریح اور منہ بولتی عبارت ہے اور کتنا روح پرور اور امید بخش وعدہ ہے۔

ہاں! حق کے لشکر کی باطل پر کامیابی اور اللہ کے لشکر کا غلبہ اور مرسل اور مخلص بندوں کے لیے خدا کی مدد و نصرت، اس کے مسلم اور یقینی وعدوں اور قطعی سنتوں میں سے ہے، جو ان آیات میں "سبقت کلمتنا" (ہمارا یہ وعدہ اور یہ سنت ابتدا سے تھی) کے انداز میں پیش ہوئی ہے۔

قرآن مجید کی دوسری بہت سی آیات میں بھی ان مطالب کی نظیر موجود ہے۔ سورۂ روم کی آیہ ۴۷ میں بیان ہوا ہے۔

و کان حقّا علینا نصر المؤمنین

مؤمنین کی مدد کرنا ایسا حق ہے جو ہم پر مسلّم ہے۔

نیز سورۂ حج کی آیہ ۴۰ میں بیان ہوا ہے۔

و لینصرنّ اللہ من ینصرہ

خدا ہر اس شخص کی ضرور مدد کرے گا جو اس کے دین و آئین کے لیے اُٹھے گا۔

اور سورۂ مؤمن کی آیہ ۵۱ میں یہ بیان ہوا ہے:۔

انّا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد

ہم اپنے رسولوں کی اور صاحبِ ایمان کی۔ دنیا کی زندگی میں بھی مدد کریں گے اور (قیامت کے دن) جب حق کی گواہی دینے والے قیام کریں گے اس دن بھی مدد و نصرت کریں گے۔

سورۂ مجادلہ کی آیہ ۲۱ میں تو پوری قاطعیت اور دو ٹوک فیصلے کے طور پر اس غلبے اور کامیابی کے بارے میں ایک قطعی سنت کے طور پر گفتگو کی گئی ہے۔

کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی

خدا نے مقرر کر دیا ہے (اور لکھ دیا ہے) کہ میں اور میرے رسول قطعی طور پر غالب ہو کے رہیں گے۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ خدا جو ہر چیز پر قادر ہے اور جس کے وعدوں میں نہ تخلف تھا اور نہ ہے، وہ اپنے اس عظیم وعدے کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے اور عالم ہستی کی دوسری تخلف ناپذیر سنتوں کی طرح مردانِ حق کو بے کم و کاست کامیاب کر سکتا ہے۔

یہ خدائی وعدہ ان اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے جس کی وجہ سے راہِ حق کے راہ رو مطمئن اور دل گرم رہتے ہیں۔ اور اس سے روحِ تازہ حاصل کرتے ہیں۔ جس وقت تھک جاتے ہیں تو اس کے ذریعے تازہ دم ہو جاتے ہیں اور نیا خون ان کی رگوں میں جاری ہونے لگتا ہے۔

ایک اہم سوال

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر خدا کی مشیت و ارادہ میں پیغمبروں کی مدد و نصرت اور مومنین کی کامیابی مقرر ہو چکی ہے تو ہم بشر کی بھرپور تاریخ میں کئی پیغمبروں کو بشارت پر فائز ہوتے ہوئے مشاہدہ کیوں کرتے ہیں اور مومنین کے کئی گروہ شکست سے دوچار کیوں ہوئے؟ اگر یہ تخلف ناپذیر سنتِ الٰہی ہے تو پھر یہ استثنائات کس بنا پر ہیں؟

ہمارا جواب

اوّلاً: کامیابی ایک وسیع معنی رکھتی ہے اور ہمیشہ دشمن پر ظاہری اور جسمانی غلبہ کے معنی میں نہیں ہوتی۔ بعض اوقات مکتب اور نظریے کی کامیابی کو بھی کامیابی ہی کہتے ہیں اور اہم ترین کامیابی یہی ہے۔ فرض کریں کہ پیغمبر اسلامؐ کسی جنگ میں شہید ہو جاتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا دین ساری دنیا میں پھیل گیا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس شہادت کو شکست سے تعبیر کریں؟

اس سے بھی واضح روشن مثال یہ ہے کہ امام حسینؑ اور آپ کے انصار نے کربلا کے میدان میں واقعاً شربتِ شہادت نوش کیا، لیکن ان کا ہدف و مقصد یہ تھا کہ بنی امیہ کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کر دیں کہ جو ظاہر میں تو پیغمبر اکرمؐ کی خلافت کے مدعی تھے لیکن حقیقت میں اسلامی معاشرے کو زمانۂ جاہلیت کی طرف واپس لوٹانا چاہتے تھے اور وہ اس عظیم ہدف و مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ آپ نے مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا اور اسلام کو مٹنے سے بچا لیا۔ تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کربلا میں مغلوب ہو گئے؟

اہم بات یہ ہے کہ انبیاء اور جنودِ الٰہی یعنی مومنین، حق کے دشمنوں کی تمام متواتر و منظم کوششوں کے باوجود، اس بات پر قادر ہو سکے کہ اپنے اہداف و مقاصد کو دنیا میں آگے بڑھائیں اور زیادہ سے زیادہ پیروکار پیدا کر سکیں اور اپنے مکتبی راستے کو دوام دے سکیں اور ان تمام طوفانوں کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں، یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں دنیا کے اکثر لوگوں کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کر لیں۔

کامیابی کی ایک اور قسم بھی ہے جو دشمن کے مقابلہ میں صدیوں کے دوران میں تدریجی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ کبھی ایک نسل میدان میں آتی ہے اور کامیاب نہیں ہوتی لیکن آئندہ آنے والی نسلیں ان کے کام کو آگے بڑھاتی ہیں اور کامیابی سے ہم کنار ہو جاتی ہیں (مثلاً دو سو سال کے بعد لشکرِ اسلام کی صلیبیوں کے لشکر پر کامیابی) یہ کامیابی بھی سب کی کامیابی سمجھی جائے گی۔

ثانیاً اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خدا کا مؤمنین کے لیے غلبہ کا وعدہ ایک مشروط وعدہ ہے نہ کہ مطلق اور اس حقیقت کی طرف توجہ نہ کرنے سے ہی بہت سے اشتباہات پیدا ہوتے ہیں۔

کیونکہ زیر بحث آیات میں لفظ "عبادنا" (ہمارے بندے) اور "جندنا" (ہمارا لشکر) یا اسی قسم کی دوسری تعبیریں جو اس سلسلے میں قرآن کی دوسری آیات میں آئی ہیں مثلاً "حزب اللہ" "والذین جاھدوا فینا" "ولینصرن اللہ من ینصرہ" اور اسی قسم کی دوسری تعبیریں سب کی سب کامیابی کی شرائط کے لیے ایک واضح دلیل ہیں۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ نہ تو ہم مجاہد مؤمن بنیں اور نہ ہی مخلص لشکر، اور اس حال میں حق و عدالت کے دشمنوں پر غالب آجائیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ خدا کی راہ میں شیطانی افکار اور پروگراموں کے ساتھ پیش رفت کریں۔ اس کے بعد تعجب کرتے ہیں کہ ہم دشمنوں سے مغلوب کیوں ہو گئے۔ تو کیا ہم نے اپنے وعدوں پر عمل کیا ہے کہ خدا سے اس کے وعدوں کے ایفا کا مطالبہ کر رہے ہیں؟

جنگِ اُحد میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں سے کامیابی کا وعدہ کیا تھا اور جنگ کے پہلے مرحلے میں کامیاب ہوئے بھی لیکن ایک گروہ جنگ کا مالِ غنیمت جمع کرنے، تفرقہ و نفاق پیدا کرنے اور فرمانِ رسولؐ کو چھوڑ دینے کی فکر میں پڑ گیا اور جنگ کے آغاز میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس کی اور درۂ احد کی حفاظت میں کوتاہی کی اور یہی امر اس جنگ میں انکی شکست کا سبب بن گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گروہ جو اپنے آپ کو کامیابی کا طلب گار سمجھتا تھا، پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آیا اور مخصوص لب و لہجہ میں عرض کی کہ کامیابی کا وہ وعدہ کیا ہوا؟

قرآن نے انھیں بہت ہی عمدہ جواب دیا جو ہماری گفتگو کا گواہ ہے۔ فرمایا:۔

ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونھم باذنہ حتّٰی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الاٰخرۃ ثم صرفکم عنھم لیبتلیکم ولقد عفا عنکم واللہ ذو فضل علی المؤمنین

خدا نے (اُحد میں دشمن پر کامیابی کا) تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔ اس وقت (جب ابتداءِ جنگ میں) تم دشمنوں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے اور یہ کامیابی اسی طرح برقرار رہی، یہاں تک کہ تمھی سُست پڑ گئے اور اپنے کام میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔ اور جب (تم نے اپنے مطلوب کو پالیا اور) جو کچھ تم پسند کرتے تھے وہ خدا نے تمھیں دکھا دیا، تو تم نے نافرمانی کی۔ تم میں سے بعض تو دنیا کے طالب تھے اور بعض آخرت کے چاہنے والے تھے (اس کے باوجود اس نے تمھیں مکمل شکست سے

نجات دی) اور انھیں تم سے منصرف کر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے اور تمھیں اپنے عفو سے نوازا اور خدا مومنین کے لیے صاحب فضل و بخشش ہے۔ (آلِ عمران ـــــ ۱۵۲)

"فشلتم" (تم کمزور پڑ گئے)

"تنازعتم" (ایک دوسرے سے جھگڑنے اور نزاع و اختلاف کرنے لگے)

"عصیتم" (تم نے نافرمانی کی)

یہ ایسی تعبیریں ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انھوں نے خدا کی مدد اور دشمن پر کامیابی کی شرائط کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل نہ کر سکے۔

ہاں! خدا نے ہرگز یہ وعدہ نہیں کیا کہ جس شخص نے اپنا نام مسلمان اور مجاہدِ اسلام رکھ لیا اور "جنداللہ" اور "حزب اللہ" کا دم بھرنے لگا وہ ہر میدان میں دشمن پر غلبہ حاصل کرے گا۔ بلکہ یہ خدائی وعدہ تو ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو دل و جان سے رضائے خدا کے خواہاں ہیں اور عملی لحاظ سے اس کے فرمان پر چلتے ہیں اور تقویٰ و امانت کو نہیں بھولتے۔

اس سوال و جواب کی نظیر، ہم نے "دعا" اور "خدا" کے وعدہ "اجابت" کے بارے میں بھی بیان کی ہے[1]

اس کے بعد ان آیات کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کی دلجوئی اور کامیابی کی تاکید کے لیے بھی اور بے خبر مشرکین کی تنبیہ و تہدید کے لیے بھی فرمایا گیا ہے: ان سے منہ پھیر لے، اور انھیں ایک معین وقت تک کے لیے ان کی حالت پر چھوڑ دے (فتولّ عنھم حتّٰی حین)۔

یہ ایک پُر معنی اور ہول انگیز تہدید ہے جس کا سرچشمہ مکمل کامیابی کا اطمینان ہے، خصوصاً "حتّٰی حین" (ایک مدت تک) کی تعبیر اجمالی اور سربستہ صورت میں ادا ہوئی ہے۔ لیکن کتنی مدت تک؟ ہجرت کے زمانے تک؟ جنگِ بدر کے موقع تک؟ فتح مکہ تک؟ یا اس زمانے تک کہ ان دل کے اندھوں کے خلاف، مسلمانوں کے لیے مکمل اور عمومی قیام کے حالات فراہم ہوں۔ یہ بات دقیقاً معلوم نہیں ہے۔

اس تعبیر کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتی ہے، کبھی کہتا ہے:

فأعرض عنھم و توکّل علی اللہ

ان سے رُخ پھیر لے اور خدا پر توکل کر (نساء ـــــ ۸۱)

دوسری جگہ کہتا ہے:

قل اللہ ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون

کہو اللہ، پھر انھیں چھوڑ دو کہ اپنے جھوٹ کے ساتھ کھیلتے رہیں (انعام ـــــ ۹۱)

اس کے بعد اس جملے کی ایک دوسری تہدید کے ساتھ تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کی حالت کی طرف دیکھ (ان کی

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ آیہ ۱۸۶ کے ذیل میں رجوع کریں۔

ہٹ دھرمیاں، ان کے جھوٹ، ان کی خرافات اور سرکشیاں کتنی بے کار اور فضول ہیں لیکن وہ جلد ہی اپنے کارِ بد کا انجام دیکھ لیں گے (و ابصرھم فسوف یبصرون)۔

وہ بہت جلد اسی دنیا میں تیری اور مومنین کی کامیابی اور اپنی ذلت آمیز شکست اور دوسرے جہان میں خدا کا عذاب دیکھیں گے۔

اور چونکہ یہ بے شرم سرکش یہی کہتے رہتے تھے، کہ عذابِ الٰہی کا وہ وعدہ کیا ہوا، اور اگر تو سچ کہتا ہے تو پھر دیر کیوں کر رہا ہے؟ تو قرآن تہدید آمیز لہجے میں ان کے جواب میں کہتا ہے: کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں؟ کبھی کہتے ہیں "متی ھٰذا الوعد (یہ وعدہ الٰہی کب پورا ہوگا) اور کبھی یہ کہتے ہیں" متی ھٰذا الفتح " (یہ کامیابی کب حاصل ہوگی) ۔ افبعذابنا یستعجلون)۔

لیکن جب ہمارا عذاب ان کے گھر کے صحن میں اُترے گا اور ان کے دن تیرہ و تاریک ہو جائیں گے تو اس دن انھیں سمجھ آئے گی کہ جنھیں ڈرایا گیا تھا ان کی صبح کتنی بُری اور خطرناک ہے (فاذا نزل بساحتھم فساء صباح المنذرین)[1]۔

"ساحۃ" (گھر کا صحن اور گھروں کے اندر کی فضا) کی تعبیر اس لیے ہے تاکہ نزولِ عذاب کو ان کی زندگی کے اندر مجسم کر دیا جائے اور ان کے آرام و سکون کے مرکز کے وحشت و اضطراب کے مرکز میں بدل جانے کی نشان دہی کر دی جائے۔

"صباح المنذرین" (ڈرائے گئے لوگوں کی صبح) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس ہٹ دھرم اور ستم گر قوم پر خدا کا عذاب ـــــ بہت سی گزشتہ اقوام کی طرح ـــــ صبح کے وقت نازل ہوگا۔

یا یہ اس معنی میں ہے کہ سارے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی صبح خیر و خوبی کے ساتھ شروع ہو، لیکن ان کے سامنے بُری اور تیرہ تار صبح ہے۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح بیداری کا وقت ہوتا ہے یہ بھی اس وقت بیدار ہوں گے کہ جب نجات کی کوئی راہ باقی نہیں رہے گی اور پانی سر سے اونچا ہو گیا ہوگا۔

---

[1] اس جملے میں کچھ محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے" فساء الصباح صباح المنذرین " (منذرین کی صبح بُری صبح ہے)

۱۷۸۔ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۙ
۱۷۹۔ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ
۱۸۰۔ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ
۱۸۱۔ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ
۱۸۲۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ

ترجمہ

۱۷۸۔ ایک معیّن وقت تک ان سے منہ پھیر لے۔
۱۷۹۔ اور ان کے کام کی حالت کو دیکھ، وہ بھی جلد ہی (اپنے اعمال کا نتیجہ) دیکھ لیں گے۔
۱۸۰۔ تیرا پروردگار، پروردگارِ عزّت و قدرت ان توصیفوں سے جو وہ کرتے ہیں، پاک و منزّہ ہے۔
۱۸۱۔ اور سلام ہے رسولوں پر
۱۸۲۔ اور حمد و ستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے جو عالمین کا پروردگار ہے

تفسیر

ان کا اعتناء نہ کر!

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی آخری آیات پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کی دلجوئی کے لیے ایک وسیلہ و ذریعہ ہیں اور ہٹ دھرم کفار کے لیے ایک تہدید ہیں۔
زیر بحث دو آیتیں تو وہی ہیں جو پہلے بھی آچکی ہیں اور یہاں پر تاکید کے لیے دہرائی گئی ہیں۔ تہدید آمیز لہجے میں فرمایا گیا ہے: ان سے منہ پھیر لے اور انھیں ایک مدّت معیّن تک ان کی حالت پر چھوڑ دے (و تولّ عنهم حتّى حين)۔

ان کی ہٹ دھرمی، انحراف اور تکذیب و انکار کو دیکھ، وہ بھی جلد ہی اپنے کام کے نتیجہ کو دیکھ لیں گے (و ابصر فسوف يبصرون)۔
جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ تکرار تاکید کے لیے ہے تاکہ وہ یہ بات جان لیں کہ یہ ایک قطعی مسئلہ ہے کہ وہ جلد ہی

اپنی سزا، شکست اور ناکامی کو دیکھ لیں گے اور اپنے اعمال کے تلخ نتائج میں گرفتار ہوں گے اور مومنین کی کامیابی قطعی اور مسلّم ہے۔

یا یہ اس بنا پر ہے کہ پہلے تو انھیں دنیاوی سزا اور عذاب کی تہدید کی گئی ہے اور دوسری مرتبہ آخرت میں خدائی سزا و عذاب کی دھمکی ہے۔

اس کے بعد سورہ کو "خداوند تعالیٰ"، "پیغمبروں" اور "عالمین" کے بارے میں تین پُر معنی جملوں کے ساتھ ختم کیا گیا ہے۔

فرمایا گیا ہے: تیرا پروردگار، پروردگارِ عزت و قدرت ان بے بنیاد توصیفوں سے، جو جاہل و مشرک لوگ کرتے ہیں، پاک و منزّہ ہے (سبحان ربّك ربّ العزة عمّا یصفون)۔

کبھی فرشتوں کو اس کی بیٹیاں کہتے ہیں، کبھی اس کے اور جنوں کے درمیان رشتہ داری جوڑتے ہیں اور کبھی پتھروں اور لکڑی جیسی بے قدر و قیمت موجودات کو اس کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔

عزت (مطلق و شکست ناپذیر قدرت) حقیقت میں ان تمام خیالی معبودوں پر خطِ بطلان کھینچنے کے معنی میں ہے۔

اس سورہ کی آیات میں کبھی "عباد اللہ المخلصین" کی تسبیح و تنزیہ کا ذکر ہے اور کبھی فرشتوں کی تسبیح کا تذکرہ اور یہاں خود خدا کی ذاتِ پاک کے بارے میں خدا کی تسبیح و تنزیہ کا ذکر ہے۔

دوسرے جملے میں اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کے لیے اپنے بے پایاں لطف و کرم کا اظہار فرماتے ہوئے کہتا ہے، تمام رسولوں پر سلام ہو (وسلام علی المرسلین)۔

وہ سلام جو قیامت کے دن ہر قسم کے عذاب و سزا سے سلامتی و عافیت کی نشانی ہے۔ وہ سلام جو شکستوں کے مقابلہ میں امان اور دشمنوں پر کامیابی کی دلیل ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس سورہ کی آیات میں بہت سے پیغمبروں پر الگ الگ سلام بھیجا گیا ہے۔ آیہ ۷۹ میں فرمایا گیا ہے:۔

سلام علی نوح فی العالمین

اور آیہ ۱۰۹ میں فرمایا گیا ہے:

سلام علی ابراھیم

اور آیہ ۱۲۰ میں ہے:۔

سلام علی موسیٰ وھارون

اور آیہ ۱۳۰ میں ہے:۔

سلام علیٰ ال یاسین

لیکن یہاں پر ان تمام سلاموں اور ان کے علاوہ دوسروں کو ایک ہی جملے میں خلاصہ کرکے اور یکجا طور پر فرمایا گیا ہے: سب رسولوں پر سلام۔

اور بالآخر گفتگو کے آخری جملے کو حمد الٰہی پر ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: حمد و ستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے جو عالمین کا پروردگار ہے (والحمد للہ رب العالمین)۔

آخری تین آیات ہو سکتا ہے اس سورہ کے تمام مسائل پر ایک اجمالی نظر اور اشارہ ہو۔ کیونکہ اس سورہ کا اہم حصہ توحید اور شرک کی مختلف اقسام سے مقابلہ کے سلسلہ میں تھا اور پہلی آیت سب مشرکین کی تمام توصیفوں سے خدا کی تسبیح و تنزیہ کر رہی ہے۔

اس سورہ کا دوسرا حصہ سات عظیم پیغمبروں کے حالات کے کچھ گوشوں کا بیان تھا، دوسری آیہ انھیں کی طرف اشارہ ہے۔

اور آخر میں تیسرا حصہ خدا کی نعمتوں خصوصاً بہشت کی طرح طرح کی نعمتوں اور خدا کے لشکروں کی کفر کے لشکر پر کامیابی کے بارے میں تھا۔ لہٰذا آخر میں خدا کی حمد و ستائش ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسرین نے اس سورہ کی ان آخری تین آیات کی ایک اور تحلیل کی ہے، جو یہ ہے:۔

اہم ترین مسائل جو انسان کو اپنی طرف متوجہ رکھتے ہیں، وہ تین چیزوں کی معرفت ہے۔ پہلی چیز بشر کی طاقت کے مطابق خداوند عالم کی معرفت اور آخری کام جو انسان اس سلسلے میں انجام دے سکتا ہے۔ وہ تین امر ہیں:۔

اسے ان چیزوں سے پاک و منزہ جاننا جو اس کے مقام کے لائق نہیں ہیں۔ یہ مفہوم "سبحان" کے لفظ میں موجود ہے اور اس کی تمام صفات کمال کے ساتھ توصیف جس کی طرف لفظ "رب" میں اشارہ ہوا ہے، جو خدا کی حکمت و رحمت اور موجودات کی مالکیت و پرورش کی دلیل ہے۔

اور ہر قسم کے شریک و نظیر سے منزہ ہونا، اس کا مفہوم "عما یصفون" کے جملہ میں آیا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ انسانوں کی زندگی میں نقائص کو دور کرنا ہے جو خدائی رہبروں اور آسمانی ہادیوں کے بغیر ممکن نہیں ہے اور "سلام علی المرسلین" کا جملہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

تیسرا اہم مسئلہ انسانی زندگی کا یہ ہے کہ وہ یہ جانے کہ مرنے کے بعد اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہاں پر "رب العالمین" کی نعمتوں کی طرف توجہ اور اس کا مقام غنا اور رحمت و لطف، انسان کو آرام و سکون بخشتا ہے۔ والحمد للہ رب العالمین [1]

---

[1] تفسیر کبیر، فخر رازی، جلد ۲۶ ص ۱۷۲

ہر کام کے آخر میں سوچنے کی بات

متعدد روایات میں جو پیغمبر گرامی اسلامؐ، امیرالمؤمنینؑ اور امام باقرؑ سے منقول ہوئی ہیں، یہ آیا ہے:۔

من اراد ان یکتال بالمکیال الاوفی (من الاجر یوم القیامة) فلیکن آخر کلامه فی مجلسه سبحان ربك رب العزة عمّا یصفون وسلام علی المرسلین والحمد لله رب العالمین

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ قیامت کے دن اس کو اجر بڑے اور کامل پیمانہ سے دیا جائے گا تو وہ جس مجلس میں بھی بیٹھے اس کی آخری گفتگو یہ ہونی چاہیے "سبحان ربك رب العزة عمّا یصفون وسلام علی المرسلین والحمد لله رب العالمین"[1]

ہاں! اپنی مجلس کو ذاتِ خدا کی تنزیہ اور اس کے پیغمبروں پر درود بھیجنے اور پروردگار کی نعمتوں پر حمد و شکر کے ساتھ ختم کرنا چاہیے، تاکہ اگر اس مجلس میں اس سے کوئی غلط کام یا ناروا گفتگو سرزد ہوگئی ہو تو اس کی تلافی ہو جائے۔

کتاب توحید صدوق میں اس طرح آیا ہے کہ:۔

"شام کا ایک عالم امام باقرؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں آپ سے ایک مسئلے کے بارے میں سوال کرنے آیا ہوں، جس کے متعلق اب تک کسی نے میرے لیے درست وضاحت نہیں کی۔ میں نے تین گروہوں سے سوال کیا ہے اور ہر کسی نے دوسرے کے برخلاف جواب دیا ہے"۔

امام باقرؑ نے فرمایا: "تیرا مسئلہ کیا ہے"؟

اس نے عرض کیا: میرا سوال یہ ہے کہ پہلی چیز جو خداوند تعالیٰ نے خلق فرمائی تھی وہ کیا تھی؟ بعض نے تو مجھے یہ جواب دیا ہے کہ وہ "قدرت" تھی اور بعض نے کہا "علم" تھا اور بعض نے کہا "روح" تھی۔

آپؑ نے فرمایا:۔

کسی نے بھی تجھے صحیح جواب نہیں دیا۔ اب میں تجھے بتاتا ہوں کہ ابتداء میں خدا تھا اور اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ قادر و عزیز تھا اور ابھی عزت پیدا نہیں ہوئی تھی (وہ اپنی ذات پاک میں قدرت بھی رکھتا تھا اور علم بھی بغیر اس کے کہ علم و قدرت کی آفرینش کا محتاج ہو) پھر مزید فرمایا: یہ وہی چیز ہے کہ جو خدا فرماتا ہے "سبحان ربك رب العزة عمّا یصفون"[2]

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں، اصل کافی اور "من لا یحضره الفقیه" (تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۰ کے مطابق)

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۰

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ادھر ادھر لوگوں نے جو تجھ سے باتیں کی ہیں وہ شرک آلود باتیں ہیں کہ جن کا جواب اس آیت میں موجود ہے۔ یعنی خدا ازل سے ہی قادر و عالم و عزیز ہے۔

پروردگارا! تو نے خود وعدہ کیا ہے کہ اپنے رسولوں کی مدد اور اپنے لشکروں کو کامیاب کرے گا۔ ہمیں رسولوں کا پیرو اور اپنے لشکروں میں قرار دے اور ہمیں ان خونخوار دشمنوں پر کامیاب فرما کہ جو عالم کے مشرق و مغرب سے قرآن کے نور کو خاموش کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

بارِ الٰہا! ہمیں ہر قسم کے شرک میں آلودہ ہونے سے اور توحید کے راستے سے انحراف کرنے سے محفوظ فرما۔

خداوندا! جو مشکلات انبیاء و مرسل کو تاریخ میں شرک و کفر کے لشکر کے مقابلے میں درپیش تھیں وہی اس وقت ہمارے اسلامی معاشرے کے سامنے پیدا ہو چکی ہیں۔ وہی سلام جو پیغمبرانِ مرسل کی سلامتی کا باعث تھا ان معرکوں میں ہمارے شاملِ حال فرما۔

آمین یا رب العالمین

سورۂ صافات کا اختتام

جمعہ ۲۲ ماہ مبارک رمضان ۱۴۰۴ھ

(اوّل تیر ماہ ۱۳۶۳ھ)

سُورَۂ صٓ

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہُوئی
اس کی ۸۸ آیات ہیں

سورۂ "ص" کے مضامین

یہ سورہ حقیقت میں سورہ "صافات" کے مضامین ہی کا تسلسل اور تتمہ ہے اور اس کے مطالب کی بندش سورۂ صافات کی جملہ بندی سے بہت زیادہ مشابہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ سورہ مکی ہے۔ اس لیے ان سورتوں کی تمام خصوصیات یعنی مبدأ و معاد اور پیغمبر اسلامؐ کی رسالت کے بارے میں بحث کی حامل ہے۔ بعض دیگر مطالب کا اضافہ کرکے راہِ حق کے تمام متلاشیوں کے لیے یہ سورہ راہنمائی مہیا کرتی ہے۔

اس سورہ کے مطالب و مضامین کا پانچ حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصہ: اس میں مسئلہ توحید کے لیے اور شرک کے خلاف جدوجہد کا ذکر ہے اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے اور ان دونوں امور کے مقابلے میں مشرک دشمنوں کی سختی اور ہٹ دھرمی سے متعلق گفتگو ہے۔

دوسرا حصہ: اس میں خدا کے نو پیغمبروں کی تاریخ کے کچھ گوشوں کو منعکس کیا گیا ہے۔ خصوصیت سے حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ اور حضرت ایوبؑ کے بارے میں زیادہ گفتگو ہے۔ ان کی زندگی اور خدا کی طرف دعوت کے سلسلہ میں ان کی مشکلات کو بیان کیا گیا ہے تاکہ شروع شروع میں ایمان لانے والے لوگوں کے لیے ایک اصلاحی اور تربیتی درس ہو جو اس وقت انتہائی شدید دباؤ میں تھے۔

تیسرا حصہ: اس میں قیامت میں سرکش کفار کی سرنوشت اور دوزخ میں ان کے آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کے بارے میں گفتگو ہے اور مشرکین اور بے ایمان افراد کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا؟

چوتھا حصہ: اس میں انسان کی خلقت، اس کے بلند مقام اور آدم کے لیے ملائکہ کے سجدے کے بارے میں گفتگو ہے اور اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ انسان کی بلندی اور پستی کے درمیان کتنا عظیم فاصلہ ہے تاکہ یہ بے خبر دل کے اندھے، اپنی حقیقت اور قدر و قیمت کو پہچانیں اور اپنے انحرافی طرزِ عمل پر نظر ثانی کریں اور شیاطین کے زمرے سے باہر نکل آئیں۔

پانچواں حصہ: اس میں تمام ہٹ دھرم دشمنوں کے لیے ایک تہدید ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے لیے تسلی خاطر ہے۔ نیز اس میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ آپؐ اپنی دعوت میں کسی سے کسی قسم کی اُجرت اور مزدوری طلب نہیں کرتے، اور کسی کے لیے کوئی درد و رنج نہیں چاہتے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

یہ سورہ جو اپنی ابتداء کی وجہ سے سورۂ "ص" کے نام سے موسوم ہے، پیغمبر گرامی اسلامؐ سے اس کی فضیلت کے بارے میں ایک روایت میں آیا ہے:۔

من قرء سورة "ص" اعطی من الاجر بعدد کل جبل سخرہ اللہ لداؤد حسنات وعصمہ اللہ ان یصر علی ذنب صغیرًا او کبیرًا

جو شخص سورہ "ص" پڑھے گا، ہر اس پہاڑ کے مطابق کہ جو خدا نے داؤدؑ کے لیے مسخر کیا تھا، اسے نیکی عطا کرے گا اور صغیرہ و کبیرہ گناہ سے آلودہ ہونے اور اس پر اصرار کرنے سے اسے محفوظ رکھیگا[1]

ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے مروی ہے:۔

من قرء سورة "ص" فی لیلة الجمعة اعطی من خیر الدنیا و الاٰخرة مالم یعط احد من الناس الا نبی مرسل او ملک مقرب، و ادخلہ اللہ الجنة و کل من احب من اھل بیتہ حتی خادمہ الذی یخدمہ

جو شخص سورہ "ص" شب جمعہ میں پڑھے گا (خدا کی طرف سے) خیر دنیا و آخرت میں سے اس قدر اسے دیا جائے گا کہ پیغمبران مرسل اور مقرب فرشتوں کے سوا اور کسی کو نہیں دیا جائے گا اور خدا اسے اور ان تمام افراد کو جو اس کے گھر والوں میں سے اس سے تعلق رکھتے تھے، جنت میں داخل کرے گا۔ یہاں تک کہ اس خدمت گار کو بھی جو اس کی خدمت کرتا تھا[2]

جس وقت ہم اس سورہ کے مضامین و مطالب کو اس اجر کے ساتھ رکھتے ہیں تو اس اجر کا ان تعلیمات کے ساتھ ربط و تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ البتہ پھر اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ اس سے مراد خشک و بے روح تلاوت نہیں ہے بلکہ وہ تلاوت ہے جو فکر انگیز ہو۔ ایسی فکر جو عمل پر ابھارے اور سورہ کے مضامین و مطالب کو انسان کی زندگی میں عملی شکل دے۔

---

[1] مجمع البیان، آغاز سورۂ ص جلد ۸ ص ۴۶۲

[2] ایضاً

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۝

۲۔ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝

۳۔ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۝

ترجمہ

۱۔ ص۔ قسم ہے اس قرآن کی جس میں ذکر ہے (کہ یہ کتاب خدائی معجزہ ہے)۔

۲۔ لیکن کافر غرور اور اختلاف میں گرفتار ہیں۔

۳۔ ہم نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے وہ (لوگ) نزولِ عذاب کے وقت داد و فریاد کرتے تھے لیکن نجات کا وقت گزر چکا تھا۔

شانِ نزول

تفسیر و حدیث کی کتابوں میں اس سورہ کی ابتدائی آیات کے بارے میں کئی ایک ملتی جلتی شانِ نزول بیان ہوئی ہیں۔ ہم ان میں سے ایک جو زیادہ مشرح اور جامع ہے، یہاں پر پیش کرتے ہیں اور یہ وہ حدیث ہے جو مرحوم کلینی نے امام باقرؑ سے نقل کی ہے۔

ابوجہل اور قریش کی ایک جماعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابوطالب کے پاس آئی اور کہا: تمھارے بھتیجے نے ہمیں بہت تکلیف پہنچائی ہے اور ہمارے خداؤں کو بھی ناراض کیا ہے۔ اسے بلاؤ اور حکم دو کہ وہ ہمارے خداؤں کو کچھ نہ کہا کرے تاکہ ہم بھی اس کے خدا کو برا نہ کہیں۔

جناب ابوطالب نے کسی کو پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں بھیجا۔ جب پیغمبر گرامیؐ گھر میں داخل ہوئے اور کمرے کے اطراف میں نگاہ کی تو دیکھا کہ مشرکین کے علاوہ ابوطالب کے پاس اور کوئی نہیں ہے، تو آپؐ نے فرمایا: "السلام علی من اتبع الھدٰی" (سلام ان پر جو ہدایت کے پیرو ہیں)۔

پھر آپؐ بیٹھ گئے تو پیغمبر اکرمؐ سے حضرت ابوطالب نے ان کی باتیں بیان کیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے جواب میں فرمایا:

اوھل لھم فی کلمۃ خیر لھم یسودون بھا العرب ویطاون اعناقھم

کیا یہ اس بات کے لیے تیار ہیں کہ ایک جملے میں مجھ سے موافقت کریں اور اس کے سایے میں تمام

عرب پر سبقت حاصل کرلیں اور ان پر حکومت کریں۔

ابوجہل (اس بات سے وجد میں آگیا، اس نے سوچا کہ عربوں پر حکومت کرنے کی چابی پیغمبر کے ہاتھ سے لے لے)، کہنے لگا، ہاں ہم موافق ہیں، آپ کی مراد کون سا جملہ ہے؟

جناب پیغمبرؐ نے فرمایا:

تقولون لاالٰہ الّا اللہ

تم یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے (اور ان بتوں کو جو تمھاری بدبختی، ننگ و عار اور پس ماندگی کا سبب ہیں دور پھینک دو)۔

جس وقت حاضرین نے یہ جملہ سنا تو اتنے وحشت زدہ ہوئے کہ انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں، اور تیزی کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ کہتے جاتے تھے، ایسی بات تو ہم نے اب تک نہیں سنی تھی، یہ تو ایک جھوٹ ہے۔

اس موقع پر سورہ "صٓ" کے آغاز کی آیات نازل ہوئیں[1]

تفسیر

تمھاری نجات کا وقت گزر چکا ہے

اس سورہ کی پہلی آیت میں پھر ایک مرتبہ حروفِ مقطعات میں سے ایک حرف "ص" سے ہمارا سامنا ہے اور یہاں بھی وہی گزشتہ باتیں پیش آئیں گی کہ کیا یہ قرآن مجید کی عظمت کی طرف اشارہ ہے کہ جو "الف" "با" جیسے سادہ حروف سے تشکیل پایا ہے مگر اس کے مضامین و مطالب ایسے ہیں جو عالمِ انسانیت کو منقلب کر دیتے ہیں اور یہ خدا کی عجیب و غریب قدرت نمائی ہے کہ اس نے اس سادہ سے مواد سے ایسی عجیب و غریب ترکیب کو وجود بخشا۔

یا یہ ان کے اسرار و رموز کی طرف اشارہ ہے جو خدا اور اس کے پیغمبر گرامیؐ کے درمیان تھے اور ایک آشنا اور دوست کا دوسرے آشنا کی طرف کوئی پیغام ہے۔

یا پھر دوسری تفاسیر۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں خصوصیت کے ساتھ "ص" کو "اسماءِ الٰہی" یا دوسری باتوں کے لیے ایک اختصاری علامت قرار دیا ہے۔ کیونکہ بہت سے اسماءِ الٰہی "ص" سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً صادق، صمد، صانع یا یہ "صدق اللہ" کے جملہ کی طرف اشارہ ہے جسے ایک ہی حرف میں بطور خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

حروفِ مقطعات کی تفسیر کے سلسلے میں مزید تشریح سورۂ بقرہ، آلِ عمران اور اعراف کی ابتداء میں (پہلی، دوسری اور چھٹی

---

[1] اصولِ کافی، (نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۱ کی نقل کے مطابق)

جلد میں) ملاحظہ فرمائیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: قسم ہے اس قرآن کی جو ذکر کا حامل ہے کہ تو حق پر ہے اور یہ کتاب خدائی معجزہ ہے۔ (والقرآن ذی الذکر)[1]

قرآن خود بھی ذکر ہے اور ذکر کا حامل بھی ہے۔ "ذکر" کا معنی ہے یاد آوری اور صفحۂ دل سے غفلت کے زنگ کو دور کرنا، خدا کی یاد، اس کی نعمتوں کی یاد، قیامت کی عظیم عدالت کی یاد، اور خلقتِ انسان کے مقصد کی یاد۔

ہاں! انسانوں کی بدبختی کا اہم سبب غفلت ہے اور قرآن مجید اسے زائل کرتا ہے۔

قرآن منافقین کے بارے میں کہتا ہے:

نسوا اللہ فنسیھم

انھوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے بھی انھیں فراموش کر دیا۔ (اور اپنی رحمت ان سے منقطع کر لی)

(توبہ ـــــ ۶۷)

اسی سورہ (ص) کی آیہ ۲۶ میں گمراہوں کے بارے میں بیان ہوا ہے۔

ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب

جو لوگ خدا کی راہ سے گمراہ ہو جاتے ہیں چونکہ انھوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے لہذا وہ عذابِ شدید میں مبتلا ہوں گے۔

ہاں! گمراہوں اور گنہ گاروں کے لیے سب سے بڑی مصیبت فراموشی ہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود کو اور اپنی ہستی کی قدر و قیمت کو بھی بھول جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فأنساھم انفسھم اولئک ھم الفاسقون

تم ان لوگوں کے مانند نہ ہو جانا جنھوں نے خدا کو بھلا دیا ہے، خدا نے انھیں خود اپنے آپ کو ہی بھلوا دیا ہے۔ وہ فاسق ہیں۔ (حشر ـــــ ۱۹)

اور قرآن انھی نسیان کے پردوں کو چاک کرنے کا وسیلہ اور غفلت کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے نور اور روشنی ہے۔ اس کی آیات انسان کو خدا اور قیامت کی یاد دلاتی ہیں۔ اور اس کے جملے انسان کو اپنے وجود کی قدر و منزلت سے آشنا کرتے ہیں۔

---

[1] "والقرآن ذی الذکر" کا جملہ، جوابِ قسم ہے جس کا جواب محذوف ہے اور اس کی تقدیر انھوں نے اس طرح ذکر کی ہے۔

والقرآن ذی الذکر انک صادق و ان ھذا الکلام معجز

تو سچا ہے اور یہ کلام معجزہ ہے

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : اگر تو یہ دیکھتا ہے کہ وہ ان ضیاء بخش آیات اور بیدار کرنے والے قرآن کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کلام حق پر کوئی پردہ پڑا ہوا ہے بلکہ یہ کفار تکبر و غرور میں گرفتار ہیں ۔ جس نے انھیں حق کو قبول کرنے سے باز رکھا ہوا ہے اور عداوت و عصیاں انھیں تیری دعوت قبول کرنے سے روکے ہوئے ہے (بل الذین کفروا فی عزّۃ و شقاق) ۔

" عزّۃ " "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق ایک حالت ہے جو انسان کو مغلوب ہونے سے روکتی ہے ، (شکست ناپذیری کی حالت) اور اصل میں یہ لفظ " عزاز " سے لیا گیا ہے جو سخت محکم اور نفوذ ناپذیر سرزمین کے معنی میں ہے اور یہ دو قسم کی ہوتی ہے کبھی " عزت ممدوح " اور پسندیدہ ہوتی ہے ۔ جیسا کہ ہم ذات پاک الٰہی کی " عزیز " کے ساتھ توصیف کرتے ہیں اور کبھی " عزت مذموم " ہوتی ہے ، اور وہ حق کے مقابلے میں نفوذ ناپذیری اور حقیقتوں کو قبول کرنے سے تکبر کرنا ہوتا ہے اور یہ عزت درحقیقت ذلت ہے ۔

" شقاق " دراصل " شق " کے مادہ سے " شگاف " کے معنی میں ہے ۔ بعد ازاں اختلاف کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا کیونکہ اختلاف اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ ہر گروہ ایک " شق " میں قرار پائے ۔

قرآن نے یہاں نفوذ ناپذیری ، کبر و غرور ، جدائی اور اختلاف و تفرقہ کو کفار کی بدبختی کا عامل شمار کیا ہے ۔ ہاں یہ قبیح صفات ہی ہیں جو انسان کی آنکھ اور کان پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور حسِ تشخیص انسان سے چھین لیتی ہیں اور کتنی دردناک بات ہے کہ انسان کی آنکھیں بھی کھلی ہوں اور کان بھی کھلے ہوں لیکن پھر بھی وہ اندھا اور بہرہ ہو ۔

سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۰۶ میں ہے :۔

و اذا قیل له اتق الله اخذته العزّۃ بالاثم فحسبه جهنم و لبئس المهاد

جس وقت اس (منافق) کو کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو تو ہٹ دھرمی ، تعصب اور غرور اس کو پکڑ لیتے ہیں اور گناہ کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں ۔ جہنم کی آگ اس کے لیے کافی ہے اور کتنی بری جگہ ہے وہ ؟

اس کے بعد قرآن ان غافل مغروروں کو بیدار کرنے کے لیے ان کا ہاتھ پکڑ کر بشر کی گزشتہ تاریخ کی طرف لے جاتا ہے اور مغرور و متکبر اور ہٹ دھرم اقوام کا انجام انھیں دکھاتا ہے کہ شاید وہ عبرت حاصل کریں ۔ کہتا ہے : ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنھیں ہم نے (پیغمبروں کو جھٹلانے ، آیاتِ الٰہی کا انکار کرنے اور ظلم و گناہ کی بنا پر) ہلاک کر دیا (کم اهلکنا من قبلهم من قرن) ۔

اور نزولِ عذاب کے وقت ان کی فریاد بلند ہوئی لیکن کیا فائدہ ؟ کیونکہ اب دیر ہو چکی تھی اور نجات کا وقت گزر چکا تھا (فنادوا و لات حین مناص) ۔

وہ دن جس کے لیے خدا کے پیغمبروں اور اولیاء حق نے انھیں وعظ و نصیحت کی تھی اور ان کے اعمال کے بُرے انجام سے انھیں ڈرایا تھا ، نہ صرف یہ کہ وہ سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے بلکہ مومنین کا مذاق اڑاتے ، انھیں آزار پہنچاتے ، یہاں تک کہ انھیں قتل

کر دیتے تھے۔ مہلت ہاتھ سے نکل گئی اور واپسی کے راستے تباہ ہو گئے اور عذابِ استیصال ان کی نابودی کے لیے نازل ہو گیا۔ کیونکہ توبہ و بازگشت کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے لہٰذا ان کی فریادیں کسی جگہ تک نہ پہنچیں۔

لفظ "لات" نفی کے لیے ہے اور اصل میں "لا" نافیہ تھا اور "تاء تانیث" بڑھایا گیا ہے[1]

"مناص" "نوص" کے مادہ سے پناہ گاہ اور فریادرس کے معنی میں ہے۔ کہتے ہیں کہ جب کبھی عربوں کو کوئی سخت وحشتناک حادثہ پیش آجاتا تھا، خصوصاً جنگوں میں تو وہ بار بار یہ کلمہ دہراتے تھے "مناص، مناص" یعنی پناہ گاہ کہاں ہے، پناہ گاہ کہاں ہے؟ اور چونکہ یہ مفہوم فرار کے ہم معنی ہے لہٰذا کبھی جائے فرار کے معنی میں آتا ہے[2]

بہرحال ان مغرور غافلوں کے پاس جب تک مہلت تھی کہ لطف خدا کی محبت بھری آغوش میں پناہ لیں، اس وقت تک انھوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ لیکن جب ساری مہلتیں ہاتھ سے نکل گئیں اور عذابِ استیصال نازل ہو گیا تو پھر یہ فریادیں اور راہِ فرار اور پناہ گاہ ڈھونڈھنے کی کوشش کوئی فائدہ نہیں دیتی۔

گزشتہ تمام اقوام کے لیے پروردگار کی یہی سنت رہی ہے اور آئندہ بھی یہی سنت جاری رہے گی کیونکہ اس کی سنت کے لیے کوئی تغیر نہیں ہے۔

افسوس کہ بہت سے لوگ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے وہ تلخ تجربوں کو پھر آزمانا چاہتے ہیں۔ وہ تجربات جو انسان کی تمام عمر میں صرف ایک جیسے پیش آتے ہیں اور دوسری مرتبہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، یعنی جن کا اوّل و آخر ایک ہی ہوتا ہے۔

---

[1] بعض نے "تاء" کو "زائدہ" اور مبالغہ کے لیے بھی جانا ہے (مثلاً علامہ طباطبائی) جیسا کہ بعض نے یہاں "لا" کو "نفی جنس" کے لیے سمجھا ہے اور بعض نے "مشبہ بہ لیس" بہرحال "تاء" کے اس کے ساتھ اضافہ کی وجہ سے مخصوص احکام پیدا کر لیتا ہے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ حتمی طور پر زمانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمیشہ اس کا اسم یا خبر محذوف ہوتی ہے اور ان میں سے صرف ایک کا ہم میں ذکر ہوتا ہے۔ اس بنا پر "ولات حین مناص" کا جملہ تقدیر میں "ولات الحین حین مناص" تھا۔

[2] مفردات راغب، تفسیر فخر رازی، روح المعانی اور کتاب مجمع البحرین مادہ "نوص"۔

۴۔ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝

۵۔ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝

۶۔ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝

۷۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝

ترجمہ

۴۔ وہ تعجب کرنے لگے کہ ان میں سے ایک ڈرانے والا پیغمبر کیسے آگیا اور کافروں نے کہا یہ تو جھوٹا جادوگر ہے۔

۵۔ کیا اس نے اتنے خداؤں کے بجائے ایک ہی خدا قرار دے لیا ہے، یہ تو واقعاً ایک عجیب چیز ہے۔

۶۔ ان کے سردار باہر آئے اور کہا: جاؤ اور اپنے خداؤں کے ساتھ مضبوطی سے جم جاؤ۔ یہ تو ہمیں بدبختی کی طرف کھینچ لے جانا چاہتے ہیں۔

۷۔ ہم نے ہرگز ایسی کوئی چیز اپنے آباؤ اجداد سے نہیں سُنی ہے، یہ تو بس جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔

شانِ نزول

ان آیات کے بارے میں بھی، گزشتہ آیات کے لیے بیان کردہ شانِ نزول سے ملتی جلتی ایک شانِ نزول بیان کی گئی ہے۔ یہ بھی بعید نہیں ہے کہ ان ساری آیات کے لیے مجموعی طور پر ایک ہی شانِ نزول ہو۔

لیکن چونکہ اس شانِ نزول میں کچھ نئے مطالب بیان ہوئے ہیں لہٰذا ہم اسے تفسیر علی بن ابراہیم سے یہاں پر پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ:۔

جس وقت رسولِ خدا نے اپنی دعوت کو آشکار فرمایا تو قریش کے سردار حضرت ابوطالب کے پاس آئے اور کہا: اے ابوطالب! آپ کا بھتیجا ہمیں بے عقل کہتا ہے اور ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے۔ اس نے ہمارے جوانوں کو خراب کر دیا ہے اور ہماری اجتماعیت میں

تفرقہ ڈال دیا ہے اگر یہ کام مال کی کمی کی وجہ سے کر رہا ہے تو ہم اس کے لیے اس قدر مال اکٹھا کر دیتے ہیں کہ وہ قریش میں سب سے زیادہ مالدار بن جائے۔ یہاں تک کہ ہم اسے اپنا سردار و حاکم بنانے کے لیے بھی تیار ہیں۔

ابوطالب نے یہ پیغام پیغمبرِ خداؐ کی خدمت میں پہنچایا۔ پیغمبر گرامیؐ نے فرمایا:

لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری ما ارد ته، ولکن کلمة یعطونی یملکون بها العرب و تدین بها العجم ویکونون ملوکا فی الجنة

"اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو بھی میں اس کی طرف مائل نہیں ہوں گا۔ لیکن (ان تمام وعدوں کے بجائے) ایک جملہ میں میری موافقت کریں تو وہ اس کے سایے میں عرب پر بھی حکومت کریں گے اور غیر عرب بھی ان کے دین میں داخل ہو جائیں گے اور وہ جنت کے بادشاہ بن جائیں گے۔

ابوطالب نے یہ پیغام انھیں پہنچایا تو انھوں نے کہا:

"اس کے لیے تو ہم ایک جملے کی بجائے دس جملے قبول کرنے کو تیار ہیں۔ (تم کون سا جملہ کہلوانا چاہتے ہو؟)"

پیغمبر اکرمؐ نے ان سے فرمایا:

تشهدون ان لا اله الا الله و انی رسول الله

تم یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں خدا کا رسول ہوں۔

(وہ اس گفتگو سے بہت وحشت زدہ ہو گئے اور) انھوں نے کہا:

"کیا ہم ۳۶۰ خداؤں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کو مان لیں، یہ کتنی عجیب بات ہے؟ (وہ بھی ایسا خدا جو دکھائی نہیں دیتا)"

اس موقع پر ذیل کی آیات نازل ہوئیں:

وعجبوا ان جاء هم منذر منهم و قال الکافرون هٰذا ساحر کذّاب...

.....ان هٰذا الّا اختلاق[1]

یہی معنی مجمع البیان میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل ہوا ہے اور اس کے آخر میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے روتے ہوئے فرمایا:

اے چچا! اگر یہ سورج میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند بائیں ہاتھ پر رکھ دیں تاکہ میں اپنی اس بات سے

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم۔ نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۲ (حدیث ۷) کے مطابق

دست بردار ہو جاؤں ، تو بھی میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ میں اس بات کو معاشرے میں نافذ و رائج کر کے رہوں گا یا اس کی راہ میں قتل ہو جاؤں گا۔

جس وقت حضرت ابوطالب نے یہ بات سنی تو فرمایا :

"آپ اپنے پروگرام کو جاری رکھیں ، خدا کی قسم میں ہرگز آپ کی نصرت سے دستبردار نہیں ہوں گا"[1]

تفسیر

بہت سے خداؤں کے بجائے ایک خدا

مغرور و سرکش لوگ نہ تو کوئی اثر قبول کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے موقف سے ہٹتے ہیں۔ جس چیز کو انھوں نے اپنے محدود اور ناقص افکار کے ذریعے اپنا لیا ہے ، اس کے سوا کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتے ، اور تمام قدروں کے ناپ تول کا معیار اسی کو قرار دیتے ہیں۔

لہٰذا جب پیغمبر اسلام نے مکہ میں توحید کا پرچم بلند کیا اور چھوٹے بڑے سارے بتوں کے خلاف کہ جن کی تعداد ۳۶۰ تھی ، قیام کیا تو کبھی تو "وہ اس بات پر تعجب کرتے کہ انھیں کے درمیان سے ایک انذار کرنے والا پیغمبر کیوں مبعوث کیا گیا ؟ " (وعجبوا ان جاءھم منذر منھم)۔

ان کا تعجب اس بات پر تھا کہ محمدؐ انھی میں سے ایک فرد ہیں۔

کوئی فرشتہ آسمان سے کیوں نازل نہیں ہوا ؟ وہ اس عظیم نقطہ قوت کو ، نقطۂ ضعف خیال کرتے تھے ، جو شخص عوام الناس میں سے مبعوث کیا گیا ہے وہ ان کی حاجات ، ضروریات اور دکھ درد سے واقف تھا اور ان کی مشکلات اور مسائل سے آشنا تھا۔ وہ تمام باتوں میں نمونہ اور مثال بن سکتا تھا۔ وہ اس عظیم امتیاز کو پیغمبر کی دعوت میں ایک تاریک نقطہ خیال کرتے تھے اور اس پر تعجب کرتے تھے۔

کبھی اس مرحلے سے بھی آگے بڑھ جاتے ، یہاں تک کہ کافروں نے کہا : یہ تو ایک جھوٹا جادوگر ہے (وقال الکافرون ھٰذا ساحر کذّاب)۔

ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی طرف جادو کی نسبت دینا اس وجہ سے تھا کیونکہ وہ آپ کے ناقابل انکار معجزات اور افکار میں غیر معمولی نفوذ کا مشاہدہ کرتے تھے اور آپؐ کی طرف جھوٹ کی نسبت اس بنا پر دیتے تھے کیونکہ آپؐ نے اس ماحول میں مسلّمہ شمار ہونے والی بے ہودہ رسوم اور پست افکار کے خلاف قیام کیا تھا اور اس کے خلاف بات کرتے تھے۔

---

[1] مجمع البیان ، جلد ۸ ص ۶۵

اور خدا کی طرف سے رسالت کا دعویٰ رکھتے تھے۔

جس وقت پیغمبر اکرمؐ نے اپنی توحیدی دعوت کو آشکار کیا تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہتے تھے: آؤ! ان سنی باتیں سنو: "کیا اس نے ان سب خداؤں کے بجائے ایک ہی خدا قرار دے لیا ہے؟ واقعاً یہ تو ایک عجیب بات ہے (اجعل الآلھۃ الٰھًا واحدًا انّ ھذا لشیء عجاب)[1]۔

ہاں! بعض اوقات غرور، خود خواہی، مطلق العنانی اور ماحول کی خرابی انسان کی عقل اور قوتِ فیصلہ کو اتنا بدل دیتی ہے کہ وہ واضح و روشن حقیقتوں پر تعجب کرنے لگتا ہے، جبکہ وہ خرافات اور بے ہودہ خیالات کی سختی کے ساتھ پابندی کرتا ہے۔

لفظ "عجاب" "طوال" (بروزن "تراب") کی طرح مبالغہ کا معنی دیتا ہے اور بہت زیادہ عجیب باتوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ کم عقل خیال کرتے تھے کہ ان کے معبودوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، ان کے نفوذ کی قدرت و اعتبار بھی زیادہ ہوگی۔ اسی بنا پر ایک اکیلا خدا ان کی نگاہ میں حقیر دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ فلسفی نقطہ نظر سے متعدد چیزیں محدود ہوتی ہیں اور غیر محدود وجود ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر خدا شناسی کے سلسلے میں تمام تحقیقات راہِ توحید پر آکر تمام ہوتی ہیں۔

ان کے سردار جب حضرت ابوطالب کی طرف رجوع کرنے اور ان کی وساطت سے مایوس ہو گئے تو ان کے پاس سے آگئے اور کہا: جاؤ اور اپنے خداؤں کے ساتھ مضبوطی سے جم جاؤ، اور استقامت اور پائیداری سے کام لو کیونکہ محمدؐ کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کو تباہی اور بربادی کی طرف کھینچ لے جائے اور بتوں کی طرف پشت کرنے کی وجہ سے خدا کی نعمتوں کو ہم سے منقطع کرا دے اور وہ خود ہم پر حکومت کرے (وانطلق الملأ منھم ان امشوا واصبروا علیٰ آلھتکم انّ ھٰذا لشیء یراد)۔

"انطلق" "انطلاق" کے مادہ سے، تیزی سے باہر نکلنے اور پہلے کام کو چھوڑ دینے کے معنی میں ہے۔ یہاں غصہ کی حالت میں ابوطالب کی مجلس کو چھوڑ کر چلے جانے کے معنی میں ہے۔

"ملا" قریش کے اشراف اور سرداروں کی طرف اشارہ ہے، جو ابوطالب کے پاس آئے تھے اور ان کی مجلس سے باہر آنے کے بعد ایک دوسرے سے یا اپنے پیروکاروں سے کہتے تھے کہ اپنے بتوں سے دست بردار نہ ہونا اور اپنے معبودوں کے ساتھ مضبوطی سے چمٹے رہنا۔

"لشیء یراد" کا مفہوم یہ ہے کہ "یہ مسئلہ ایک ایسی چیز ہے جو چاہی گئی ہے" اور چونکہ یہ جملہ سربستہ ہے، لہٰذا مفسرین نے اس کی بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں۔

منجملہ ان کے یہ ہیں:

---

[1] یہاں "جعل" سے مراد تکوینی طور پر قرار دینا نہیں، بلکہ اعتقاد کے مطابق قرار دینا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ پیغمبر گرامی اسلامؐ کی طرف اشارہ ہے اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ دعوت ایک سازش ہے، جس کا ہدف و مقصد ہم ہیں۔ اس کا ظاہر تو اللہ کی طرف دعوت دینا ہے لیکن اس کا باطن ہم پر حکومت کرنا اور عربوں کی سیادت و ریاست ہے۔ اور یہ سب اسی مطلب کے حصول کے لیے بہانے ہیں۔ تم لوگ جاؤ اور اپنے دین پر مضبوطی سے ڈٹ جاؤ اور اس سازش کا کھوج لگانا ہم سرداران قوم پر چھوڑ دو۔

یہ وہی چیز ہے جسے سرداران باطل ہمیشہ راہ حق کے راہرو افراد کی آواز خاموش کرنے کے لیے پیش کیا کرتے تھے۔ اے سازش کا نام دیتے تھے، ایسی سازش جس کا ان کے نزدیک سیاست دان افراد کو ہی بڑے غور کے ساتھ پتہ لگانا ہوتا ہے اور اس مبارزہ کے لیے پروگرام بنانا ہوتا ہے اور عام لوگوں کو بے اعتنائی کے ساتھ اس کے قریب سے گزر جانا چاہیے اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس سے سختی کے ساتھ چمٹے رہنا چاہیے۔

اس گفتگو کی نظیر حضرت نوحؑ کی داستان میں بھی آئی ہے۔ جس میں اشراف اور بڑے لوگوں نے عوام الناس سے کہا تھا۔

ما ھٰذا الا بشر مثلکم یرید ان یتفضل علیکم

یہ شخص صرف تمھاری مانند ہی ایک انسان ہے۔ یہ تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔

(مومنون ـــــ ۲۴)

بعض دوسروں نے اس جملہ کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم بت پرست اپنے خداؤں کے بارے میں مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہو، یہی وہ چیز ہے جو تم سے چاہی گئی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ محمدؐ کا ہدف و مقصد ہم ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ہمارے معاشرے کو خرابی کی طرف کھینچ لے جائے۔ اور ہم اپنے خداؤں کی طرف پشت کر لیں۔ جس کے نتیجے میں ہم سے نعمتیں منقطع ہو جائیں اور ہم پر عذاب نازل ہو۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ محمدؐ اپنے کام سے دست بردار ہونے والا نہیں ہے۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا ہے اور اس کا ارادہ تخلف ناپذیر ہے لہذا اس سے مذاکرات کرنا فضول سی بات ہے، اس لیے جاؤ اور اپنے عقائد کی مضبوطی سے حفاظت کرو۔

نیز یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی مراد یہ تھی کہ یہ ایک مصیبت ہے جو ہمیں پیش آئی ہے لہذا اسی حالت کے ساتھ گزارا کریں اور دکھ جھیلیں اور اپنے دین کی محکم طریقہ سے حفاظت کریں۔

البتہ اس جملہ کے مفہوم کے کلی ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے ممکن ہے ان میں سے اکثر تفسیریں اس میں جمع ہوں، اگرچہ پہلا معنی مناسب تر نظر آتا ہے۔

بہرحال بت پرستوں کے سردار یہ چاہتے تھے کہ اس گفتگو کے ذریعے اپنے پیروکاروں کے متزلزل ایمان اور جذبے کو تقویت پہنچائیں اور زیادہ سے زیادہ ان کے اعتقادات کو بدلنے سے روکیں، لیکن یہ کتنی فضول کوشش تھی؟

اس کے بعد لوگوں کو غافل رکھنے یا اپنے آپ کو قانع کرنے کے لیے انھوں نے کہا: "ہم نے تو ایسی چیز اپنے آباؤ اجداد میں کبھی نہیں سُنی۔ یہ تو نرا جھوٹ ہی جھوٹ ہے (ماسمعنا بھذا فی الملة الاٰخرة ان ھٰذا الا اختلاق)۔

اگر توحید اور بتوں کی نفی کا دعویٰ کوئی حقیقت رکھتا ہوتا تو ہمارے آباؤ اجداد کو اپنی عظمت کی وجہ سے اسے درک کر لینا چاہیے تھا۔ اور ہمیں بھی ان سے سُنے ہونے چاہیے تھا لیکن یہ ایک جھوٹی بات ہے جس کا سابق میں کوئی نشان نہیں ملتا۔

"الملة الاٰخرة" کی تعبیر ممکن ہے ان کے آباؤ اجداد کی جمعیت کی طرف اشارہ ہو جو ان کی نسبت آخری ملت تھے، جیسا کہ ہم سطور بالا میں بیان کر آئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اہلِ کتاب خصوصاً نصاریٰ کی طرف اشارہ ہو جو پیغمبر اسلامؐ کے ظہور سے پہلے آخری دین وملت شمار ہوتے تھے یعنی نصاریٰ کی کتابوں میں بھی محمدؐ کی باتوں کا کوئی نام ونشان نہیں کیونکہ وہ "تثلیث" (تین خداؤں) کے قائل ہیں۔ محمدؐ کی توحید تو ایک نئی ظاہر ہونے والی بات ہے۔

لیکن جیسا کہ قرآن کا لب ولہجہ دوسری مختلف آیات میں نشان دہی کرتا ہے، زمانہ جاہلیت کے عرب یہود ونصاریٰ کی کتب پر اعتماد نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کا سب کچھ ان کے بڑوں اور آباؤ اجداد کا طریقہ اور دین تھا اور پہلی تفسیر کے لیے یہ ایک اچھا شاہد ہے۔

"اختلاق" "خلق" کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کو سابقہ کے بغیر ابداء واظہار کرتا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ "جھوٹ" کے معنی میں بھی بولا گیا ہے، کیونکہ جھوٹ بولنے والا بہت سے مواقع پر بے سابقہ مطالب بیان کرتا ہے۔ اس بنا پر زیرِ بحث آیت میں "اختلاق" سے مراد یہ ہے کہ توحید کا دعویٰ ایک نئی چیز اور بے سابقہ دعویٰ ہے جو محمدؐ نے پیش کیا ہے اور یہ ہمارے اور ہم سے پہلے لوگوں کے درمیان ناشناختہ ہے اور یہ خود اس کے بطلان کی دلیل ہے۔

آئینِ نو سے ڈرنا: تاریخ میں گمراہ اقوام کے اپنے انحرافات پر اصرار کرنے اور خدا کے پیغمبروں کی دعوت کے سامنے سر نہ جھکانے کے علل واسباب میں سے ایک تازہ اور نئے ظاہر ہونے والے مسائل کا خوف ہی رہا ہے، وہ ہر نئی چیز سے وحشت رکھتے تھے اور اسی بنا پر انبیاء کے دین کو بہت بُری نظر سے دیکھتے تھے، اب بھی بہت سی قوموں میں ایسی جاہلانہ سوچ کے اثرات پائے جاتے ہیں حالانکہ نہ تو پیغمبروں کی توحید کی طرف کوئی نئی چیز تھی اور نہ ہی اس کا نئی چیز ہونا اس کے باطل ہونے کی دلیل ہوتا، منطق اور دلیل کی پیروی کرنی چاہیے اور حق بات کو تسلیم کرنا چاہیے وہ جہاں کہیں بھی ہو اور جس کی طرف سے بھی ہو۔

تاسف و تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات نئی بات اور نئی تحقیق سے بعض علماء بھی وحشت کرنے لگتے ہیں اور نئے علمی نظریات کے مقابلے میں مخالفت کا علم بلند کر دیتے ہیں اور "ان ھٰذا الا اختلاق" کہنے لگتے ہیں۔

خصوصاً اربابِ کلیسا (عیسائی پادریوں) کی تاریخ میں یہ مسئلہ بہت زیادہ نظر آتا ہے کہ وہ علماءِ علومِ طبیعی کے سائنسی انکشافات کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے تھے اور گلیلیو جیسے (علماءِ طبیعیات) کو زمین کے سورج کے گرد چکر لگانے اور خود اپنے گرد گردش کرنے کے انکشاف کرنے کی وجہ سے سخت ترین حملوں کا نشانہ بناتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ باتیں بدعت ہیں بے سابقہ ہیں اور جھوٹ ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ بعض بڑے علماء بھی جب نئی علمی تحقیقات پر دسترس حاصل کرتے ہیں تو اس خوف سے کہ کہیں ان لوگوں کے حملوں کا نشانہ نہ بن جائیں جو ان کے ہم عصر ہیں اور وہ اس نئی تحقیق پر تنقید کرنے لگیں، وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں کہ قدماء اور گزشتہ لوگوں میں سے چند افراد کو اپنے نئے نظریات سے ہم آہنگ ظاہر کریں اور اس طریقے سے اپنے نظریے کو ایک پرانا اور قدیمی عقیدہ بیان کریں تاکہ امن و امان میں رہ سکیں اور یہ بات بہت ہی المناک ہے۔

اس بات کا ایک نمونہ معروف "حرکت جوہری" کے نظریے کے بارے میں صدر المتالہین شیرازی کے اسفار میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

بہرحال نئے مسائل اور جدید تحقیقات کے ساتھ یہ طرز سلوک، انسانی معاشروں اور جہانِ علم و دانش کے لیے پہلے بھی نقصان دہ تھا اور آج بھی ہے اور ہمدردی اور خلوص رکھنے والوں کو اس کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا چاہیے اور زمانہ جاہلیت کی ان رسومات کو افکار انسانی سے دور کر دینا چاہیے۔

لیکن یہ گفتگو اس معنی میں بھی نہیں ہے کہ ہر نئے مطلب کو اس کے تازہ اور نیا ہونے کی وجہ سے قبول کرلیں۔ چاہے وہ بالکل بے بنیاد اور بے اساس کیوں نہ ہو، کیونکہ تازہ پسندی بھی قدامت پرستی کی طرح ہی خود ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔

اعتدالِ اسلامی کا تقاضا یہ ہے کہ نہ اس معاملہ میں یہ افراط ہو اور نہ ہی تفریط۔

۸۔ ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ؕ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ؕ

۹۔ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۚ

۱۰۔ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ

۱۱۔ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ

ترجمہ

۸۔ کیا ہم سب میں سے صرف اس (محمدؐ) پر قرآن نازل ہوا ہے؟ وہ درحقیقت میری اصل وحی کے بارے میں ہی شک کر رہے ہیں، بلکہ انھوں نے ابھی تک عذابِ الٰہی نہیں چکھا (تبھی اس طرح کی گستاخانہ باتیں کر رہے ہیں)

۹۔ کیا تیرے قادر اور عطا کرنے والے پروردگار کی رحمت کے خزانے ان کے پاس ہیں (کہ جسے ان کا دل چاہے دے دیں)؟

۱۰۔ یا یہ بات ہے کہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کی مالکیت ان ہی کے لیے ہے (اگر ایسا ہے) تو آسمان پر چڑھ جائیں (اور محمدؐ کے پاک دل پر وحی کے نزول کو روک دیں)۔

۱۱۔ ہاں! یہ شکست خوردہ احزاب کا ایک چھوٹا سا لشکر ہیں۔

تفسیر

یہ چھوٹا سا شکست خوردہ لشکر

گزشتہ آیات میں راہِ توحید اور پیغمبر اسلامؐ کی رسالت کی مخالفت میں مخالفین کی منفی تنقید اور نکتہ چینی کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں بھی اسی گفتگو کو جاری رکھا گیا ہے۔

مشرکین مکہ نے جب اپنے ناجائز مفادات خطرے میں دیکھے اور کینہ وحسد کی آگ ان کے دل میں بھڑکنے لگی تو پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت کے سلسلے میں خود کو قانع کرنے اور لوگوں کو غافل رکھنے کے لیے طرح طرح کی کمزور دلیلوں کا سہارا لینے لگے۔ منجملہ ان کے تعجب اور انکار کے طور پر کہتے: کیا ہم سب میں سے صرف محمدؐ پر قرآن نازل ہوا ہے؟ (ءانزل علیه الذکر من بیننا)۔

کیا ان تمام بڑے بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں اور ان تمام مالدار، ثروت مند سرداروں میں سے کوئی نہ مل سکا کہ خدا اپنا قرآن اس پر نازل کرتا، سوائے تہی دست محمدؐ کے؟!

یہ منطق اس زمانے کے ساتھ ہی منحصر نہ تھی بلکہ ہر زمانے میں جب کوئی اہم ذمہ داری کسی کو سپرد کی جاتی ہے، تو حسد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، آنکھیں خیرہ اور کان تیز ہو جاتے ہیں۔ بڑبڑاہٹ اور عذر تراشیاں شروع ہو جاتی ہیں کہ کیا کوئی اور آدمی نہیں مل سکتا تھا کہ یہ کام فلاں شخص کو جو گمنام اور فقیر خاندان سے ہے سپرد کر دیا گیا ہے؟

ہاں! ایک طرف تو دنیا پرستی اور دوسری طرف سے حسد اس بات کا سبب ہوا کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) جو مشرکین کے ساتھ ایک قدر مشترک کے باعث اسلام اور قرآن سے دُور ہو گئے اور بت پرستوں کے پاس چلے گئے اور یہ کہنے لگے کہ تمھاری راہ ان کی راہ سے بہتر ہے۔

الم تر الی الذی اوتوا نصیبًا من الکتاب یؤمنون بالجبت والطاغوت و یقولون للذین کفروا هٰؤلاء اهدٰی من الذین اٰمنوا سبیلًا

کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا کہ جنھیں کتابِ خدا سے کچھ حصہ ملا تھا۔ جبت و طاغوت (بُت اور بُت پرستوں) پر ایمان لاتے ہیں اور مشرکین سے کہتے ہیں کہ وہ محمدؐ پر ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ (نساء ——— ۵۱)

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ سب تعجب اور انکار میں حسد اور حُبِّ دنیا کے علاوہ ایک اور سرچشمہ یعنی قدر و قیمت کی پہچان کا غلط معیار بھی شامل تھا جو فیصلہ کیلیے ہرگز منطقی معیار نہیں بن سکتا۔ کیا انسان کی شخصیت نام و نمود، شہرت، مال و دولت، ثروت و مقام اور سن و سال میں ہے؟ کیا خدا کی رحمت ان معیاروں پر تقسیم ہوتی ہے؟

اسی لیے اس آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ان کا مسئلہ کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ: وہ حقیقت میں میری اصل وحی اور میرے ذکر میں شک رکھتے ہیں۔ (بل هم فی شك من ذکری)۔

محمدؐ کی ذات پر اعتراض کرنا تو بہانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور ان کا یہ شک کسی مسئلے میں اس بنا پر نہیں ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ابہام ہے بلکہ اس کا سرچشمہ ہوا و ہوس، حب دنیا اور حسد و کینہ ہے۔

اور آخر میں انھیں اس جملہ کے ساتھ تہدید کی گئی ہے: انھوں نے ابھی تک عذابِ الٰہی کو نہیں چکھا جو اس طرح سے دلیری کے ساتھ خدا کے بھیجے ہوئے کے سامنے اکڑے ہوئے ہیں اور ان فضول باتوں کے ساتھ وحی الٰہی کے مقابلے میں جنگ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں (بل لما یذوقوا عذاب)۔

ہاں ہمیشہ ایسا گروہ موجود رہا ہے کہ جن کے کان منطقی اور درست بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور انھیں عذاب کے تازیانوں کے

سوا کوئی چیز غرور کے گھوڑے سے نیچے نہیں اتارتی، ان پر عذاب ہونا چاہیے چونکہ ان کا علاج عذابِ الٰہی ہی ہے۔

اس کے بعد ان کے جواب میں مزید فرمایا گیا ہے: واقعاً! کیا تیرے قادر اور بخشنے والے پروردگار کی رحمت کے خزانے انھی کے پاس ہیں کہ جس کسی کو وہ چاہیں نبوت کا پروانہ دے دیں اور جس کو نہ چاہیں محروم کر دیں (ام عندھم خزائن رحمة ربك العزيز الوهّاب)۔

خدا اس بنا پر کہ وہ "رب" ہے (اور عالمِ ہستی اور جہانِ انسانیت کا مالک و مربی اور پروردگار ہے) اپنی رسالت کے لیے ایسے شخص کو منتخب کرتا ہے جو لوگوں کو ارتقاء و تکامل کی راہ اور پرورش و تربیت میں رہبری کر سکے اور اس کے "عزیز" ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کی خواہش کا مغلوب نہیں ہے کہ وہ مقامِ رسالت کو کسی نالائق آدمی کے سپرد کر دے اور اصولی طور پر مقامِ نبوت اتنا عظیم مقام ہے کہ صرف خدا ہی اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ کس کو دے اور اس کے "وھاب" ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جو کچھ چاہے اور جس کو چاہے بخش دے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "وھّاب" مبالغے کا صیغہ ہے اور بہت بخشنے والے کے معنی میں ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبوت ایک اکیلی نعمت نہیں ہے بلکہ متعدد نعمتوں کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے اکٹھی ہوتی ہیں، پھر کہیں وہ اس منصب کا عہدہ دار ہو سکتا ہے۔ یہ نعمتیں علم، تقویٰ، عصمت، شجاعت اور شہامت ہیں۔

اس گفتگو کی نظیر سورۂ زخرف کی آیہ ۳۲ میں بھی ہے:۔

اھم یقسمون رحمة ربك

وہ تجھ پر قرآن نازل ہونے کی وجہ سے اعتراض کر رہے ہیں تو کیا تیرے پروردگار کی رحمت ان کے ہاتھوں سے تقسیم ہوتی ہے؟

ضمناً "رحمت" کی تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ نبوت جہانِ انسانیت پر خدا کی رحمت اور لطف ہے اور واقعاً ایسا ہی ہے کیونکہ اگر انبیاء نہ ہوتے تو انسان آخرت اور روحانیت کی راہ بھی گم کر بیٹھتے اور دنیا کی راہ بھی۔ جیسا کہ مکتبِ انبیاء سے دور لوگ دونوں راستے گم کیے ہوئے ہیں۔

پھر بعد والی آیت میں اسی مطلب کو ایک دوسرے طریقے سے بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کی مالکیت و حاکمیت ان کے لیے ہے؟ اگر ایسا ہے تو آسمانوں پر چڑھ جائیں اور وحیٔ الٰہی کو محمدؐ کے پاک قلب پر نازل ہونے سے روک دیں (ام لھم ملك السماوات و الارض و ما بینھما فلیرتقوا فی الاسباب)۔

یہ گفتگو حقیقت میں گزشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے۔ وہاں پر یہ کہا گیا ہے کہ "پروردگار کی رحمت کے خزانے تمھارے ہاتھ میں نہیں ہیں کہ تمھاری ہوس آلود خواہشات جس شخص کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اسے بخش دو"۔ اب فرمایا گیا ہے کہ اب جب کہ

یہ خزانے تمھارے ہاتھ میں نہیں ہیں اور صرف خدا کے ہاتھ میں ہیں، تو صرف ایک ہی راہ ہے جو تمھارے لیے کھلی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم آسمانوں پر چڑھ جاؤ اور وحی کو نازل ہونے سے روک دو۔ اور تم خود جانتے ہو کہ تم اس کام سے بھی بالکل عاجز ہو۔

اس بنا پر نہ تو "جس بات کا اقتضاء ہو" وہ تمھارے اختیار میں ہے اور نہ ہی تم کسی کام کو روکنے کی قدرت رکھتے ہو۔ ان حالات میں تم سے کیا ہو سکتا ہے؟ حسد سے مر جاؤ اور جو کام تم کر سکتے ہو کر لو۔

اس ترتیب سے یہ دونوں آیتیں ایک ہی مطلب کا تکرار نہیں کرتیں۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک مسئلے کی ایک جہت کو بیان کر رہی ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں ان کم عقل مغروروں سے تحقیر کے طور پر ارشاد ہوتا ہے: یہ شکست خوردہ احزاب کا ایک چھوٹا سا لشکر ہیں (جند ما هنالك مهزوم من الاحزاب)[1]۔

"هنالك" کا معنی ہے "اُس جگہ" اور یہ بعید کے لیے اسم اشارہ ہے۔ اس بنا پر کچھ لوگ اسے جنگِ بدر میں مشرکین کی شکست کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو مکہ سے کافی دور واقع ہوئی تھی۔

"احزاب" کی تعبیر ظاہراً ان تمام گروہوں کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبروں کی مخالفت کیا کرتے تھے اور خدا نے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ مشرکین کی یہ چھوٹی سی جمعیت ان ہی گروہوں میں سے ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو انھیں کے سے انجام میں گرفتار ہو گا (اس بات کی گواہ آئندہ والی آیات ہیں جو اس مسئلے کی تصریح کرتی ہیں)۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ سورہ مکی سورتوں میں سے ہے اور قرآن یہ گفتگو اس وقت کر رہا ہے جب مسلمان شدید اقلیت میں تھے:۔

تخافون ان یتخطفکم الناس

اس طرح سے کہ ممکن تھا مشرکین انھیں ایک لقمہ کی طرح اچک لیں (انفال ——— ۲۶)

اس وقت مسلمانوں کی کامیابی کی کوئی نشانی نظر نہیں آتی تھی، اس وقت بدر، احزاب اور حنین کی کامیابیاں سامنے نہیں آئی تھیں لیکن قرآن قاطعیت اور دو ٹوک فیصلے کے طور پر کہہ رہا ہے کہ "یہ سخت دشمن ایک چھوٹا سا ایسا لشکر ہیں جو شکست سے دوچار ہو کر رہے گا۔

آج بھی قرآن دنیا کے سارے مسلمانوں کو جو ہر طرف سے متجاوز اور ظالم طاقتوں کے محاصرے میں ہیں، یہی بشارت دے رہا ہے کہ اگر وہ بھی پہلے مسلمانوں کی طرح خدا کے عہد و پیمان پر ڈٹ جائیں تو خدا بھی جندِ احزاب کی شکست کے بارے میں اپنے وعدے کو پورا کرے گا۔

---

[1] "ما" اوپر والے جملے میں زائدہ ہے جو تقلیل کے لیے آیا ہے اور "جند" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور "مهزوم" خبر کے بعد خبر ہے اور اصل میں "هم جند ما مهزوم من الاحزاب" تھا۔ بعض کا نظریہ ہے کہ اس جملے میں کوئی چیز محذوف نہیں ہے اور "جند" مبتدا اور "مهزوم" خبر ہے۔ لیکن پہلا نظریہ زیادہ مناسب ہے۔

۱۲۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ ۙ
۱۳۔ وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَّأَصْحَابُ لْئَيْكَةِ ۖ أُولَٰئِكَ الْأَحْزَابُ
۱۴۔ إِن كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ۚ
۱۵۔ وَمَا يَنظُرُ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً مَّا لَهَا مِن فَوَاقٍ
۱۶۔ وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّل لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ

ترجمہ

۱۲۔ اُن سے پہلے قوم نوح و عاد اور صاحبِ اقتدار فرعون نے (ہمارے انبیاء کی) تکذیب کی۔
۱۳۔ نیز ثمود، قوم لُوط اور اصحابِ ایکہ (قوم شعیب) یہ وہ جماعتیں تھیں (کہ جو انبیاء کی تکذیب کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں)
۱۴۔ ان جماعتوں میں سے ہر ایک نے رسولوں کی تکذیب کی اور ان کے لیے عذابِ الٰہی رُوبہ عمل آیا۔
۱۵۔ (اپنے ان اعمال کے سبب) ان لوگوں کو اس کے علاوہ کوئی توقع نہ تھی کہ ایک آسمانی صیحہ نازل ہو۔ ایسی صیحہ کہ جس کے باعث لوٹنے کا کوئی راستہ نہ رہے (اور وہ سب کو نابُود کر دے)
۱۶۔ انھوں نے (سرکشی کی بنا پر) کہا: پروردگارا! اپنے عذاب میں سے روزِ حساب سے پہلے ہی ہمارا حصّہ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں دے دے۔

تفسیر

صرف ایک آسمانی صیحہ کافی ہے

گزشتہ آیات میں سے آخری میں مشرکین کی شکست کی خبر دی گئی تھی۔ اس میں انھیں احزاب میں سے چھوٹا سا مغلوب لشکر قرار دیا گیا ہے۔ اب زیرِ بحث آیات میں چند ایسے گروہوں کا ذکر ہے جو انبیاءؑ کی تکذیب کرتے تھے اور ان میں ان کے بُرے انجام کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان سے پہلے قوم نوح و عاد اور صاحبِ اقتدار فرعون نے اللہ کی آیات اور اس کے رسولوں کو جھٹلایا (كذّبت قبلهم قوم نوح وعاد وفرعون ذو الاوتاد)۔

اسی طرح قوم ثمود، قوم لوط اور اصحاب ایکہ (قوم شعیب بھی ایسے گروہ تھے جو اللہ کے رسولوں کی تکذیب کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے (وثمود وقوم لوط واصحاب الایکة اولئك الاحزاب)[1]

جی ہاں! یہ چھ گروہ زمانۂ جاہلیت کی جماعتوں اور بُت پرستوں کے سے تھے انھوں نے اپنے عظیم انبیاء کے خلاف قیام کیا۔

قوم نوح نے حضرت نوحؑ جیسے عظیم پیغمبر کے خلاف قیام کیا۔
قوم عاد نے حضرت ہودؑ کے خلاف قیام کیا۔
فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے مقابلے میں قیام کیا۔
قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کے خلاف قیام کیا۔
قوم لوط نے حضرت لوطؑ کے مقابلے میں قیام کیا۔
اور اصحاب الایکہ نے حضرت شعیبؑ کے خلاف قیام کیا۔

ان قوموں نے جو کچھ ان کے بس میں تھا انبیاء اور اہل ایمان کے خلاف کیا، ان کی تکذیب کی اور انھیں اذیتیں دیں لیکن انجام کار عذابِ الٰہی انھیں دامن گیر ہوا اور خشک فصلوں کی طرح انھیں کاٹ کر رکھ دیا۔

قوم نوح طوفان اور تباہ کن بارشوں سے نابود ہوئی۔
قوم عاد زبردست اور ہولناک آندھی سے تباہ ہوئی۔
فرعون اور اس کے ساتھی نیل کی موجوں میں غرق ہوئے۔
قوم ثمود آسمانی بجلی کا شکار ہوئی۔
قوم لوط پر وحشت ناک زلزلہ آیا اور آسمانوں سے پتھروں کی بارش نازل ہوئی۔
قوم شعیب بھی موت آفرین بجلی کا شکار ہوئی کہ جو بادل سے ان کے سروں پر آپڑی۔

گویا وہ لوگ پانی، ہوا، مٹی اور آگ جیسی چیزوں سے تباہ ہوئے کہ جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ ان سرکش باغیوں کا دفترِ حیات یوں لپیٹ دیا گیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ لہٰذا ان مشرکینِ مکہ کو بھی سوچ بچار کر لینا چاہیے کیونکہ ان قوموں کے مقابلے میں تو یہ ایک چھوٹے سے گروہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے لہٰذا یہ خوابِ غفلت سے بیدار کیوں نہیں ہوتے؟

فرعون کے لیے "ذوالاوتاد" (مضبوط کھلے والا) کا لفظ آیا ہے۔ یہ ان آیات میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے مضبوط اقتدار کے لیے ایک طرح کی صراحت ہے۔ اسی طرح سورۂ فجر کی آیہ ۱۰ میں بھی اس امر کا ذکر کنایتاً موجود ہے۔ زیرِ نظر تعبیر روزمرہ میں بھی استحکام اور مضبوطی کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: فلاں شخص کے کھلے مضبوط ہیں کیونکہ خیموں وغیرہ کی مضبوطی

---

[1] "اولئك الاحزاب" مبتدا اور خبر ہے "اولئك" ان چھ قوموں کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا ذکر ان دو آیتوں میں مذکور ہے "احزاب" انھی دو قبل کی آیتوں میں مذکور احزاب کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے مشرکینِ مکہ کو چھوٹا سا گروہ شمار کیا گیا ہے۔

کے لیے مختلف طرح کے کلوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

بعض نے اسے فرعون کی عظیم افواج کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ فوج عام طور پر خیموں سے کام لیتی ہے اور خیموں کی مضبوطی کے لیے کلوں اور میخوں وغیرہ سے استفادہ کرتی ہے۔

بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ فرعونی لوگ اپنے مخالفوں کے خلاف بہت وحشتناک ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں انھیں چار میخوں سے قتل کرتے تھے۔ تختۂ دار یا دیوار پر ان کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھونک دیتے تھے اور اسی عالم میں انھیں چھوڑ دیتے تھے یہاں تک کہ ان کی جان نکل جائے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "اوتاد" سے مراد "اہرام" مصر ہی ہیں کہ جو میخ کی طرح زمین میں گڑے ہوئے ہیں اور چونکہ اہرام فرعونوں کی خصوصیات میں سے ہیں اس لیے یہ صفت قرآن میں صرف انھی کے لیے آئی ہے۔

البتہ یہ تمام احتمالات ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں سب معنی جمع ہوں۔

اصحاب الایکہ میں "ایکہ" کا معنی ہے درخت اور "اصحاب الایکہ" سے مراد حضرت شعیبؑ کی قوم ہے۔ ان کا علاقہ حجاز و شام کے درمیان تھا اور اس میں پانی اور درختوں کی فراوانی تھی۔ اس ضمن میں ہم سورۂ حجر کی آیت ۸۰ کی تفسیر میں حسبِ ضرورت تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں (اس سلسلے میں قارئین جلد ۱۱ کی طرف رجوع کریں)۔

جی ہاں! ان میں سے ہر گروہ نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی اور اللہ کا عذاب ان کے لیے رُوبہ عمل آگیا (ان کل الا کذب الرسل فحق عقاب)۔[1]

تاریخ شاہد ہی کرتی ہے کہ کس طرح ان میں سے ہر گروہ گرفتارِ بلا ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے شہر ویرانوں اور کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے اور ان شہر کے باسی بے روح جسم ہو گئے۔

مشرکینِ مکہ جو کام انجام دیتے ہیں ان کے ہوتے ہوئے کیا ان کا ان لوگوں سے بہتر انجام ہو سکتا ہے جبکہ ان کے اعمال بھی ویسے ہی ہیں اور اللہ کی سنت بھی وہی ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں قرآن ایک قاطع اور تہدید آمیز انداز میں کہتا ہے: یہ لوگ ان اعمال کے ہوتے ہوئے اس کے سوا کوئی توقع نہیں رکھ سکتے کہ ایک آسمانی صیحہ آپہنچے، ایسا صیحہ کہ پھر لوٹنے کی گنجائش نہ رہے (و ما ینظر ھٰؤلاء الا صیحۃ واحدۃ مالھا من فواق)۔

ممکن ہے یہ صیحہ ویسی ہی ہو جیسی گزشتہ اقوام پر نازل ہوتی رہی یعنی وحشت ناک صاعقہ یا زبردست آواز کے ساتھ زمین پر آنیوالا زلزلہ ہو کہ جس کے ذریعے ان کی زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

نیز ممکن ہے یہ اس دنیا کے اختتام پر جو عظیم صیحہ ہو گی اس کی طرف اشارہ ہو کہ جس کے لیے پہلا صور پھونکے جانے کی

---

[1] "فحق عقاب" دراصل معمول کے مطابق "فحق عقابی" تھا۔ یاء حذف ہو گئی اور اس پر دلالت کرنے والی زیر باقی رہ گئی۔ "حق" فعل ہے اور "عقاب" اس کا فاعل ہے۔ یعنی "میرا عقاب ان کے بارے میں ثابت ہو گیا ہے"۔

تعبیر استعمال ہوئی ہے۔

بعض مفسرین نے پہلی تفسیر پر تنقید کی ہے اور اسے سورۂ انفال کی آیت ۳۳ کے مخالف قرار دیا ہے کہ جس میں فرمایا گیا ہے۔

وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم

جب تک کہ تو ان کے درمیان ہے اللہ ان پر عذاب نہیں کرے گا۔

لیکن اس امر کی طرف توجہ کی جائے تو یہ تفسیر درست معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین کا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ اعتقاد نہ تھا اور ان کے اعمال بھی انھی قوموں کے سے تھے کہ جو صیحہ آسمانی کا شکار ہوئے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ ہر لمحہ اسی قسم کے انجام کے انتظار میں رہیں کیونکہ آیت میں انتظار کے بارے میں گفتگو ہے (غور کیجیے گا)۔

بعض نے دوسری تفسیر پر بھی اعتراض کیا ہے کہ مشرکین عرب اس جہان کے اختتام کے وقت زندہ نہیں ہوں گے کہ وہ عظیم صیحہ ان کے دامن گیر ہو۔

لیکن یہ اعتراض بھی درست نہیں، اسی دلیل کے مطابق کہ جو بیان ہو چکی ہے کیونکہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ دنیا کب ختم ہو جائے گی اور قیامت کب آئے گی؟ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ مشرکین ہر لحظہ اس عظیم صیحہ کے انتظار میں ہوں کہ جس کے لوٹ جانے کا امکان نہیں [1]

بہر حال یہ جاہل لوگ آیاتِ الٰہی کی تکذیب و انکار کے باعث، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ناروا تہمتیں لگانے کی وجہ سے اور بت پرستی پر اپنی ہٹ دھرمی اور اصرار کے سبب اور ظلم و فساد کی وجہ سے گویا عذابِ الٰہی کے انتظار میں ہیں۔ ایسا عذاب کہ جو ان کے خرمنِ حیات کو جلا کر رکھ دے گا یا ایسے صیحہ کے انتظار میں ہیں کہ جو اس دنیا ہی کو ختم کر دے گی اور انھیں ایسے راستے پر لے جائے گی کہ جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔

"فواق" (بروزن "رواق") بہت سے اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر کے نزدیک پستان سے دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیانی فاصلے کو کہتے ہیں کیونکہ ایک مرتبہ اگر دودھ دوہ لیا جائے تو پھر دودھ دوہنے کے لیے کچھ صبر کرنا ہوگا تاکہ پھر سے دودھ پستان میں جمع ہو جائے۔

بعض اسے دودھ دوہتے وقت انگلیاں کھولتے اور بند کرتے ہوئے ان میں جو فاصلہ پیدا ہوتا ہے اس کے معنی میں لیتے ہیں۔

نیز دودھ جب دوہ لیا جاتا ہے تو پستان کو ایک طرح سے آرام آجاتا ہے۔ لہٰذا یہ لفظ آرام و راحت کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے۔

نیز چونکہ یہ فاصلہ پستان میں دودھ پھر سے آجانے کا باعث بنتا ہے، لہٰذا یہ لفظ بازگشت، واپسی اور رجوع کے معنی میں بھی

---

[1] رہی یہ بات کہ مفسرین نے اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ اس سے مراد صیحہ ثانی کہ جو مردوں کے زندہ ہونے اور عدالت الٰہی میں ان کے پیش ہونے کے لیے ہوگی، تو یہ بہت بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ بات نہ تو یہ بعد والی آیت سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی قبل کی آیات سے (غور کیجیے گا)۔

استعمال ہوتا ہے ۔ اسی بنا پر بیمار کی صحت اور ٹھیک ہوجانے کو " افاقہ " کہتے ہیں ۔ کیونکہ سلامتی اور تندرستی اس کی طرف لوٹ آتی ہے ۔ نیز بے ہوش کے ہوش میں آجانے اور دیوانے کے عاقل ہوجانے کو بھی " افاقہ " کہتے ہیں ۔ کیونکہ ہوش اور عقل ان کی طرف لوٹ آتی ہے [1]

بہرحال اس وحشت ناک صیحہ میں کسی قسم کی بازگشت ، راحت و آرام اور سکون نہیں ہے اور جب وہ رُوبہ عمل آئی تو پھر انسان کے لیے سب دروازے بند ہوجائیں گے ۔ پھر نہ پشیمانی فائدہ دے گی ، نہ تلافی کا کوئی امکان ہوگا اور نہ ہی داد و فریاد کی کہیں رسائی ہوگی ۔

آخری زیر بحث آیت میں کافروں اور منکروں کی کچھ اور باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو وہ تمسخر کے طور پر کرتے تھے ۔ ارشاد ہوتا ہے : انھوں نے کہا پروردگارا ! روزِ حساب سے پہلے ہی اپنے عذاب میں سے ہمارا حصہ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں دے دے (و قالوا ربنا عجل لنا قطنا قبل یوم الحساب) ۔

یہ دل کے اندھے مغرور اسی طرح بادۂ غرور میں بدمست تھے حتیٰ کہ عذابِ الٰہی اور اس کی عدالت کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ عذاب کے ہمارے حصے میں کیوں تاخیر ہوگئی ہے ؟ کیوں خدا ہمارے حصے میں جلدی نہیں کرتا ؟

گزشتہ قوموں میں بھی ایسے ہلکے ذہن والے اور خود غرض کم نہ تھے لیکن جب وہ عذاب الٰہی میں پھنستے تو جانوروں کی طرح چلاتے اور بلبلاتے مگر پھر کوئی ان کی فریاد کو نہ پہنچتا ۔

" قِطّ " (بروزن " جن ") دراصل ایسی چیز کے معنی میں ہے جو عرض میں کاٹی جائے جبکہ قِد (اسی وزن پر) اس چیز کے معنی میں ہے جو طول میں کاٹی جائے ۔ چونکہ ہر شخص کا معین حصہ گویا قطع شدہ اور کاٹی ہوئی چیز ہے لہٰذا یہ لفظ حصے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔

کبھی یہ لفظ اس کاغذ کے معنی میں بھی آتا ہے جس پر کچھ لکھتے ہیں یا اس میں لوگوں کے نام اور ان کے انعامات لکھتے ہیں ۔

اسی لیے زیر بحث آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے :

" خداوندا ! ہمارا نامۂ اعمال روزِ جزا سے پہلے ہمارے ہاتھ میں دے دے "

یہ بات انھوں نے اس وقت کی جب آیاتِ قرآنی نے خبر دی کہ قیامت کے دن ایک گروہ کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور دوسرے گروہ کا اعمال نامہ ان کے بائیں ہاتھ میں ہوگا ۔

---

[1] بعض اہل لغت نے " فواق " اور " فُواق " میں فرق کیا ہے ۔ جب کہ بعض دونوں کا ایک ہی معنی سمجھتے ہیں ۔ مزید تفصیل کے لیے مفردات راغب ، تفسیر روح المعانی ، تفسیر فخر الدین رازی ، تفسیر ابوالفتوح اور تفسیر قرطبی اور دیگر منابع لغت کی طرف رجوع کریں ۔

انھوں نے گویا تمسخر کے طور پر کہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اسی وقت ہمارا نامۂ اعمال ہمیں دے دیا جاتا تاکہ ہم پڑھ کر دیکھتے کہ ہم کس کھاتے میں ہیں ؟

بہرحال جہالت اور غرور دونوں ہی نہایت قبیح اور مذموم صفات ہیں کہ جو عام طور پر ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوتیں ۔ جاہل مغرور ہوتے ہیں اور مغرور جاہل ہوتے ہیں اور ان دونوں صفات کے آثار زمانۂ جاہلیت کے مشرکین میں بہت زیادہ نظر آتے ہیں ۔

۱۷۔ اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ○

۱۸۔ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ ○

۱۹۔ وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ کُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ○

۲۰۔ وَشَدَدْنَا مُلْکَهٗ وَاٰتَیْنٰهُ الْحِکْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ○

ترجمہ

۱۷۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کر اور ہمارے بااقتدار بندے داؤد کو یاد کر کہ جو توبہ کرنے والا ہے۔

۱۸۔ ہم نے پہاڑ اس کے لیے مسخر کر دیئے کہ جو صبح و شام اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔

۱۹۔ تمام پرندے بھی ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیئے (تاکہ وہ اس کے ہمراہ خدا کی تسبیح کریں) اور یہ سب اس کی طرف بازگشت کرنے والے ہیں۔

۲۰۔ اور اس کی حکومت کو ہم نے استحکام بخشا اسے ہم نے علم عطا کیا اور عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا بھی۔

تفسیر

داؤدؑ کی زندگی سے درس حاصل کریں

حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے بزرگ انبیاءؑ میں سے تھے انھیں اللہ نے ایک عظیم حکومت عطا کی تھی۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں ان کے بلند مقام کی تعریف کی گئی ہے۔ گزشتہ آیات میں مشرکین اور بت پرستوں کی زیادتیوں کا ذکر تھا۔ نیز ان ناروا تہمتوں کا بیان تھا جن کی نسبت وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد اب قرآن رسول اکرمؐ اور آپؐ کے زمانے کے مومنین کی دل جوئی کے لیے حضرت داؤدؑ کی داستان بیان کر رہا ہے۔ وہ داؤدؑ کہ جنھیں اللہ نے اس قدر اقتدار بخشا یہاں تک کہ پہاڑوں اور پرندوں کو ان کے لیے مسخر کر دیا تاکہ اس امر کی نشاندہی کرے کہ جب اس کا لطف و کرم کسی شخص کے شامل حال ہو تو پھر دشمنوں کی کثرت کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ عظیم نبی بھی اس ظاہری اقتدار کے باوجود لوگوں کی زبان کے چرکوں سے محفوظ نہ تھے لہٰذا یہ صورت حال رسول اسلامؐ کے لیے تسلی و تشفی کا باعث ہونا چاہیے کہ جس کیفیت سے وہ دوچار ہیں یہ انھی میں منحصر نہیں ہے۔

بلکہ اس دنیا کے عظیم لوگ اس امر میں ان کے شریک رہے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر اختیار کر اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر کہ جو با اقتدار بھی تھا اور بہت زیادہ توبہ کرنے والا بھی (اصبر علیٰ مایقولون واذکر عبدنا داؤد ذا الاید انہ اواب)۔

"اید" قدرت کے معنی میں بھی آیا ہے اور نعمت کے معنی میں بھی اور حضرت داؤدؑ دونوں معانی کے لحاظ سے "ذا الاید" تھے۔ ان کی جسمانی طاقت کا یہ عالم تھا کہ جب بنی اسرائیل کا ایک ظالم حکمران جالوت میدانِ جنگ میں آپؑ کے مدمقابل آیا تو آپؑ نے آلۂ سنگ اندازی سے اس قوت سے پتھر پھینکا کہ جالوت گھوڑے کی پشت سے زمین پر آرہا اور اپنے خون میں لوٹنے لگا۔ بعض نے لکھا ہے کہ پتھر نے اس کا سینہ چیر دیا اور دوسری طرف نکل گیا۔

دوسری طرف آپؑ کے سیاسی اقتدار کا یہ حال تھا کہ ایک طاقتور حکومت آپؑ کے ہاتھ میں تھی اور آپؑ پوری طاقت سے دشمنوں کے مقابلے میں کھڑے ہوتے تھے۔ علماء نے یہاں تک کہا ہے کہ آپؑ کے محرابِ عبادت کے چاروں طرف ہزار افراد شام سے صبح تک تیار کھڑے رہتے تھے۔

نیز آپؑ کی روحانی، اخلاقی اور عبادی طاقت کا یہ عالم تھا کہ رات کا ایک بڑا حصہ بیدار رہتے اور پروردگار کی عبادت میں مشغول رہتے اور سال بھر کے آدھے ایام روزے میں گزارتے۔

نعمتوں کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو طرح طرح کی ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا کر رکھی تھیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت داؤدؑ ایک ایسی شخصیت تھے کہ جنگ میں، عبادت میں، علم میں اور حکومت میں بہت قوی تھے اور انھیں فراواں نعمتیں حاصل تھیں [1]

"اواب" "اوب" (بروزنِ "قول") کے مادہ سے کسی چیز کی طرف اختیاری طور پر لوٹنے کے معنی میں ہے "اواب" چونکہ مبالغے کا صیغہ ہے لہٰذا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ پروردگار کی طرف بہت زیادہ لوٹنے والے اور بازگشت کرنے والے تھے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی غفلت اور ترکِ اولیٰ پر توبہ کرتے تھے۔

قرآن مجید اجمال کے بعد تفصیل کی اپنی خاص روش کے مطابق اب حضرت داؤدؑ پر نعماتِ الٰہی کی کچھ تفصیل بیان کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اس کے لیے پہاڑ مسخر کر دیئے، اس طرح سے کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح خدا کرتے تھے (انا سخرنا الجبال معہ یسبحن بالعشیّ والاشراق) [2]

---

[1] "اید" "ید" کی جمع ہے کہ جو "ہاتھ" کے معنی میں ہے۔ ہاتھ چونکہ طاقت، عطائے نعمت اور اقتدار و حکومت کا مظہر ہے اس لیے یہ لفظ ان تمام معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

[2] "معہ" ہوسکتا ہے "یسبحن" کے متعلق ہو۔ اس لحاظ سے یہ لفظ حضرت داؤد کے ساتھ پہاڑوں کے ہم آواز ہونے کو بیان کرتا ہے۔

سورہ سبا کی آیہ ۱۰ میں بھی ہے۔

یا جبال اوّبی معہ

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ "سخرنا" سے متعلق ہو اس صورت میں جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کیا۔ لیکن "لہٗ" کے بجائے "معہٗ" کا آنا یہ نکتہ بیان کرنے کے لیے ہے کہ یہ تسخیر تسبیح میں ہم آواز ہونے کے بارے میں تھی۔

نہ صرف پہاڑ بلکہ سب پرندے بھی اس کے لیے مسخر کر دیئے تاکہ ہمیشہ اس کے ہمراہ اللہ کی تسبیح کریں (والطیر محشورۃ)۔
یہ سب پرندے اور پہاڑ حکم داؤدؑ کے مطیع تھے، اس کے ساتھ ہم آواز تھے اور اس کی طرف بازگشت کرنے والے تھے (کل لہ اوّاب)۔
"لہ" کی ضمیر ممکن ہے داؤدؑ کی طرف لوٹتی ہو۔ اگر یوں ہو تو جملے کا مفہوم وہی ہوگا جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ البتہ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ ضمیر اللہ کی ذات پاک کی طرف لوٹتی ہو یعنی تمام ذرّاتِ عالم اس کی طرف لوٹتے ہیں اور اس کے حکم کے سامنے سرنگوں ہیں۔
مفسّرین کی اس سلسلے میں مختلف آراء ہیں کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤدؑ کے ساتھ کس طرح ہم آواز تھے اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ ان آراء کا خلاصہ یہ ہے:
۱۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی دلکش، جاذب اور دل گداز آواز تھی کہ جو پہاڑوں پر اثر انداز ہوتی تھی اور پرندوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی (لیکن یہ کوئی ایسی اہم فضیلت نہیں کہ قرآن اسے اس اہمیت کے ساتھ ذکر کرے)
۲۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تسبیح ظاہری آواز کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے ادراک و شعور کے ہمراہ تھی کہ جو ذرّاتِ عالم کے باطن میں ہے۔ اس نظریے کے مطابق تمام موجوداتِ عالم ایک قسم کی عقل اور شعور کے حامل ہیں اور جب یہ موجودات اس عظیم پیغمبرؑ کی مناجات کے وقت دل انگیز آواز سنتے تھے تو ان کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے اور یوں سب باہم مل کر تسبیح کرتے۔
۳۔ بعض نے اس احتمال کا ذکر بھی کیا ہے کہ یہ تسبیح تکوینی ہے کہ جو تمام موجودات زبانِ حال سے کرتے ہیں اور ان کا نظامِ خلقت اس امر کی بخوبی حکایت کرتا ہے کہ اللہ ہر عیب سے پاک و منزّہ ہے اور علم و قدرت اور ہر قسم کی صفاتِ کمال کا حامل ہے۔
لیکن یہ بات حضرت داؤدؑ کے ساتھ مخصوص نہیں کہ اسے ان کی خصوصیات میں سے شمار کیا جائے۔ اس لحاظ سے مناسب تر دوسری تفسیر ہے اور یہ امر قدرتِ الٰہی سے بعید نہیں ہے۔ یہ ایک زمزمہ تھا کہ جو ان موجوداتِ عالم کے اندر اور ان کے باطن میں ہمیشہ سے جاری تھا لیکن خدا نے قوتِ اعجاز سے اسے حضرت داؤدؑ کے لیے ظاہر کیا جیسے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتھیلی پر سنگریزوں کا تسبیح کرنا مشہور ہے۔
اگلی آیت میں بھی حضرت داؤدؑ پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر جاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اس کے نظامِ حکومت کو استحکام بخشا (وشددنا ملکہ)۔ اس طرح سے کہ وہ ہر باغی و سرکش دشمن کا حساب چکاتے۔ اس کے علاوہ "ہم نے اسے علم و حکمت عطا کی (واٰتیناہ الحکمۃ)۔
وُہی حکمت کہ جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرًا کثیرًا

جس شخص کو حکمت مل گئی اُسے خیرِ کثیر مل گئی۔ (البقرہ ـــــ ۲۶۹)

اس مقام پر "حکمت" "علم و دانش" امورِ حکومت چلانے کی صلاحیت یا مقامِ نبوت کے معنی میں ہے یا پھر ان تمام مفاہیم کی جامع ہے۔ "حکمت" کبھی علمی پہلو کی حامل ہوتی ہے کہ جب اسے "معارفِ عالیہ" کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ عملی پہلو کی حامل ہوتی ہے کہ

اس صورت میں اسے " اخلاق اور عملِ صالح " سے تعبیر کرتے ہیں اور حضرت داؤد علیہ السلام ان سب سے خوب بہرہ مند تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی آخری عظیم نعمت کے بارے میں فرمایا گیا ہے : ہم نے اسے علم قضاوت اور صحیح و عادلانہ فیصلہ کرنے کا علم عطا کیا (وفصل الخطاب)۔

قضاوت و عدالت کو " فصل الخطاب " سے اس بنا پر تعبیر کیا گیا ہے کہ " خطاب " سے مراد طرفین مقدمہ کی گفتگو ہے اور " فصل " قطع کرنے اور جدائی کے معنی میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فریقین کی گفتگو تبھی منقطع ہوگی جب ان کے درمیان صحیح فیصلہ ہو جائے لہٰذا یہ تعبیر عادلانہ فیصلے کے معنی میں آئی ہے۔

احتمالاً اس سے یہ مراد بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے حضرت داؤدؑ کو قوی منطق عطا فرمائی ہو کہ جو بلند فکر اور گہری فکر کی ترجمان تھی۔ لہٰذا نہ صرف یہ کہ فیصلہ کرتے ہوئے بلکہ ہر مقام پر آپؑ کی بات آخری اور حتمی ہوتی تھی۔

واقعاً جب اللہ تعالیٰ یہ قدرت رکھتا ہے کہ ایک اہل انسان کو اس قدر قوت و توانائی عطا فرمادے تو پھر اس بات کی گنجائش نہیں کہ کوئی شخص اس کے لطف و کرم سے مایوس ہو جائے۔ لہٰذا یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے ان مومنین ہی کے لیے تسلی اور دل جوئی کا باعث نہیں کہ جو مکہ میں سخت دباؤ میں تھے بلکہ ان تمام مومنین کے لیے تسلی مخاطر کا پیغام ہے کہ جو مختلف زمانوں میں سختیوں اور مشکلات کا شکار ہوں۔

حضرت داؤدؑ کی اہم صفات

بعض مفسرین نے مذکورہ بالا چند آیات سے حضرت داؤدؑ کو حاصل دس عظیم نعمتیں اخذ کی ہیں کہ جو اللہ کے اس نبی کو خدا تعالیٰ کی طرف سے حاصل تھیں۔ یہ نعمات آپؑ کے بلند مرتبے کی ترجمان ہیں۔ یہ دراصل ایک کامل انسان کی خصوصیات کو بھی واضح کرتی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلامؐ کہ جو اس قدر عظیم مقام رکھتے تھے اس کے باوجود آپؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ صبر و شکیبائی میں حضرت داؤدؑ کی اقتداء کریں اور ان کی تاریخ حیات سے کمک حاصل کریں (اصبر علیٰ مایقولون واذکر)۔

۲۔ حضرت داؤدؑ کے مقام عبودیت کی توصیف کی گئی ہے۔ دراصل یہ ان کی پہلی خصوصیت کے طور پر شمار کی گئی ہے (عبدنا داؤد)۔

پیغمبر اسلامؐ کے واقعہ معراج کے ذکر میں آپؐ کے لیے بھی یہ تعبیر آئی ہے۔

سبحان الذی اسریٰ بعبدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پاک و منزہ ہے وہ ذات کہ جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا۔ (بنی اسرائیل ـــــ ۱)

۳۔ (اطاعتِ الٰہی، گناہ سے پرہیز اور امورِ مملکت چلانے میں) وہ بہت قوی تھے (ذا الایدی)۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بھی ہے:۔

ھوالذی ایدک بنصرہ و بالمؤمنین

وہ وہی جس نے اپنی مدد اور مومنین کے ذریعے تیری تقویت کی۔ (انفال ـــــ ۶۲)

۴۔ انھیں "اوّاب" کہہ کر ان کی توصیف کی گئی ہے۔ جس کا معنی ہے بار بار لوٹنے والا اور پے در پے رجوع کرنے والا یعنی خداوند عالم کی ساحتِ قدس کی طرف رجوع کرنے والا (انہ اوّاب)۔

۵۔ صبح و شام تسبیح کرنے میں پہاڑ بھی ان کے لیے مسخر ہیں۔ اس بات کو بھی قرآن ان کا اعزاز و افتخار شمار کرتا ہے (انا سخرنا الجبال معہ یسبحن بالعشی والاشراق)۔

۶۔ پرندے بھی اللہ کی عبادت و تسبیح میں ان کے ہم آواز ہیں اور یہ بھی ان کے لیے خداداد نعمتوں میں سے ہے۔ (والطیر محشورۃ)۔

۷۔ آغاز ہی میں ان کے ہم آواز نہ تھے بلکہ جب بھی وہ تسبیح خدا کی طرف پلٹتے وہ ان کے ساتھ ہم صدا ہو جاتے (کل لہ اوّاب)۔

۸۔ اللہ نے انھیں ایک حکومت دی کہ جس کی بنیاد اس نے مستحکم کی ہوئی تھی اور اس مقصد کے لیے مادی و روحانی وسائل ان کے اختیار میں دے رکھے تھے (وشددنا ملکہ)۔

۹۔ ایک اور اہم خداداد سرمایہ ان کے پاس بہت زیادہ علم و دانش کی صورت میں تھا۔ ایسا علم و دانش کہ جہاں بھی ہو خیر کثیر کا سرچشمہ ہوتا ہے اور ہر نیکی و برکت کا منبع ہوتا ہے (و اٰتیناہ الحکمۃ)۔

۱۰۔ قوی منطق، اثر آفریں کلام اور قاطع و عادلانہ فیصلے کی طاقت بھی انھیں عطا کی گئی تھی (وفصل الخطاب)۔[1]

واقعاً کسی حکومت کی بنیادیں علم، طاقت، منطق، تقوائے الٰہی، ضبطِ نفس اور عبودیتِ پروردگار کے بغیر مضبوط نہیں ہو سکتیں۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں، ج ۲۶، ص ۱۸۳

۲۱۔ وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۙ

۲۲۔ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَاۗءِ الصِّرَاطِ ۝

۲۳۔ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ۝

۲۴۔ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَاۗءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۭ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۝ السجدة

۲۵۔ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ۭ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝

ترجمہ

۲۱۔ کیا تجھ تک شکایت کرنے والوں کی داستان پہنچی ہے کہ جو (داؤد کے) محراب سے اوپر گئے تھے؟

۲۲۔ جس وقت (بغیر کسی اطلاع کے) وہ اس کے پاس آپہنچے اور وہ انھیں دیکھ کر گھبرا گیا تو انھوں نے کہا: ڈر نہیں ہم دونوں شکایت لے کر آئے ہیں کہ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ اب تو ہمارے درمیان حق فیصلہ کر دے اور کوئی زیادتی نہ ہونے دے اور راہِ راست کی طرف ہماری ہدایت کر۔

۲۳۔ یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس کا اصرار ہے کہ وہ بھی مجھے دے ڈال اور گفتگو میں مجھے دباتا ہے۔

۲۴۔ (داؤد نے) کہا: تیری ایک بھیڑ کا تقاضا کر کے اپنی بھیڑوں میں اضافہ کرنے کے لیے اس نے مسلماً تجھ پر ظلم کیا ہے اور بہت سے دوست ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں سوائے ان کے کہ جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں مگر ان کی تعداد تھوڑی ہے۔ داؤد نے خیال کیا کہ ہم نے اسے (اس واقعے سے) آزمایا ہے۔ پس اس نے اپنے رب سے بخشش چاہی اور سجدے میں گر پڑا اور اس نے توبہ کی۔

۲۵۔ ہم نے اس کا یہ کام بخش دیا اور وہ ہمارے ہاں مقام بلند اور نیک انجام کا حامل ہے۔

تفسیر

حضرت داؤدؑ کی ایک آزمائش

ان آیات میں حضرت داؤدؑ کے فیصلہ کرنے کے بارے میں سادہ اور واضح گفتگو کی گئی ہے۔ اس ضمن میں جو تحریفات اور غلط تعبیرات کی گئی ہیں ان کے باعث لاشعوری طور پر مفسرین کے درمیان ایک بڑا نزاع پیدا ہوا ہے اس پر اس قدر شور و غوغا ہوا ہے کہ بعض مسلمان مفسرین بھی اس کی زد میں آ گئے ہیں اور انھوں نے اس عظیم نبی کے بارے میں غلط اور کہیں کہیں بہت ہی ناروا فیصلے کیے ہیں۔

ہم سب سے پہلے بغیر کسی تشریح کے آیاتِ قرآنی کا متن پیش کرتے ہیں۔ تاکہ قارئین خالی ذہن کے ساتھ آیات کا مفہوم سمجھ سکیں۔

گزشتہ آیات میں حضرت داؤد علیہ السلام کی خاص صفات بیان کی گئی تھیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا ذکر تھا۔ اس کے بعد اب دادرسی اور قضاوت کے سلسلے میں حضرت داؤدؑ کو پیش آنے والے ایک واقعے کا تذکرہ ہے۔

پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: کیا داؤد کی دیوار محراب سے اوپر جانے والے شکایت کنندگان کا واقعہ تجھ تک پہنچا ہے (وھل اتاك نبؤا الخصم اذ تسوروا المحراب)۔

"خصم" کا در اصل مصدری معنی ہے اس کا معنی ہے نزاع اور جھگڑا کرنا لیکن ایسا بہت ہوتا ہے کہ جھگڑے کے طرفین کو "خصم" کہتے ہیں۔ یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں مفاہیم کے لیے بولا جاتا ہے اور کبھی اس کی جمع "خصوم" بھی آتی ہے۔

"تسوّروا" "سور" کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے ایسی دیوار جو گھر یا شہر کے اطراف پر محیط ہو۔ لیکن توجہ رہے کہ یہ مادہ در اصل چھلانگ لگانے اور اوپر جانے کے معنی میں ہے۔

"محراب" "صدرِ مجلس" (مجلس کے نمایاں ترین مقام) یا اوپر والی منزل کے کمروں کے معنی میں ہے اور چونکہ "مقامِ عبادت" اس میں بنایا جاتا تھا۔ لہٰذا آہستہ آہستہ یہ لفظ "معبد" (عبادت خانہ) کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ روزمرہ میں یہ لفظ خصوصیت سے اس مقام کے لیے استعمال ہونے لگا جہاں امام جماعت قیامِ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ مفردات میں منقول ہے کہ "محرابِ مسجد" کو

اس لیے "محراب" کہا جاتا ہے چونکہ یہ شیطان اور ہوائے نفس سے جنگ کی جگہ ہے۔

بہرحال حضرت داؤد علیہ السلام کے اردگرد اگرچہ بہت سے محافظین موجود تھے تاہم دو آدمی ایک جھگڑے کے سلسلے میں عام راستے سے ہٹ کر محراب اور دیوارِ قصر سے اُوپر آئے اور اچانک آپؑ کے سامنے آ دھمکے۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: وہ اچانک داؤد کے سامنے آ نکلے (بغیر کسی اطلاع کے اور بغیر کسی اجازت کے) لہٰذا ان پر نظر پڑی تو داؤد وحشت زدہ ہوئے اور گھبرائے کیونکہ انھیں خیال ہوا کہ ہوسکتا ہے ان لوگوں کا ان کے بارے میں غلط ارادہ ہو (اذ دخلوا علیٰ داؤد ففزع منھم)۔

لیکن انھوں نے بہت جلد آپ کی پریشانی دُور کرتے ہوئے کہا: ڈریں نہیں۔ ہم دونوں ایک شکایت لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے اور ہم آپ کے پاس دادرسی کے لیے آئے ہیں (قالوا لا تخف خصمان بغیٰ بعضنا علی بعض)۔

اب آپ ہمارے بارے میں حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور ظلم روا نہ رکھیں اور راہِ راست کی طرف ہماری ہدایت کریں (فاحکم بیننا بالحق ولا تشطط واھدنا الیٰ سواء الصراط)۔

"تشطط" "شطط" (بروزن "فقط") کے مادے سے دراصل زیادہ دُوری کے معنی میں ہے۔ ظلم چونکہ انسان کو حق سے بہت دُور کر دیتا ہے اس لیے لفظ "شطط" اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح جو بات حقیقت سے دُور ہو یہ لفظ اس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اس مقام پر حضرت داؤدؑ کی پریشانی اور وحشت کم ہوگئی لیکن شاید ایک سوال ان کے ذہن میں ابھی باقی تھا، بہت اچھا، تمھارا کوئی غلط ارادہ نہیں ہے، تم صرف قاضی کے پاس شکایت لے کر آئے ہو لیکن اس خلافِ معمول راستے سے آنے کا مقصد؟

لیکن انھوں نے حضرت داؤدؑ کو زیادہ موقع نہ دیا۔ ایک نے شکایت کرنے میں پہل کی، کہنے لگا: یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں، لیکن یہ اصرار کرتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دے دے، گفتگو میں یہ مجھ پر بھاری ہے اور مجھ سے زیادہ باتونی ہے (انّ ھٰذا اخی لہ تسع و تسعون نعجۃ ولی نعجۃ واحدۃ فقال اکفلنیھا وعزّنی فی الخطاب)۔

"نعجۃ" "بھیڑ" کے معنی میں ہے، جنگلی گائے اور پہاڑی بھیڑ کو بھی "نعجۃ" کہتے ہیں۔

"اکفلنیھا" "کفالت" کے مادے سے ہے، یہاں دے دینے کے مفہوم میں ہے (معنی یہ ہے کہ اس کی کفالت میرے سپرد کردے)

"عزّنی" "عزّت" کے مادہ سے "غلبہ" کے معنی میں ہے۔ یہاں اس لفظ کا معنی ہے "اس نے مجھ پر غلبہ کیا ہے"۔

آیاتِ قرآنی سے ظاہری طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے دوسرے فریق کی بات سُنے بغیر شکایت کرنے والے سے کہا: "اپنی بھیڑوں میں تیری بھیڑ کا اضافہ کرنے کے لیے اس نے تقاضا کرکے ظلم روا رکھا ہے" (قال لقد ظلمک بسؤال نعجتک الیٰ نعاجہ)۔

لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں "بہت سے دوست اور ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔" (وان کثیرا من الخلطاء لیبغی بعضھم علی بعض) [1] سوائے ان کے کہ جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک عمل کیے ہیں" (الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات) "لیکن وہ بہت تھوڑے ہیں" (وقلیل ما ھم) [2]۔

جی ہاں! معاشرت اور دوستی میں دوسروں کے حق کا لحاظ رکھنے والے اور اپنے دوستوں پر ذرہ بھر بھی زیادتی نہ کرنے والے افراد بہت کم ہیں۔ اپنے دوستوں اور جاننے والوں کا حق پورے عدل و انصاف سے وہی ادا کر سکتے ہیں جو ایمان اور عملِ صالح سے خوب بہرہ مند ہیں۔

بہرحال یوں لگتا ہے کہ طرفین یہ بات سن کر مطمئن ہو گئے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاں سے چلے گئے۔ لیکن داؤدؑ سوچ میں پڑ گئے۔ انھوں نے فیصلہ تو عدل کی بنیاد پر کیا تھا کیونکہ اگر فریقِ ثانی کو مدّعی کا دعویٰ قبول نہ ہوتا تو یقیناً وہ اعتراض کرتا۔ اس کا سکوت اس امر کے لیے بہترین دلیل تھا کہ معاملہ وہی ہے جو شکایت کرنے والے نے پیش کیا ہے لیکن ان سب امور کے باوجود علوِّ اقدار کا تقاضا تھا کہ داؤدؑ اپنی بات میں جلدی نہ کرتے بلکہ فریقِ ثانی سے بھی شخصاً سوال کرتے اور پھر فیصلہ سناتے۔ لہٰذا اس کام پر وہ خود پشیمان ہوئے اور داؤد نے گمان کیا کہ اس واقعے کے ذریعے ہم نے اس کا امتحان لیا ہے (وظن داؤد انما فتنّاہ)۔

اس نے استغفار کی، اپنے رب سے طلبِ بخشش کی، سجدے میں گر گیا اور توبہ کی (فاستغفر ربہ وخرّ راکعًا واناب)۔

"خرّ"، "خریر" کے مادے سے آواز کے ساتھ بلندی سے گرنے کے معنی میں ہے جیسے آبشار کی آواز ہوتی ہے۔ سجدہ کرنے والے افراد چونکہ بلندی سے نیچے آتے ہیں اور سجدہ کرتے ہوئے تسبیح کرتے ہیں لہٰذا یہ تعبیر سجدہ کرنے کے لیے کنائے کے طور پر آئی ہے۔

"راکعًا" اس آیت میں یا تو اس بنا پر ہے کہ "رکوع" بھی لغت میں سجدے کے معنی میں آیا ہے یا پھر اس لیے کہ رکوع سجدے کے لیے مقدمہ ہے۔

بہرحال اللہ نے ان پر اپنا لطف و کرم کیا اور اس ترکِ اولیٰ میں ان کی لغزش کو معاف کر دیا۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے: ہم نے اس کے عمل کو بخش دیا (فغفرنا لہ ذالک)۔

اور وہ ہمارے نزدیک عالی مقام اور نیک مستقبل کا حامل ہے (وان لہ عندنا لزلفٰی وحسن مآب)۔

"زلفٰی" کا معنی ہے "مقام" (اور بارگاہِ الٰہی میں قُرب) اور "حسن مآب" بہشت کی اور اُخروی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] "خلطاء"، "خلیط" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ایسے اشخاص یا ایسے امور جو ایک دوسرے سے مخلوط ہیں۔ نیز دوست، شریک اور ہمسایے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے ظلم و زیادتی اگرچہ صرف ان ہی سے نہیں ہوتی لیکن ان کا خصوصی ذکر یا اس بنا پر ہے کہ ایک دوسرے سے میل جول رکھنے سے لین دین کے بہت سے معاملات پیش آتے رہتے ہیں یا اس بنا پر ہے کہ اپنوں، دوستوں، عزیزوں اور ہمسایوں سے ظلم کی توقع نہیں ہوتی۔

[2] جملہ کی ترکیب یوں ہے "ھم" مبتدا "قلیل" اس کی خبر ہے اور "ما" زائدہ ہے کہ جو یہاں کمی اور قلت کے مبالغے کے لیے آیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ داؤدؑ کو پیش آمدہ واقعے کی حقیقت: قرآن مجید سے جو کچھ معلوم ہوتا وہ اس سے زیادہ نہیں کہ کچھ افراد دادخواہی کے لیے حضرت داؤد کی محراب سے اوپر چڑھ کر آپ کی خدمت میں پہنچے۔ پہلے تو آپ گھبرا گئے۔ پھر شکایت کرنے والے کی بات سنی۔ ان میں سے ایک کے پاس ننانوے بھیڑیں تھیں، دوسرے کے پاس صرف ایک بھیڑ تھی۔ ننانوے بھیڑوں والا اپنے بھائی پر زور دے رہا تھا کہ وہ ایک بھیڑ بھی اسے دے دے۔ آپ نے شکایت کرنے والے کو سچا قرار دیا اور دوسرے کے اصرار کو ظلم قرار دیا۔ پھر اپنے کام پر پشیمان ہوئے اور اللہ سے معافی کا تقاضا کیا۔ خدا نے آپ کو بخش دیا۔

یہاں دو تعبیر زیادہ غور طلب ہیں۔ ایک آزمائش اور دوسری استغفار اور توبہ۔ اس سلسلے میں قرآن نے کسی واضح امر کی نشاندہی نہیں کی۔ لیکن زیر نظر آیات اور ان آیات کی تفسیر کے سلسلے میں منقول روایات میں موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ فضائل میں بہت زیادہ علم و مہارت رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ آپ کو آزمائے لہٰذا آپ کو ایسے غیر معمولی حالات پیش آئے (مثلاً اُن آدمیوں کا عام راستے سے ہٹ کر محراب کے اُوپر سے آپ کے پاس آپہنچنا) آپ نے جلد بازی کی اور اس سے پہلے کہ فریقِ ثانی سے وضاحت طلب کرتے آپؑ نے فیصلہ سُنا دیا اگرچہ فیصلہ عادلانہ تھا۔

اگرچہ آپ بہت جلد اپنی اس لغزش کی طرف متوجہ ہوگئے اور وقت گزرنے سے پہلے اس کی تلافی کی۔ لیکن بہرحال جو کام آپؑ سے سرزد ہوا تھا وہ نبوت کے مقامِ بلند کے شایان نہ تھا۔ اس لیے آپؑ نے اس ترکِ اولیٰ پر استغفار کی اور اللہ نے بھی انھیں عفو بخشش سے نوازا۔

مذکورہ تفسیر کی شاہد وہ آیت ہے جو زیر بحث آیات کے فوراً بعد آئی ہے۔ اس میں حضرت داؤدؑ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تجھے زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیا ہے، لہٰذا لوگوں کے درمیان حق و عدالت کے مطابق فیصلہ کر اور ہوا و ہوس کی پیروی نہ کر۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی لغزش فیصلے کے طریقے میں تھی۔ لہٰذا مذکورہ بالا آیات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس عظیم نبی کی شان اور مقام کے خلاف ہو۔

۲۔ موجودہ تورات کی خرافاتی داستان: اب ہم تورات کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتی ہے: نیز بعض ناآگاہ اور بے خبر افراد نے جو تفسیریں کی ہیں۔ ان کی اصل خبر بھی تلاش کرتے ہیں۔

تورات کی دوسری کتاب اشموئیل کی فصل ۱۱ میں جملہ ۲ تا ۲۷ میں یوں بیان کیا گیا ہے:۔

ہُوا یہ کہ وقتِ غروب داؤد اپنے بستر سے اٹھا اور بادشاہ کے گھر کی چھت پر گردش کی۔ پشتِ بام سے ایک عورت کو دیکھا کہ جو غسل کر رہی ہے۔ وہ عورت بہت ہی خوبصورت اور جاذبِ نظر تھی۔ داؤد نے کسی کو بھیجا اور اس عورت کے بارے میں استفسار کیا۔ کسی نے کہا کہ کیا وہ اوریاہ[1] حتی کی بیوی

---

[1] "اوریاہ" حضرت داؤد کی فوج کے اہم افسروں میں سے تھے۔ اور "حتی" "حت بن کنعان" کی طرف نسبت ہے کہ جس کے قبیلے کو بنی حت کہتے ہیں۔

بت شبع بنت الیعام[1] تو نہیں۔

داؤد نے ایلچی بھیج کر اسے منگوالیا۔ وہ اس کے پاس آئی۔ داؤد اس کے ساتھ سویا۔ وہ اس کی نجاست سے پاک ہونے کے بعد اپنے گھر واپس چلی گئی۔ وہ عورت حاملہ ہوگئی۔ اس نے کسی کو بھیج کر داؤد کو خبر کی کہ میں حاملہ ہوں۔ داؤد نے یوآب[2] کو کہلا بھیجا کہ اوریاہ حتی کو میرے پاس بھیج دے۔ یوآب نے اوریاحتی کو اس کے پاس بھیجا۔ اوریاہ حتی اس کے پاس آیا۔ داؤد نے یوآب کی سلامتی اور جنگ میں اچھا وقت گذارنے کے بارے میں پوچھا۔ پھر داؤد نے اوریاہ سے کہا: اپنے گھر میں جا اور اپنے پاؤں دھو۔ اوریاہ بادشاہ کے گھر سے باہر آیا۔ اس کے پیچھے بادشاہ کی طرف سے کچھ کھانا باہر گیا لیکن اوریاہ بادشاہ کے گھر کے آگے اپنے آقا کے سارے بندوں کے ہمراہ سوگیا اور اپنے گھر میں نہ گیا۔ جب داؤد کو خبر دی گئی کہ اوریاہ اپنے گھر میں نہیں گیا تو داؤد نے اوریاہ سے کہا: کیا تو سفر سے نہیں لوٹا؟ اپنے گھر میں کیوں نہیں گیا؟

اوریاہ نے داؤد سے عرض کی: صندوق، اسرائیل اور یہودا سائبانوں میں قیام پذیر ہیں۔ میرا آقا یوآب اور میرے آقا کے غلام صحرا میں خیمہ نشین ہیں، کیا ہوسکتا ہے کہ میں کھانے پینے اور اپنی بیوی کے ساتھ سونے کے لیے اپنے گھر جاؤں؟ آپ کی جان کی قسم میں یہ کام نہیں کروں گا.....

ہوا یہ کہ داؤد نے بسبع ایک خط یوآب کو لکھا اور اوریاہ کے ہاتھ بھیجا۔ خط میں لکھا تھا کہ اوریاہ کو شدید جنگ میں دھکیل دو اور خود اس کے پیچھے سے ہٹ جاؤ تاکہ یہ مارا جائے اور مر جائے۔

اسی طرح ہوا۔ یوآب نے شہر کا جائزہ لینے کے بعد اوریاہ کو ایسی جگہ پر رکھا جہاں اسے علم تھا کہ بہادروں کی ضرورت ہے۔

شہر کے مردوں نے باہر آکر یوآب سے جنگ کی۔ داؤد کے غلاموں کی قوم میں سے بعض گرے۔ اوریاہ حتی بھی مرگیا ــــــــ اوریاہ کی بیوی نے اپنے شوہر کی موت کا سنا تو خصوصیت سے اپنے شوہر کا سوگ منایا۔ جب یہ سوگ ختم ہوا تو داؤد نے اسے بلوا بھیجا اور اسے اپنے گھر لایا کہ وہ اس کی بیوی ہوگئی.....

لیکن جو کام داؤد نے کیا تھا خدا کو پسند نہیں آیا[3]

---

[1] "بت شبع" اس عورت کا نام ہے (تورات کے بقول) کہ حضرت داؤد نے چھت سے اسے برہنہ دیکھا اور اس کے عشق کی آگ آپ کے دل میں بھڑک اٹھی۔ یہ عورت ایک صاحب منصب عبرانی شخص "الیعام" کی بیٹی تھی۔

[2] "یوآب" حضرت داؤد کی فوج کا کمانڈر تھا۔

[3] کتاب السموئیل، فصل ۱۱ جملہ ۲ تا ۲۷

اس داستان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز داؤد اپنے محل کی چھت پر جاتے ہیں۔ ساتھ والے گھر میں ان کی نظر پڑتی ہے تو انھیں ایک عورت غسل کرتے ہوئے برہنہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر جیسے بن پڑتا ہے اسے اپنے گھر لے آتے ہیں اور وہ داؤد سے حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس عورت کا شوہر لشکرِ داؤد کا ایک اہم افسر تھا۔ وہ ایک پاک طینت اور باصفا شخص تھا۔ داؤد (نعوذ باللہ) ایک بزدلانہ سازش کے ذریعے اسے ایک خطرناک جنگ میں بھجوا کر قتل کروا دیتے ہیں اور پھر اس کی بیوی کو قانونی طور پر اپنے نکاح میں لے آتے ہیں۔

اب آپ داستان کا باقی حصہ موجودہ تورات کی زبانی سنیں۔ اسی کتاب دوم اشموئیل کی ۱۲ویں فصل میں ہے۔

خداوند نے ناتان[1] کو داؤد کے پاس بھیجا اور کہا:

ایک شہر میں دو آدمی رہتے تھے۔ ایک امیر تھا دوسرا غریب۔ امیر آدمی کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں۔ غریب کے پاس بھیڑ کے ایک بچے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک روز ایک مسافر امیر آدمی کے ہاں آیا۔ اس نے اپنی بھیڑوں میں سے مہمان کے لیے غذا تیار کرنے میں پس و پیش کیا۔ غریب کا بھیڑ کا بچہ لے کر اسے ذبح کر دیا۔

اب کیا ہونا تھا، داؤد انتہائی غصے ہوئے۔ ناتان سے کہنے لگے: بخدا جس نے یہ کام کیا وہ قتل کا مستحق ہے۔ اسے ایک بھیڑ کی جگہ پر چار بھیڑیں دینی چاہییں۔ لیکن ناتان نے داؤد سے کہا: "وہ شخص تو ہے"۔

داؤد اپنے غلط کام کی طرف متوجہ ہوئے اور توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کی لیکن اس کے باوجود ان پر بھاری مصیبتیں آئیں۔

اس مقام پر تورات میں ایسی عبارت ہے جس کے ذکر سے قلم کو شرم آتی ہے لہٰذا ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ تورات کی داستان کے اس حصے میں بعض نکات خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہیں، مثلاً:

۱۔ حضرت داؤد کے پاس کوئی شخص قضاوت کے لیے نہیں آیا، بلکہ ان کے ایک مشیر جو نبی تھے انھوں نے نصیحت کے طور پر ان سے ایک داستان بیان کی۔ اس میں دو بھائیوں کا واقعہ اور ان میں سے ایک کا دوسرے سے تقاضا کرنا مذکور نہیں ہے بلکہ ایک امیر اور ایک غریب آدمی کا ذکر ہے جن میں سے ایک کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں جبکہ دوسرے کے پاس بھیڑ کا صرف ایک بچہ تھا لیکن امیر آدمی نے اپنے مہمان کے لیے غریب آدمی کا بھیڑ کا بچہ ذبح کر دیا۔ اس واقعے میں محراب کی دیوار سے اوپر جانے کا ذکر ہے نہ آپ کے دہشت زدہ ہو جانے کی بات ہے، نہ دو بھائیوں کے دعوے کا معاملہ ہے اور نہ ہی توبہ و بخشش کی درخواست کا بیان ہے۔

۲۔ داؤد نے اس ظالم امیر شخص کو قتل کا مستحق سمجھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ کے لیے آخر قتل کیوں؟

---

[1] بنی اسرائیل کے ایک نبی اور حضرت داؤد کے مشیر

۲۔ ساتھ ہی انھوں نے اس حکم کے خلاف حکم صادر کیا اور کہا کہ ایک بھیڑ کے بدلے اُسے چار بھیڑیں دینی چاہییں۔ آخر کس بناء پر؟

۴۔ داؤد نے اوریاہ کی بیوی کے بارے میں خیانت سے متعلق اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔

۵۔ خدا نے انھیں معاف کر دیا (اتنی آسانی سے، کس بناء پر؟)۔

۶۔ اللہ نے داؤد کے بارے میں عجیب و غریب سزا کا فیصلہ کیا کہ جسے نقل نہ کرنا بہتر ہے۔

۷۔ یہی عورت ایسے "روشن ماضی" کے باوجود سلیمان کی ماں بنی۔

ان داستانوں کا ذکر واقعاً تکلیف دہ ہے لیکن کیا کیا جا سکتا ہے کہ بعض جاہل افراد نے نادانی سے ان اسرائیلی روایات کے زیر اثر قرآن مجید کی پاک و پاکیزہ آیات کا چہرہ بھی سیاہ کر دیا ہے اور ایسی باتیں کہی ہیں کہ حق کو واضح کرنے کے لیے اس رسوا داستان کا کچھ حصہ ذکر کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

اب ہم سوال کرتے ہیں:۔

۱۔ وہ نبی کہ گزشتہ آیات میں اللہ نے جس کے دس عظیم اوصاف بیان کیے ہیں اور پیغمبر اسلامؐ کو جس کی سرگزشت سے ہدایت حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے، کیا ممکن ہے کہ ان تہمتوں کے ہزارویں حصے کی بھی اس کی طرف نسبت دی جا سکے؟

۲۔ قرآن مجید بعد کی آیات میں کہتا ہے:

یا داؤد انا جعلناک خلیفة فی الارض

اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں اپنا خلیفہ اور نمائندہ بنایا

کیا یہ آیت مذکورہ خرافات سے ہم آہنگ ہے؟

۳۔ اگر کوئی عام شخص ہو، خدا کا نبی نہ ہو اور وہ اس قسم کے جرم کا مرتکب ہو، اپنے وفادار پاک طینت با ایمان افسر کی بیوی کو ایسے گھٹیا طریقے سے اس کے ہاتھوں سے کھسکا لے تو لوگ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گے اور اس کی سزا کیا ہو گی؟ یہاں تک کہ اگر یہ کام افسق الفاسقین سے سرزد ہو تب بھی جائے تعجب ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تورات نے حضرت داؤد کو پیغمبر قرار نہیں دیا تاہم ان کا ذکر ایک بلند مرتبہ عادل حکمران کے طور پر کیا ہے، کہ جو بنی اسرائیل کے عظیم عبادت خانے کا مؤسس تھا۔

۴۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ تورات کی مشہور کتب میں سے ایک "مزامیر داؤد" ہے جس میں حضرت داؤد کی مناجات ہیں۔ کیا ایسے شخص کی مناجات اور باتیں کتب آسمانی کا حصہ قرار دی جا سکتی ہیں؟

۵۔ جو شخص تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ موجودہ تحریف شدہ تورات کی داستانیں خرافات کا ایسا مجموعہ ہیں جو مکتب انبیاء کے دشمنوں یا بہت ہی بے شعور اور جاہل افراد کی ساختہ و پرداختہ ہیں۔ لہٰذا انھیں کس طرح بحث کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے؟

جی ہاں! قرآن کی یہ عظمت ہے کہ وہ ایسی خرافات سے بالکل پاک ہے۔

۲۔ اسلامی روایات اور قصۂ داؤدؑ: اسلامی روایات میں تورات کی بیان کردہ قبیح اور بے ہودہ داستان کی نہایت سختی سے تکذیب کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:۔

لا اوتی برجل یزعم داؤد تزوج امرئۃ اوریا الا جلدتہ حدین حدًا للنبوۃ وحدًا للاسلام

اگر کسی ایسے شخص کو میرے پاس لایا جائے کہ جو یہ کہے کہ داؤدؑ نے اوریاہ کی بیوی سے شادی کی۔ تو میں اس پر دو حدیں جاری کروں گا ایک حد نبوت کے لیے اور دوسری اسلام کے لیے[1]

کیونکہ اس میں ایک طرف تو ایک مردِ مومن کی طرف ایک غیر شرعی امر کی نسبت ہے اور دوسری طرف مقامِ نبوت کی ہتک حرمت ہے۔ لہٰذا ایسی بات کرنے والے پر دو مرتبہ حدِ قذف جاری ہونی چاہیے اور اسے دو مرتبہ اسّی کوڑے لگائے جانے چاہییں۔

امام بزرگوار حضرت علیؑ ہی سے یہی مفہوم ایک اور انداز سے منقول ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں۔

من حدثکم بحدیث داؤد علی ما یرویہ القصاص جلدتہ مائۃ ستین

جو شخص تم سے قصۂ داؤدؑ اس طرح بیان کرے کہ جیسے افسانہ گو کہتے ہیں تو میں اسے ایک سو ساٹھ کوڑے لگاؤں گا[2]

ایک اور حدیث شیخ صدوق نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے امالی میں درج کی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:۔

ان رضا الناس لا یملک، والسنتھم لا تضبط، الم ینسبوا داؤد الی انہ تبع الطیر حتی نظر الی امرئۃ اوریا فھواھا، و انہ قدم زوجھا امام التابوت حتی قتل تزوج بھا

سب لوگوں کو راضی نہیں کیا جا سکتا اور نہ سب کی زبانیں بند کی جا سکتی ہیں۔ کیا انھوں نے یہ (انتہائی قبیح) تہمت داؤدؑ پر نہیں باندھی کہ وہ ایک پرندے کے پیچھے اپنے محل کی چھت پر گئے تو ان کی نظر اوریاہ کی بیوی پر پڑی اور وہ اس پر فریفتہ ہو گئے۔ پھر اس کے شوہر کو میدانِ جنگ میں تابوت کے آگے آگے بھیج دیا (جس میں انبیاء بنی اسرائیل کی یادگاریں رکھی جاتی تھیں اور برکت کے طور پر اسے فوج کے آگے آگے رکھا جاتا تھا)۔ یہاں تک کہ وہ مارا گیا اور پھر انھوں نے اس کی بیوی سے شادی کر لی (جب اللہ کا عظیم نبی لوگوں کی زبان سے مامون نہ رہا ہو تو دوسروں کو ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے)[3]

ایک حدیث عیون الاخبار میں امام علی بن موسیٰ الرضا علیہم السلام سے منقول ہے۔ آپؑ مختلف مذاہب کے اربابِ مذہب سے

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فخر الدین رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[3] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۶، بحوالہ امام صدوق۔

عصمتِ انبیاء کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس دوران میں آپؑ نے حاضرین میں سے علی بن جہم سے فرمایا: "تم داؤدؑ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

اس نے کہا: کہتے ہیں کہ داؤد اپنی محراب میں مشغولِ عبادت تھے کہ شیطان ایک خوبصورت پرندے کی صورت میں ان کے سامنے آیا۔ داؤد نے نماز توڑ دی اور اس پرندے کے پیچھے ہو لیے ..... پھر انھوں نے اوریاہ کی بیوی کو غسل کرتے ہوئے دیکھا تو اس پر عاشق ہو گئے۔ پھر انھوں نے اس کے شوہر کو تابوت کے آگے آگے میدانِ جنگ میں بھجوا دیا، وہ مارا گیا تو داؤد نے اس کی بیوی سے شادی کر لی۔

اس نے یہ افسانہ بیان کیا تو امام علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ بہت ناراض ہوئے، آپؑ کو بہت دُکھ ہوا، آپؑ نے اپنا ہاتھ پیشانی پر مارا اور فرمایا:۔

انّا للہ و انّا الیہ راجعون،

لقد نسبتم نبیًّا من انبیاء اللہ الی التھاون بصلاتہ حتی خرج فی اثر الطیر، ثم بالفاحشۃ ثم بالقتل

انّا للہ و انّا الیہ راجعون،

تم نے انبیاءِ الٰہی میں سے ایک نبی کی طرف اپنی نماز میں سُستی کرنے اور اسے معمولی سمجھنے کی نسبت دی۔ یہاں تک کہ (تمھاری نسبت کے مطابق وہ بچوں کی طرح) پرندے کے پیچھے گیا، پھر تم نے اس کی طرف فحشاء اور بُرائی کی نسبت دی اور اس کے بعد ایک بے گناہ انسان کے قتل سے متہم کیا۔

علی بن جہم نے پوچھا: پھر داؤد کی لغزش کیا تھی؟ کہ جس پر انھوں نے استغفار کی اور قرآن میں جس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

امامؑ نے مسئلہ قضاوت میں حضرت داؤدؑ کی جلد بازی کا ذکر کیا اور بعد والی آیت کو بطور شاہد پیش فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

یا داؤد انّا جعلناک خلیفۃ فی الارض

اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے

امامؑ فرماتے ہیں:۔

حضرت داؤدؑ کے زمانے میں جن عورتوں کے شوہر مر جاتے یا قتل ہو جاتے وہ پھر کبھی شادی نہ کرتی تھیں (اور یہ امر بہت سی برائیوں اور قباحتوں کی بنیاد تھا) حضرت داؤدؑ وہ پہلے شخص تھے جن پر اللہ نے اس کام کو مباح قرار دیا (تاکہ یہ رسم ختم ہو جائے اور بیوہ عورتیں اس مصیبت سے نجات پائیں) لہٰذا جب اوریاہ (اتفاق سے ایک جنگ میں) مارے گئے تو داؤدؑ نے ان کی بیوی سے شادی کر لی، اور یہ امر اس زمانے کے لوگوں پر بہت گراں گزرا (اور بعد ازاں اس پر انھوں نے افسانے گھڑ لیے)[1]

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۵ بحوالہ عیون الاخبار

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ اوریاہ کی ایک سادہ سی حقیقت پر بنیاد تھی۔ حضرت داؤدؑ نے ایک کام الٰہی ذمہ داری کے طور پر انجام دیا تھا۔ لیکن دانا دشمنوں، نادان دوستوں اور افسانہ طرازوں نے کہ جنھیں عجیب وغریب باتیں بنانے اور جھوٹ گھڑنے کی عادت تھی اس واقعے پر خوب حاشیہ آرائی کی اور ایسی ایسی باتیں بنائیں کہ انسان کو وحشت ہوتی ہے۔

کسی نے کہا: اس شادی کی کچھ نہ کچھ بنیاد تو ضرور ہے۔

دوسرے نے کہا: ضروری بات ہے کہ اوریا کا گھر داؤد کی ہمسائگی میں ہوگا۔

آخر کسی نے داؤدؑ کی نظریں اوریا کی بیوی پر ڈلوائیں، پرندے کا قصہ گھڑا۔

آخر کار اس عظیم پیغمبرؑ کو طرح طرح کے شرمناک گناہانِ کبیرہ سے متہم کیا گیا۔ پھر بے وقوف جاہلوں نے ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچایا اور اگر اس افسانے کا ذکر مشہور کتب میں نہ ہوتا تو ہم بھی اسے نقل کرنا غلط سمجھتے۔

البتہ حضرت امام رضا علیہ السلام کی مذکورہ روایت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی روایت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول حدیث میں اس مشہور جھوٹی داستان کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں (نعوذ باللہ) اس عظیم نبی کی طرف زنا وغیرہ کی نسبت دی گئی ہے۔

مفسّرین کی توجیہات

بعض مفسّرین نے قصۂ داؤدؑ سے متعلق کچھ اور توجیہات کی ہیں۔ وہ توجیہات اگرچہ آیات کے ظاہری مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہیں تاہم تکمیلِ بحث کے لیے ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرنا ہم غیر مناسب نہیں سمجھتے۔

۱۔ ایک یہ ہے کہ حضرت داؤد نے اپنے اوقات کو ایک پروگرام کے تحت منظم کیا ہوا تھا اور مخصوص اوقات کے علاوہ آنے والوں سے نہیں ملتے تھے۔ ایک روز دو افراد کہ جو آپ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے وہ محراب کی دیوار سے اوپر چڑھ آئے۔ جبکہ آپ محراب میں عبادتِ الٰہی میں مشغول تھے۔ جب انھوں نے آپ کے گرد محافظین کو دیکھا تو ڈر گئے (لہٰذا انھوں) نے فوراً ایک جھوٹ گھڑا۔ کہنے لگے ہم دونوں ایک شکایت لے کر آپ کے پاس فیصلے کے لیے آئے ہیں اور پھر وہ ماجرا بیان کیا کہ جو قرآن میں آیا ہے۔ حضرت داؤدؑ نے ان کے درمیان فیصلہ تو کر دیا لیکن چونکہ جانتے تھے کہ یہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہیں لہٰذا غصّے ہوئے اور ان سے انتقام لینے کا ارادہ کیا لیکن زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ آپ اپنے اس ارادے پر پشیمان ہوئے اور استغفار کی[1]

۲۔ المیزان کے عظیم مفسّر نے اس سلسلے میں جو بات کہی ہے وہ بنیادی طور پر اس سے ہم آہنگ ہے جو دیگر عظیم مفسّرینِ اسلام نے قصۂ داؤد کی تفسیر میں کہی ہے۔ ہم بھی سطورِ بالا میں اسے بیان کر آئے ہیں۔ لیکن صاحب المیزان کا بیان چند ایک جہات سے مختلف ہے۔ لہٰذا ہم اسے یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

بہت سے مفسّرین کا نظریہ ہے کہ حضرت داؤدؑ کے پاس شکایت کے لیے آنے والے دو فرشتے تھے۔

---

[1] "فخر رازی" اور "روح المعانی" کی تفسیر میں یہ بحث ایک ہی مضمون کے تحت ذکر کی گئی ہے۔ اور "مراغی" نے بھی اپنی تفسیر میں اسی بات کو قبول و تسلیم کیا ہے۔

جنھیں اللہ نے داؤدؑ کی آزمائش کی غرض سے بھیجا تھا لیکن داستان کی خصوصیات مثلاً محراب سے اوپر جانا اور خلافِ معمول طریقے سے داؤدؑ کے پاس جانا اور ان کا گھبرا جانا، نیز یہ کہ یہ واقعہ ایک الٰہی آزمائش تھا یہ سب چیزیں نشاندہی کرتی ہیں کہ فرشتوں کے تمثل کی صورت میں دو آدمیوں کے لباس میں رونما ہوا تھا (تمثل سے مراد یہ ہے کہ خارجی وجود میں کوئی بھی نہیں آیا تھا بلکہ حضرت داؤدؑ کی قوتِ ادراک میں یوں ہوا کہ دو فرشتے تھے جو انسانوں کی صورت میں آئے تھے)۔

لہٰذا اس دعویٰ میں انھوں نے جو حکم صادر کیا وہ ظرفِ تمثل میں تھا جیسے انھوں نے خواب دیکھا ہو، تو جیسے عالمِ خواب میں رونما ہونے والے واقعات میں انسان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، ظرفِ تمثل میں بھی اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، ذمہ داری کا تعلق تو عالمِ شہود سے ہے یعنی عالمِ مادہ سے، اور اگر کوئی خطاء حضرت داؤد سے سرزد ہوئی بھی ہے تو اس کا تعلق اسی ظرفِ تمثل سے ہے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو مقامِ عصمت کے منافی ہو، بہشت میں آدمؑ کی خطاء کی طرح، زمین پر اترنے سے پہلے کہ جو تکلیفِ شرعی اور ذمہ داری کا مقام ہے، اس لحاظ سے حضرت داؤدؑ نے جو استغفار کی وہ ایک حقیقی گناہ سے استغفار نہ تھی[1]

لیکن آیات کا ظاہری مفہوم یقیناً یہ ہے کہ شکایت اور دعویٰ دائر کرنے والے افراد خارجی وجود رکھتے ہیں، تاہم مذکورہ فیصلہ گناہ نہ تھا، کیونکہ یہ فیصلہ شکایت کنندہ کی گفتگو سن کر علم و یقین حاصل کرنے کے بعد تھا۔ اگرچہ قضاوت کے مستحب آداب کا تقاضا تھا کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیا جاتا اور ان کی استغفار بھی اسی ترکِ اولیٰ پر تھی۔

بہر حال اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس واقعے کو ہم ظرفِ تمثل سے متعلق سمجھیں یا اسے بعض کے بقول خدا تعالیٰ کی طرف سے حضرت داؤد کو متنبہ کرنے کے لیے ایک آزمائش قرار دیں، بہتر یہی ہے کہ آیات کے ظاہری مفہوم کی حفاظت کی جائے اور جیسا کہ کہا گیا ہے ایسی تفسیر کی جائے کہ جس سے آیت کے الفاظ کا ظہور بھی محفوظ رہتا ہو اور انبیاء کے مقامِ عصمت پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔

---

[1] المیزان، جلد ۱۷ ص ۲۰۳

۲۶۔ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ۝

۲۷۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝

۲۸۔ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ ۝

۲۹۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں (اپنا) خلیفہ (اور نمائندہ) قرار دیا ہے۔ لوگوں کے درمیان کے حق کے مطابق فیصلہ کر اور ہوائے نفس کی پیروی نہ کر کیونکہ یہ تجھے راہِ حق سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ راہِ خدا سے منحرف ہو جائیں، روزِ حساب کو فراموش کرنے کی بنا پر ان کے لیے شدید عذاب ہے۔

۲۷۔ ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے فضول پیدا نہیں کیا، یہ کافروں کا گمان ہے، وائے ہے کافروں کے لیے، (جہنم کی) آگ سے۔

۲۸۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انھوں نے عملِ صالح انجام دیئے ہیں، کیا ہم انھیں زمین میں فساد برپا کرنے والوں کی طرح قرار دے دیں یا پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح قرار دے لیں؟

۲۹۔ یہ بابرکت کتاب ہے کہ جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور اہلِ فکر و نظر متوجہ ہوں۔

تفسیر

عدل کرو اور ہوائے نفس سے بچو

گزشتہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اب آخر میں حضرت داؤد سے خطاب فرماتے ہوئے ان کے بلند کردار کا ذکر کیا جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ ان کی سنگین ذمہ داریوں کا ذکر دو ٹوک انداز میں اور معنی خیز عبارت کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں (اپنا) خلیفہ (اور نمائندہ) قرار دیا ہے۔ لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کر اور ہوائے نفس کی پیروی نہ کر کیونکہ وہ تجھے راہِ خدا سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے منحرف ہو جائیں ان کے لیے روزِ حساب کو فراموش کرنے کی وجہ سے شدید عذاب ہے (یا داؤد انا جعلناك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله ان الذين يضلون عن سبيل الله لهم عذاب شديد بما نسوا يوم الحساب)۔

اس آیت میں حضرت داؤد کے بلند مرتبے کا ذکر ہے اور ان کے اہم منصب کی بات کی گئی ہے۔ اس آیت کا مضمون نشاندہی کرتا ہے کہ زوجۂ اوریا کے ساتھ ان کی شادی کے لوگوں نے جو جھوٹے افسانے تراشے ہیں وہ کس قدر بے بنیاد ہیں۔

کیسے ممکن ہے کہ اللہ ایسے شخص کو زمین کی خلافت سونپ دے اور مقامِ قضاوت اس کے سپرد کر دے جو مومنین اور اپنے یار و انصار کی ناموس پر خیانت بھری نظریں گاڑے ہوئے ہو اور اس کا ہاتھ بے گناہوں کے خون سے آلودہ ہو؟

اس آیت میں پانچ جملے ہیں اور ہر جملہ ایک حقیقت کا ترجمان ہے۔

پہلی حقیقت زمین میں داؤدؑ کا مقامِ خلافت ہے۔ اس سے مراد گزشتہ انبیاء کی خلافت و جانشینی ہے یا خلافتِ الٰہی؟ ہماری نظر میں دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے اور یہی معنی سورۂ بقرہ کی آیت ۳۰ سے ہم آہنگ ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے:

واذ قال ربك للملائكة انى جاعل فى الارض خليفة

اس وقت کو یاد کر جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں خلیفہ بنا رہا ہوں۔

البتہ لفظ خلافت کے حقیقی معنی کے لحاظ سے تو اللہ کی خلافت کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ یہ تو ان کے لیے ہوتی ہے جن کے لیے وفات یا غیبت کا معنی صادق آتا ہو۔ یہاں اس سے مراد بندوں میں اس کی نمائندگی اور زمین میں اس کے فرامین کا اجراء ہے۔

یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ زمین میں حکومت کا منشاء و مصدر حکومتِ الٰہی ہونا چاہیے اور جو حکومت اس راستے کے علاوہ ہو وہ ظالمانہ اور غاصبانہ حکومت ہے۔

دوسرے جملے میں حکم دیا جا رہا ہے کہ اب جبکہ تجھے یہ عظیم نعمت دی جا چکی ہے، تیری ذمہ داری ہے کہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کر۔ درحقیقت خلافتِ الٰہیہ کا نتیجہ حق کی حکومت ہے۔ اس جملے سے یہ استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ حق حکومت بھی صرف خلافتِ الٰہیہ سے پیدا ہوتا ہے اور براہِ راست اسی کا نتیجہ ہے۔

تیسرے جملے میں ایک حاکم عادل کو درپیش اہم ترین خطرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہوائے نفس کی

ہرگز پیروی نہ کرنا۔

جی ہاں! ہوائے نفس حقیقت بین انسان کی آنکھوں کے سامنے ایک ضخیم پردہ ڈال دیتی ہے اور اس کے اور عدالت کے درمیان جدائی ڈال دیتی ہے۔

لہٰذا چوتھے جملے میں فرمایا گیا ہے: اگر تو نے ہوائے نفس کی پیروی کی تو وہ تجھے راہِ خدا سے کہ جو راہِ حق ہے بھٹکا دے گی۔

لہٰذا جہاں کہیں بھی گمراہی ہے اس میں ہوائے نفس کا ہاتھ ہے اور جہاں بھی ہوائے نفس ہے اس کا نتیجہ گمراہی ہے، جو حاکم ہوائے نفس کا پیرو ہو وہ لوگوں کے مفادات وحقوق کو اپنی اغراض پر قربان کر دے گا۔ اسی لیے اس کی حکومت ناپائیدار ہوگی اور شکست کا سامنا کرے گی۔

ہوسکتا ہے اس مقام پر ہوائے نفس کا ایک وسیع معنی ہو کہ جس میں انسان کی اپنی خواہشِ نفس بھی شامل ہے اور لوگوں کی خواہشات بھی۔ اس طرح قرآن ان تمام مکاتب کی نفی کرتا ہے کہ جو عوامی افکار کی پیروی کو حکومتوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کا نتیجہ طریقِ الٰہی اور صراطِ حق سے گمراہی ہے۔

موجودہ زمانے میں ہم اس طرزِ فکر کے ذلت بار نتائج کے شاہد ہیں جو بزعم خود متمدن دنیا میں رُونما ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات لوگوں کی خواہشات کے باعث قبیح ترین اعمال بھی قانونی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرزِ عمل نے ذلت ورسوائی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ قلم کو بیان کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہے۔

یہ درست ہے کہ حکومت کی اساس دوشِ عوام ہی کو ہونا چاہیے اور ان کی شرکت ہی سے حکومت تشکیل پانا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حق وباطل کا معیار ہر جگہ اور مسئلے میں اکثریت کی خواہشات قرار پا جائیں۔ حکومت کے ستون حق پر استوار ہونے چاہییں اور ان کی تعمیر واستحکام کے لیے عوامی قوت سے مدد لینا چاہیے اور "اسلامی جمہوریہ" کا یہی معنی ہے۔ یہ اصطلاح "اسلامی" اور "جمہوریہ" دو لفظوں سے مرکب ہے اور اسی کے ہم قائل ہیں۔ بالفاظِ دیگر اصول مکتب ودین سے لیے جائیں اور ان کے اجراء کے لیے لوگوں کو شریک کیا جائے (غور کیجیے گا)۔

آخر میں پانچویں جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ راہِ حق سے گمراہی کا سرچشمہ "یوم الحساب" کی فراموشی ہے اور اس کا نتیجہ شدید عذابِ الٰہی ہے۔

اصولی طور پر روزِ قیامت کی فراموشی ہمیشہ گمراہیوں کا سرچشمہ ہے اور ہر گمراہی میں اس فراموشی کا حصہ ہے اور یہ اصولِ معاد کی طرف توجہ، انسانی زندگی میں اس کے تربیتی اثر کو واضح کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی کتب میں منقول روایات بہت غور طلب ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور حدیث پیغمبر گرامیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ انھوں نے فرمایا:

ایھا الناس ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان اتباع الھوٰی وطول الامل فاما اتباع الھوٰی فیصد عن الحق واما طول الامل فینسی الاٰخرۃ

اے لوگو! وحشت ناک ترین چیزیں دو ہیں کہ جن کی جانب سے میں تمھارے بارے میں ڈرتا ہوں،

ایک ہے ہوا و ہوس کی پیروی اور دوسری ہے لمبی چوڑی امیدیں ۔ ہوا و ہوس کی پیروی تو تمھیں حق سے منحرف کر دے گی اور لمبی چوڑی اُمیدیں تمھیں قیامت بھلا دیں گی [1]

حق ہے کہ اس جملے کو آبِ زر سے لکھا جائے اور یہ ہر دیکھنے والے بالخصوص حکمرانوں، قاضیوں اور اہلِ منصب کے سامنے رہے

ایک اور روایت کہ جو امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے، اس میں آپؑ فرماتے ہیں :

ثلاث موبقات : شح مطاع و هوی متبع و اعجاب المرء بنفسه

تین چیزیں آدمی کو ہلاک کر دیتی ہیں :

۱۔ اطاعت کے موقع پر بخل ،

۲۔ ہوائے نفس کہ جس کی پیروی کی جائے اور

۳۔ انسان کا اپنے آپ سے خوش ہونا [2]

حضرت داؤدؑ کی زندگی اور زمین میں ان کے لیے خلافتِ الٰہی کا ذکر کرنے کے بعد جہانِ ہستی کے بامقصد ہونے کا ذکر آیا ہے تاکہ زمین پر حکومت کی جہت واضح ہو جائے کہ جو اس تمام نظامِ ہستی کا ایک حصہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آسمان و زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اسے ہم نے باطل اور فضول پیدا نہیں کیا، یہ تو کافروں کا گمان ہے، افسوس کافروں پر آتشِ دوزخ سے (و ما خلقنا السماء والارض وما بینهما باطلاً ذالك ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار)۔

اہم ترین مسئلہ کہ جو تمام حقوق کا سرچشمہ ہے وہ خلقت کا بامقصد ہونا ہے۔ جب ہم نے تخلیقِ کائنات کے بارے میں اپنے عقیدے میں یہ بات قبول کر لی کہ یہ عالمِ وسیع خداوند بزرگ نے فضول پیدا نہیں کیا تو فوراً ہمیں اس کے ہدف کی تلاش ہوتی ہے۔ اس ہدف کو مختصر الفاظ میں "تکامل" "تعلیم" اور "تربیت" کے معنی خیز الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حکومتوں کو بھی اسی راستے پر گامزن ہونا چاہیے۔ انھیں تعلیم و تربیت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہئیں اور انھیں انسانوں کے روحانی کمال کا ذریعہ ہونا چاہیے۔

دوسرے الفاظ میں عالمِ ہستی حق و عدالت کی بنیاد پر قائم ہے اور حکومتوں کو بھی پوری کائنات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ یعنی انھیں حق و عدالت کے اصولوں پر استوار ہونا چاہیے۔

ضمنی طور پر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ گزشتہ آیت کا آخری جملہ کہ جس میں روزِ جزا کی فراموشی کا ذکر ہے: زیرِ بحث آیت کے مضمون سے پوری طرح ہم آہنگ ہے کیونکہ مقصد تخلیقِ کائنات کا تقاضا ہے کہ روزِ جزا موجود ہے اور جیسا کہ ہم سورۂ یٰس کی تفسیر کے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲

[2] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۵۲، بحوالہ کتاب خصال

اختتام پر معاد سے متعلق بحث میں کہہ چکے ہیں اگر روزِ حساب موجود نہ ہو تو اس جہان کی تخلیق بے معنی، بے مقصد، فضول اور مہمل ہوگی۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ اس آیت کے اختتام پر ایک واضح خط کی جانب اشارہ موجود ہے جو مکتبِ ایمان کو کفر سے جدا کرتا ہے اور وہ ہے الحادی مکاتب میں عالم کا بے مقصد ہونا کہ جس کے بعض نمونوں میں ہم آج بھی گرفتار ہیں۔ وہ صراحت سے اعلان کرتے ہیں کہ یہ جہان بے مقصد اور بے ہدف ہے ایسے تصورِ کائنات کی موجودگی میں وہ لوگ اپنی حکومتوں میں حق و عدالت کو کیسے جاری کر سکتے ہیں یہ فقط الٰہی نظریہ کائنات ہے کہ جس کی بنیاد پر وجود میں آنے والی حکومت حق و عدالت کو جاری کر سکتی ہے کیونکہ اس نظریئے کے مطابق تخلیقِ عالم کا کوئی ہدف و مقصد ہے اور اس جہان کا کوئی حساب شدہ نظام موجود ہے کہ حکومت کو بھی اس کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ الحادی حکومتیں آج جنگ و صلح اور اقتصاد و ثقافت کے جن مسائل میں پھنس چکی ہیں ان کی اصلی وجہ اسی میں تلاش کرنا چاہیے۔ ان کے اسی نظریئے کی وجہ سے ان کی کارگزاری کی اصل بنیاد زور، زبردستی اور اقتدار ہے اور ہر کسی کے لیے وہ اسی کے قائل ہیں کہ جو وہ طاقت اور ظلم سے حاصل کر لیتا ہے اور ایسی دنیا کس قدر وحشت ناک ہے کہ جو اس طرزِ فکر کی بنیاد پر عمل پیرا ہو اور جس کا نظام اس نظریئے کے مطابق چلے۔

بہر حال خدا تعالیٰ حکیم ہے اور ممکن نہیں کہ وہ اس عظیم کائنات کو بے ہدف پیدا کرے اور یہ ہدف جبھی پورا ہوگا کہ یہ عالم ایک وسیع تر اور عظیم تر جہان کے لیے مقدمہ ہو وہ جہان کہ جو ابدیت سے وابستہ ہو اور جو عالمِ دنیا کا جواز فراہم کرے۔

بعد کی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: کیا ممکن ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک کام انجام دیئے ہیں، انھیں ہم ان جیسا قرار دے دیں کہ جو زمین میں فساد برپا کرنے والے ہیں (ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض)[1]۔ اور کیا ممکن ہے کہ ہم پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح قرار دیں (ام نجعل المتقین کالفجار)۔

نہ تخلیق بے ہدف ممکن ہے اور نہ نیک اور بد میں مساوات ممکن ہے کیونکہ نیک لوگ اہدافِ تخلیق کے مطابق قدم اٹھاتے ہیں اور مقصد کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں جب کہ برے لوگ مخالف سمت پر گامزن ہیں۔

درحقیقت معاد کی بحث اس آیت میں اور قبل کی آیت میں مستدل طور پر تمام پہلوؤں کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

ایک طرف تو یہ فرمایا گیا ہے کہ حکمتِ خالق کا تقاضا ہے کہ تخلیقِ کائنات کا کوئی ہدف ہو (اور یہ ہدف دوسرے جہان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی اتنی اہم نہیں ہے کہ اس عظیم کائنات کا ہدف ہو سکے۔)

دوسری طرف حکمت و عدل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد اور عادل و ظالم یکساں نہ ہوں اور یہی امر قیامت، جزا و سزا اور جنت و جہنم کا مقتضی ہے۔

اس انسانی معاشرے میں فاجر، مومنین کے برابر اور برے نیکوں کے ساتھ نظر آتے ہیں بلکہ بہت سے مواقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ

---

[1] بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہاں "ام" "بل" کے معنی میں اضراب کے لیے ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ "ام" استفہامِ محذوف پر عطف ہو اور تقدیر میں اس طرح ہے:

اخلقنا السماوات والارض باطلا ام نجعل المتقین کالفجار

بدکار مفسد لوگ زیادہ عیش و آرام میں ہیں۔ اگر اس جہان کے بعد کوئی جہان نہ ہو کہ جس میں عدالت حکم فرما ہو تو اس جہان کی وضع خلافِ حکمت بھی ہے اور خلافِ عدل بھی اور یہ خود مسئلہ معاد کے لیے ایک دلیل ہے۔

دوسرے الفاظ کبھی اثباتِ معاد کے لیے برہانِ حکمت سے استدلال کیا جاتا ہے اور کبھی برہانِ عدالت سے۔ گزشتہ آیت میں پہلی طرح کا استدلال ہے اور دوسری آیت میں دوسری طرح کا۔

زیرِ بحث آخری آیت میں ایسے مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ جو درحقیقت ہدف کائنات کو پورا کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ بابرکت کتاب ہے کہ جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور و فکر کریں اور صاحبانِ عقل متوجہ ہوں (کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا اٰیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب)۔

اس کی تعلیمات جاوداں ہیں اور اس کے احکام گہرے اور عمیق ہیں اور اس کے پروگرام حیات بخش اور ہدایت کنندہ ہیں کہ جو انسان کو ہدفِ تخلیق کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس عظیم کتاب کے نزول کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ اس کی تلاوت کی جائے اور اسے زبان پر جاری کر لیا جائے اور بس۔ بلکہ مقصد یہ تھا کہ اس کی آیات فکر و نظر اور سوچ بچار کا سرچشمہ بنیں۔ اور ضمیر و وجدان کی بیداری کا سبب بنیں اور پھر یہ بیداری حرکتِ عمل کا باعث بنے۔

"مبارک" جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایسی چیز کے معنی میں ہے کہ جو دائمی خیر کی حامل ہو اور قرآن کے بارے میں یہ تعبیر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی معاشرہ اس کی تعلیمات سے دائماً استفادہ کر سکتا ہے اور چونکہ یہ لفظ بطور مطلق استعمال ہوا ہے اس لیے دنیا و آخرت کی ہر طرح کی خیر و سعادت پر محیط ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر تم خیر و برکت کے طلب گار ہو تو تمھاری خواہش اس میں موجود ہے بشرطیکہ تم اس میں تدبر کرو اور اس سے ہدایت حاصل کرو اور حرکت میں آؤ۔

چند اہم نکات

۱۔ تقویٰ اور فجور ایک دوسرے کی ضد: زیرِ بحث آیات میں "فساد فی الارض" کو "ایمان و عمل صالح" کے مدمقابل قرار دیا گیا ہے نیز "فجور" (دین کا پردہ چاک کرنا) تقویٰ و پرہیزگاری کی ضد قرار دیا گیا ہے کیا ان دونوں عبارتوں میں ایک ہی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے یا دو مطالب کو بیان کیا گیا ہے؟

بعید نہیں ہے کہ دونوں عبارتوں میں ایک ہی حقیقت کو بیان کیا گیا ہو۔ کیونکہ "متقین" "نیک عمل کرنے والے مومنین" ہی ہیں اور "فجار" "مفسدین فی الارض" ہی ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پہلا جملہ اعتقادی اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو اور صحیح عقیدے کے ساتھ نیک عمل کرنے والوں کا مواز فاسد العقیدہ اور فاسد العمل لوگوں سے کیا جا رہا ہو۔ جبکہ دوسرا جملہ صرف عملی پہلو کی طرف اشارہ ہو۔

یہ فرق بھی ممکن ہے کہ "تقویٰ" انسان کے انفرادی کمال اور "فجور" انسان کے انفرادی تنزل کی طرف اشارہ ہو جبکہ عملِ صالح اور

فساد فی الارض معاشرتی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو۔

لیکن ان میں سے تاکید والی پہلی تفسیر ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ یہ آیات کس کے بارے میں ہیں؟ ایک روایت میں ان آیات کی تفسیر کے بارے میں ہے کہ "الذین آمنوا و عملوا الصالحات" سے امیرالمؤمنین حضرت علیؑ اور ان کے یار و انصار کی طرف اشارہ ہے جبکہ "المفسدین فی الارض" کا اشارہ ان کے مخالفین کی طرف ہے۔[1]

ایک اور حدیث جو ابن عساکر نے ابن عباس سے نقل کی ہے اس میں ہے کہ "الذین آمنوا" سے مراد حضرت علیؑ، حضرت حمزہ اور جناب عبیدہ ہیں کہ جو میدان بدر میں عتبہ، ولید اور شیبہ کے مقابلے میں نکلے تھے کہ جو لشکرِ شرک میں سے تھے اور ان سے دست بدست لڑائی کی اور ان پر غالب آئے۔ "المفسدین فی الارض" سے مراد تین مذکورہ افراد ہیں کہ جو لشکرِ کفر و شرک میں سے ہیں۔[2]

واضح ہے کہ ان روایات کا مفہوم یہ نہیں کہ آیت کو خاص افراد میں منحصر کر دیا جائے بلکہ اس سے شانِ نزول مراد ہے یا روشن و واضح مصداق۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ ص ۴۵۳ (حدیث ۳۷)

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۳ ص ۱۰۱

۳۰۔ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ؕ ○

۳۱۔ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۙ ○

۳۲۔ فَقَالَ اِنِّيْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ○ وقفة

۳۳۔ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ○

ترجمہ

۲۰۔ ہم نے داؤدؑ کو سلیمان عطا کیا، کیا ہی اچھا بندہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اللہ کی طرف بازگشت کرتا تھا۔ (اور اس کی یاد میں رہتا تھا)۔

۲۱۔ وہ وقت یاد کر جب وقتِ عصر انھوں نے چابک اور تیز رفتار گھوڑے اس کے سامنے پیش کیے۔

۲۲۔ تو اس نے کہا: ان گھوڑوں کو میں اپنے رب کی خاطر پسند کرتا ہوں (میں چاہتا ہوں کہ جہاد میں ان سے کام لوں اور وہ اسی طرح انھیں دیکھتا رہا)۔ یہاں تک کہ وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

۲۳۔ (وہ اس قدر جاذبِ نظر تھے کہ اس نے کہا کہ) انھیں دوبارہ لاؤ اور پھر اس نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرا (اور ان پر نوازش کی)۔

تفسیر

سلیمانؑ اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں

ان آیات میں بھی حضرت داؤدؑ کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔ پہلی آیت میں انھیں سلیمان جیسا باشرف بیٹا عطا فرمانے کی خبر دی گئی ہے کہ جو ان کی حکومت و رسالت کو باقی و جاری رکھنے والے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا، کیا ہی اچھا بندہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ دامنِ خدا کی طرف اور آغوشِ حق کی طرف لوٹتا تھا (و وھبنا لداؤد سلیمان نعم العبد انہ اوّاب)۔

یہ تعبیر حضرت سلیمانؑ کے عظیم مرتبے کی ترجمان ہے۔ شاید یہ ان بے بنیاد اور قبیح تہمتوں کی تردید کے لیے ہے کہ جو زوجۂ اوریا سے

حضرت سلیمانؑ کے تولد کے بارے میں تحریف شدہ تورات میں آئی ہیں اور نزولِ قرآن کے زمانے میں وہ تہمتیں اسی طرح عام تھیں۔

ایک تو "وھبنا" (ہم نے بخشا) فرمایا پھر "نعم العبد" (کیا ہی اچھا بندہ ہے) کہہ کر تعریف کی نیز "انہ اوّاب" (وہ شخص جو ہمیشہ فرمان واطاعتِ الٰہی کی طرف لپکتا ہے اور ذرہ بھر بھی لغزش ہو جائے تو توبہ کرتا ہے) کہہ کر ستائش کی گئی۔ یہ سب باتیں اس عظیم نبی کے بلند مرتبے کی غماض ہیں۔

"انہ اوّاب" بالکل وہی تعبیر ہے جو اسی سورہ کی آیت ۱۷ میں ان کے باپ حضرت داؤدؑ کے لیے آئی ہے۔

"اوّاب" مبالغے کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے "بہت زیادہ بازگشت کرنے والا" اور اس میں کوئی شرط بھی نہیں ہے اگر اس مفہوم کی طرف توجہ کی جائے تو اطاعت فرمانِ الٰہی کی طرف بازگشت، حق و عدالت کی طرف بازگشت اور غفلت و ترکِ اولیٰ سے بازگشت سب معانی اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

اگلی آیت میں حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس کے متعلق مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔ بعض جاہل اور بے خبر لوگوں کی طرف سے بھی ہیں کہ جو نہایت تکلیف دہ ہیں اور عقلی معیار کے خلاف ہیں۔ ان لوگوں نے ایسی ایسی باتیں کی ہیں کہ جو ایک عام انسان کے بھی شایانِ شان نہیں ہیں چہ جائیکہ ان کی نسبت حضرت سلیمانؑ جیسے عظیم المرتبت نبیؑ کی طرف دی جائے تاہم محققین نے عقلی و نقلی دلائل سے ایسی تفسیروں کا راستہ بند کر دیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم مختلف احتمالات کا جائزہ لیں آیات کی تفسیر اس کے ظاہر کے مطابق یا ظاہر ترین احتمالات کے مطابق پیش کرتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ جو ناروا نسبتیں دی جاتی ہیں ان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ لوگوں نے پہلے فیصلے کیے پھر لاکر انھیں قرآن پر ٹھونس دیا۔

قرآن کہتا ہے: وہ وقت یاد کر جب وقتِ عصر چابک اور تیز رفتار گھوڑے اس (سلیمان) کے حضور پیش کیے گئے (اذ عرض علیہ بالعشیّ الصافنات الجیاد)۔

"صافنات" "صافنۃ" کی جمع ہے۔ جیسا کہ بہت سے مفسرین اور اربابِ لغت نے لکھا ہے "صافنات" ایسے گھوڑوں کو کہا جاتا ہے کہ جو کھڑے ہوتے وقت دو اگلے اور ایک پچھلے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک پچھلا پاؤں کچھ بلند کیے رہتے ہیں اور صرف سُم کی نوک زمین پر رکھتے ہیں اور یہ چابک اور تیز رفتار گھوڑوں کی خاص حالت ہے کہ جو ہر وقت چلنے کو تیار ہوتے ہیں[1]

"جیاد" "جواد" کی جمع ہے یہاں یہ لفظ سریع الحرکت اور تیز رفتار گھوڑوں کے معنی میں ہے۔ دراصل یہ لفظ "جود" (بخشش) کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ البتہ یہ لفظ انسان کے لیے ہو تو مال بخشنے کے معنی میں ہے اور گھوڑے کے لیے ہو تو تیز رفتاری کے معنی میں ہے۔ گویا مذکورہ گھوڑے جب کھڑے بھی ہوتے تھے تو چلنے کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کرتے تھے اور جب چلتے تھے تو تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے تھے۔

اس آیت میں موجود مختلف قرائن سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک روز حضرت سلیمانؑ اپنے تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ "صافنات" مذکر اور مؤنث دونوں معانی رکھتا ہے لہٰذا یہ گھوڑیوں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

کر رہے تھے کہ جنھیں میدانِ جہاد کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ عصر کا وقت تھا۔ مامورین مذکورہ گھوڑوں کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

ایک عادل اور با اثر حکمران کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس طاقتور فوج ہو اور اس زمانے میں لشکر کے اہم ترین وسائل میں سے تیز رفتار گھوڑے تھے لہٰذا حضرت سلیمانؑ کا مقام ذکر کرنے کے بعد نمونے کے طور پر گھوڑوں کا ذکر آیا ہے۔

اس موقع پر یہ واضح کرنے کیلیے کہ طاقتور گھوڑوں سے ان کا لگاؤ دنیا پرستی کی وجہ سے نہیں جناب سلیمان نے کہا: "ان گھوڑوں کو میں اپنے رب کی یاد اور اس کے حکم کی بنا پر پسند کرتا ہوں" میں چاہتا ہوں کہ ان سے دشمنوں کے خلاف جہاد میں کام لوں (فقال انی احببت حب الخیر عن ذکر ربی)۔

عربوں کا معمول ہے کہ وہ "خیل" (گھوڑا) کو "خیر" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے:

الخیر معقود بنواصی الخیل الی یوم القیامۃ

خیر اور بھلائی قیامت تک کے لیے گھوڑے کی پیشانی کے ساتھ باندھ دی گئی ہے۔[1]

سلیمانؑ کہ جو دشمن کے خلاف جہاد کے لیے آمادہ ان تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ کر رہے تھے بہت خوش ہوئے۔ آپؑ انھیں یوں دیکھ رہے تھے کہ نظریں ان پر جم کر رہ گئیں "یہاں تک کہ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے" (حتی توارت بالحجاب)۔

یہ منظر نہایت دلکش اور عمدہ تھا اور حضرت سلیمانؑ جیسے عظیم فرماں روا کے لیے نشاط انگیز تھا۔ آپ نے حکم دیا "ان گھوڑوں کو واپس میرے پاس لاؤ" (ردوھا علیّ)۔

جب مامورین نے اس حکم کی اطاعت کی اور گھوڑوں کو واپس لائے تو سلیمانؑ نے خود ذاتی طور پر ان پر نوازش اور "ان کی پنڈلیوں اور گردنوں کو تھپتھپایا اور ہاتھ پھیرا" (فطفق مسحًا بالسوق والاعناق)۔

یوں آپ نے ان کی پرورش کرنے والوں کی بھی تشویق اور قدردانی کی۔ معمول ہے کہ جب کسی سواری کی قدردانی کی جاتی ہے تو اس کے سر، چہرے، گردن یا اس کی ٹانگ پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے اور یہ دلچسپی اور پسندیدگی کے اظہار کا اہم ذریعہ ہے کہ جس سے انسان اپنے بلند مقاصد میں مدد لیتا ہے لہٰذا حضرت سلیمانؑ جیسے عظیم نبی کا ایسا کرنا کوئی تعجب انگیز نہیں۔

"طفق" (کہ جو نحویوں کی اصطلاح کے مطابق افعالِ مقاربہ میں سے ہے) کسی کام کو شروع کرنے کے معنی میں ہے۔ "سوق" جمع ہے "ساق" کی (پنڈلی کے معنی میں) اور "اعناق" جمع ہے "عنق" کی (گردن کے معنی میں) پورے جملے کا معنی یہ ہے:

سلیمان نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرا اور ان سے نوازش کرنا شروع کیا۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں

بعض نے زیر بحث آیت میں "خیر" سے مال یا مالِ کثیر مراد لیا ہے۔ ممکن ہے یہ سابقہ تفسیر پر منطبق ہو سکے کیونکہ یہاں مال کا مصداق گھوڑے ہی ہیں۔

ان آیات کی تفسیر کے بارے میں جو کچھ سطورِ بالا میں کہا گیا ہے یہ بعض مفسّرین سے ہم آہنگ ہے۔ بزرگانِ شیعہ میں سے عالمِ نامدار و بزرگوار سیّد مرتضیٰ کے کلمات سے بھی اس تفسیر کے ایک حصّے کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "تنزیہ الانبیاء" میں بعض مفسّرین اور اربابِ حدیث کی جانب سے حضرت سلیمانؑ کی طرف دی جانے والی ناروا نسبتوں کی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> کیسے ممکن ہے کہ اللہ پہلے تو اس پیغمبر کی مدح و ثنا کرے اور پھر ساتھ ہی اس کی طرف اس بُرے کام کی نسبت دے کہ وہ گھوڑوں کا نظارہ کرنے میں یوں محو ہوئے کہ نماز بھول گئے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ گھوڑوں سے بھی ان کا لگاؤ حکمِ پروردگار سے تھا کیونکہ اللہ ہمیں بھی حکم دیتا ہے کہ گھوڑے پالیں اور دشمنوں کے خلاف جنگ کے لیے انھیں آمادہ رکھیں۔ لہٰذا کیا مانع ہے کہ اللہ کا نبی بھی ایسا ہی ہو۔[1]

علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی کتابِ نبوت میں مذکورہ بالا آیات کی تفسیر کے بارے میں مختلف باتیں کی ہیں جن میں سے بعض ہماری محررہ بالا تفسیر کے نزدیک ہیں۔[2]

بہرحال اس تفسیر کے مطابق سلیمان سے نہ تو کوئی گناہ سرزد ہوا ہے اور نہ ہی آیات میں عدم ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی ایسی مشکل پیش آتی ہے کہ جس کی توجیہ کرنا پڑے۔[3]

بعض مفسّرین نے ایک اور تفسیر کی ہے اب ہم اسے پیش کرتے ہیں۔

زیادہ مشہور یہ ہے کہ "توارت" اور "ردوھا" کی ضمیریں "شمس" (سورج) کی طرف لوٹتی ہیں کہ جو عبارت میں مذکور نہیں ہے لیکن زیرِ بحث آیات میں لفظ "عشی" (وقتِ عصر) آیا ہے اس سے یہ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ سلیمانؑ گھوڑوں کو دیکھنے میں منہمک تھے کہ سورج نے اپنا سرا افقِ مغرب میں رکھ دیا اور حجابِ مغرب میں پنہاں ہو گیا۔ سلیمانؑ اپنی نمازِ عصر کھو جانے سے بہت پریشان ہو گئے۔ وہ پکارے: اے پروردگار کے فرشتو! سورج کو میرے لیے لوٹا دو۔ سلیمانؑ کا یہ تقاضا پورا ہوا اور سورج پلٹ آیا۔ حضرت سلیمانؑ نے وضو کیا (پنڈلی اور گردن پر ہاتھ پھیرنے سے مراد وضو کے دوران میں مسح کرنا ہے کہ جو حضرت سلیمانؑ کے مذہب میں تھا، البتہ کبھی لفظ مسح عربی زبان میں دھونے کے معنی میں بھی آتا ہے) پھر انھوں نے اپنی نماز ادا کی۔

بعض ناآگاہ اور بے شعور اس سے بھی تجاوز کر گئے ہیں۔ انھوں نے ایک اور قبیح تہمت اس عظیم نبی پر لگائی ہے وہ کہتے ہیں کہ "طفق مسحًا بالسوق والاعناق" سے مراد یہ ہے کہ سلیمان نے حکم دیا کہ تلوار کے ساتھ گھوڑوں کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹ دی جائیں یا خود یہ کام انجام دیا کیونکہ وہ گھوڑے یادِ خدا سے غفلت اور نماز کی فراموشی کا سبب بنے تھے۔

---

[1] تنزیہ الانبیاء، ص ۹۳

[2] بحار الانوار، ج ۱۴ ص ۱۰۴

[3] اس تفسیر کے مطابق "توارت" اور "ردوھا" کی ضمیریں تیز رو گھوڑوں یعنی "الصافنات الجیاد" کی طرف لوٹتی ہیں۔

اس آخری گفتگو کا بطلان تو کسی سے مخفی نہیں کیونکہ اس میں گھوڑوں کا تو کوئی قصور نہ تھا کہ انھیں تہ تیغ کیا جاتا اگر گناہ تھا تو خود سلیمانؑ کا تھا جو گھوڑوں کا نظارہ کرتے کرتے ان میں منہمک ہو گئے اور باقی سب کچھ بھول گئے۔ علاوہ ازیں گھوڑوں کو مار ڈالنا ظلم بھی ہے اور اسراف بھی۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ ایسا ناروا عمل ایک نبی سے سرزد ہو۔ لہٰذا اسلامی کتب میں اس ضمن میں آنے والی روایات میں حضرت سلیمانؑ کی طرف اس نسبت کی شدت سے نفی کی گئی ہے۔

رہی دوسری تفسیر کہ جس میں نمازِ عصر سے غفلت کی بات کی گئی ہے اس سے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک معصوم نبی اپنی واجب ذمہ داری کو بھول جائے؟ اگرچہ گھوڑوں کا معائنہ بھی ان کی ایک ذمہ داری تھی۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ مستحب نماز تھی کہ جسے چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہ تھا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ نمازِ نافلہ کے لیے سورج پلٹانے کی ضرورت نہ تھی۔

علاوہ ازیں اس تفسیر میں کچھ دیگر اشکالات اور اعتراضات بھی ہیں، مثلاً:

۱۔ لفظ "شمس" آیات میں صراحت کے ساتھ نہیں آیا جبکہ "الصافنات الجیاد" (تیز رفتار گھوڑے) صراحت کے ساتھ مذکور ہے لہٰذا زیادہ مناسب یہی ہے کہ ضمیریں اسی چیز کی طرف لوٹیں جو صراحت کے ساتھ آیات میں موجود ہے۔

۲۔ "عن ذکر ربی" کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ان گھوڑوں کی محبت یادِ خدا اور اس کے فرمان کے باعث ہے جبکہ آخری تفسیر کے مطابق لفظ "عن، علی" کے معنی میں ہے۔ یعنی میں نے گھوڑوں کی محبت کو اپنے رب کی محبت پر ترجیح دی اور یہ معنی خلافِ ظاہر ہے (غور کیجیے گا)

۳۔ سب سے زیادہ تعجب خیز یہ ہے کہ "ردوھا علیّ" (انھیں میری طرف لوٹا دو) اس میں حکمیہ لب و لہجہ ہے۔ کیا ممکن ہے کہ سلیمانؑ اللہ تعالیٰ یا اس کے فرشتوں سے اس لہجے میں خطاب کرتے ہوئے کہیں کہ سورج میری طرف پلٹا دیں۔

۴۔ سورج پلٹنے کا مسئلہ اگرچہ قدرتِ خدا کے لیے محال نہیں ہے تاہم واضح طور پر بہت سے مسائل اس سے وابستہ ہیں اور جب تک واضح دلیل موجود نہ ہو اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ زیرِ بحث آیات کا آغاز حضرت سلیمانؑ کی مدح و تمجید سے ہوتا ہے جبکہ زیرِ نظر تفسیر کے مطابق ان آیات کا اختتام آپ کی مذمت پر ہوتا ہے۔

۶۔ اگر واجب نماز ترک ہوئی ہے تو اس کی توجیہ مشکل ہے اور اگر نافلہ نماز ترک ہوئی ہے تو پھر سورج پلٹانے کی کیا ضرورت تھی؟

یہاں ایک سوال باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ تفسیر کتبِ احادیث میں متعدد روایات میں نظر آتی ہے لیکن اگر ان روایات کی اسناد کا تعارف جائزہ لیں اور ان کی تحقیق کریں تو ہم تصدیق کریں گے کہ ان میں سے کسی ایک کی سند بھی معتبر نہیں۔ زیادہ تر روایات مرسلہ ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ان غیر معتبر روایات سے صرفِ نظر کیا جائے اور اس کا علم ہم اس کے اہل کے ذمہ رہنے دیں اور پہلے سے فیصلہ کیے بغیر آیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اسی کو انتخاب کریں اور یوں مختلف اشکالات سے آسودہ خاطر بھی رہیں۔

۳۴۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ○
۳۵۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○
۳۶۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ○
۳۷۔ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ○
۳۸۔ وَاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ○
۳۹۔ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○
۴۰۔ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ○

ترجمہ

۳۴۔ ہم نے سلیمان کا امتحان لیا اور ایک دھڑ ان کے تخت پر پھینک دیا پھر اس نے بارگاہِ خدا کی طرف رجوع کیا۔
۳۵۔ اس نے کہا: پروردگارا! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت عطا کر کہ جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو، کیونکہ تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔
۳۶۔ ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تاکہ وہ اس کے حکم کے مطابق آرام کے ساتھ چلے اور وہ جہاں چاہے جائے۔
۳۷۔ اور شیطانوں کو بھی ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیا اور ان میں سے ہر معمار اور غوطہ خور کو۔
۳۸۔ (اور شیطانوں میں سے) ایک اور گروہ کو بھی جو (اس کے اختیار میں تھے اور) زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔
۳۹۔ (اور ہم نے اس سے کہا) یہ ہماری عطا ہے جسے بھی تو چاہتا ہے (اور مصلحت دیکھتا ہے) اُسے بخش دے اور جس سے تو چاہتا ہے روک لے اور تیرے کوئی حساب نہیں ہے۔
۴۰۔ اور اس (سلیمان) کے لیے ہمارے پاس بلند مقام اور نیک سرانجام ہے۔

تفسیر

سلیمانؑ کا سخت امتحان اور وسیع حکومت

یہ آیات حضرت سلیمانؑ کی زندگی کے واقعات کا کچھ حصہ بیان کرتی ہیں۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انسان قدرت کے جس بلند پائے تک بھی جا پہنچے اس کے پاس کچھ بھی خود اس کی طرف سے نہیں ہوتا اور جو کچھ بھی ہو خدا کی طرف سے ہے۔ یہ وہ بات ہے کہ اگر اس کی طرف توجہ ہو تو غرور و غفلت کے پردے انسان کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور کائنات میں وہ اپنی حیثیت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

ان آیات کا پہلا حصہ ایک آزمائش کے بارے میں ہے۔ اللہ نے حضرت سلیمانؑ کو آزمایا۔ اس میں ایک "ترکِ اولیٰ" پیش آیا۔ اس کے بعد جناب سلیمان نے بارگاہِ خداوندی کا رخ کیا اور اس ترکِ اولیٰ پر توبہ کی۔ یہ آیات بھی چونکہ اجمالی ہیں لہٰذا افسانہ طرازوں اور خیال پرداز دل نے فائدہ اٹھایا اور بے بنیاد خیالی داستانیں بنا ڈالیں۔ انھوں نے اس عظیم نبی کی طرف بعض ایسی چیزیں منسوب کیں جو یا تو اساسِ نبوت کے خلاف ہیں یا مقامِ عصمت کے منافی ہیں یا اصولاً عقل و منطق ہی کے خلاف ہیں۔ یہ باتیں تمام محققینِ قرآن کے لیے خود ایک آزمائش ہیں۔ حالانکہ قرآن کے متن میں جو کچھ کہا گیا ہے اگر اسی پر قناعت کر لی جاتی تو ان بے ہودہ افسانوں کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

پہلی زیرِ بحث آیت میں قرآن کہتا ہے: ہم نے سلیمان کا امتحان لیا اور اس کی کرسی پر ایک دھڑ ڈال دیا، پھر اس نے بارگاہِ خداوندی کی طرف رجوع کیا اور اس کی طرف لوٹا (و لقد فتنا سلیمان و القینا علیٰ کرسیه جسدا ثم اناب)۔

"کرسی" کا معنی ہے "چھوٹے پاؤں والا تخت" یوں معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے پاس دو طرح کے تخت ہوتے تھے۔ ایک تخت عام استعمال کے لیے ہوتا تھا جس کے پاؤں چھوٹے ہوتے تھے اور دوسرا تخت خصوصی پروگراموں کے لیے ہوتا تھا کہ جس کے پائے بلند ہوتے تھے۔ پہلی قسم کے تخت کو "کرسی" کہا جاتا تھا اور دوسری قسم کے تخت کو "عرش" کہتے تھے۔

"جسد" کا معنی ہے "بے جان دھڑ"۔ مفردات میں راغب کے بقول اس کا مفہوم "جسم" کے مفہوم سے محدود تر ہے کیونکہ "جسد" کا اطلاق غیر انسان پر نہیں ہوتا (سوائے شاذ و نادر مواقع کے) لیکن جسم کا مفہوم عام ہے۔

اس آیت سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سلیمانؑ کی آزمائش بے جان دھڑ کے ذریعے ہوئی تھی وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے تخت پر رکھ دیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں قرآن میں کوئی وضاحت نہیں ہے۔ محدثین و مفسرین نے اس سلسلے میں روایات و تفاسیر بیان کی ہیں ان میں سے زیادہ قابلِ توجہ اور واضح یہ ہے کہ:

سلیمانؑ کی آرزو تھی کہ انھیں باشرف اور شجاع اولاد نصیب ہو جو ملک کا نظام چلانے اور خاص طور پر دشمنوں کے خلاف جہاد میں ان کی مدد کرے۔ حضرت سلیمانؑ کی متعدد بیویاں تھیں۔ انھوں نے دل میں ارادہ کیا کہ میں ان سے ہم بستر ہوتا ہوں تاکہ مجھے متعدد بیٹے نصیب ہوں کہ جو میرے مقاصد میں میری مدد کریں لیکن اس مقام پر ان سے غفلت ہوئی اور آپ نے "انشاء اللہ" نہ کہا کہ جو انسان کے ہر حالت میں اللہ پر تکیہ کا غماز ہے لہٰذا اس زمانے میں ان کی بیویوں سے کوئی اولاد نہ ہوئی سوائے ایک ناقص الخلقت بچے کے۔ وہ بے جان دھڑ کے مانند تھا کہ جو لا کر ان کے تخت پر ڈال دیا گیا۔

سلیمانؑ سخت پریشان اور فکر مند ہوئے کہ انھوں نے ایک لمحے کے لیے اللہ سے غفلت کیوں کی اور کیوں اپنی طاقت پر بھروسہ کیا اس لیے انھوں نے توبہ کی اور بارگاہِ الٰہی کی طرف رجوع کیا۔

ایک اور تفسیر بھی لائقِ توجہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ:

اللہ نے حضرت سلیمانؑ کو ایک شدید بیماری کے ذریعے آزمایا۔ آپؑ کی یہ حالت ہوگئی کہ گویا ایک بے جان دھڑ کے مانند اپنے تخت پر پڑے تھے اور عربی زبان میں معمول ہے کہ بہت کمزور اور نہایت بیمار انسان کو "جسد بلا روح" کہا جاتا ہے۔ آخر کار انھوں نے توبہ کی اور اللہ نے انھیں پہلی کی سی حالت میں لوٹا دیا ("اناب" کا معنی ہے سلامتی کے ساتھ لوٹنا اور واپسی)۔

البتہ اس تفسیر پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس صورت میں "والقیناہ" ہونا چاہیے تھا۔ یعنی ہم نے سلیمان کو اس کے تخت پر بے روح جسم کے مانند ڈال دیا جبکہ آیت میں یوں نہیں ہے اور اسے تقدیر اقرار دینا بھی خلافِ ظاہر ہے۔

اس تفسیر کے مطابق لفظ "اناب" "صحت کے ساتھ لوٹنا" کے معنی میں ہے اور یہ بھی خلافِ ظاہر ہے لیکن اگر "اناب" کو خدا کی طرف توبہ اور رجوع کے معنی میں لیں تو اس تفسیر کو کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس صورت میں خلاف ظاہر بات صرف یہ رہ جائے گی کہ "القیناہ" کی ضمیر حذف کردی گئی ہے۔

باقی رہے جھوٹے اور قبیح افسانے کہ جن کا ذکر بعض کتب میں بڑی آب و تاب سے کیا گیا ہے۔ ظاہراً ان کی جڑ تلمود کے یہودیوں کی طرف جاتی ہے اور یہ سب اسرائیلیات اور خرافات ہیں کوئی عقل و منطق انھیں قبول نہیں کرتی۔ ان قبیح افسانوں میں کہا گیا ہے سلیمان کی انگوٹھی کھو گئی تھی یا وہ کسی شیطان نے چھین لی تھی اور خود ان کی جگہ تخت پر آبیٹھا تھا وغیرہ وغیرہ۔

یہ افسانے ہر چیز سے قبل انھیں گھڑنے والوں کے انحطاطِ فکری کی دلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققینِ اسلام نے جہاں کہیں ان کا نام لیا ہے ان کے بے بنیاد ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ نہ تو مقامِ نبوت اور حکومتِ الٰہی انگوٹھی سے وابستہ ہے اور نہ کبھی یہ مقام اللہ اپنے کسی نبی سے چھینتا ہے اور نہ کبھی وہ شیطان کو نبی کی شکل میں لاتا ہے، چہ جائیکہ افسانہ طرازوں کے مطابق وہ چالیس دن تک نبی کی جگہ پر بیٹھے اور لوگوں کے درمیان حکومت و قضاوت کرے[1]۔

اگلی آیت میں حضرت سلیمانؑ کی توبہ کا مسئلہ گزشتہ آیت کی نسبت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس نے کہا: پروردگارا! مجھے بخش دے (قال رب اغفر لی) اور مجھے ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو کیونکہ تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے (و ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی انک انت الوھاب)۔

دو سوال اور اُن کے جواب

۱۔ کیا سلیمانؑ کے اس تقاضے سے بُخل کی بو نہیں آتی؟ اس سوال کے جواب میں مفسرین نے بہت سی باتیں کی ہیں جن کا زیادہ حصہ ظاہرِ آیات سے ہم آہنگ نہیں ہے جو جواب زیادہ مناسب اور زیادہ منطقی نظر آتا ہے وہ یہ ہے:

---

[1] اس کی مزید وضاحت کے لیے کہ ان خرافات کی جڑ یہودی کتب ہیں، کتاب "اعلام قرآن" میں حضرت سلیمانؑ سے متعلق افسانوں کی بحث کی طرف رجوع کریں، ص ۳۹۲

حضرت سلیمانؑ اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی حکومت چاہتے تھے جس میں خاص معجزات ہوں اور وہ ان کی حکومت کو باقی حکومتوں سے ممتاز کریں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر نبی کا ایک خاص معجزہ تھا، حضرت موسیٰؑ کے لیے عصا اور ید بیضاء کا معجزہ تھا، حضرت ابراہیمؑ کے لیے آگ سرد ہوگئی تھی، حضرت صالح کے لیے ایک خاص قسم کی اونٹنی کا معجزہ تھا اور پیغمبر اسلامؐ کا معجزہ قرآن مجید ہے، حضرت سلیمانؑ کی ایک حکومت تھی جو الٰہی معجزات سے بہرہ ور تھی، مثلاً ہواؤں پر حکومت، شیطانوں پر حکومت اور اسی طرح دیگر بہت سی خصوصیات۔

یہ چیز انبیاء کے لیے کوئی نقص شمار نہیں ہوتی کہ وہ اپنے لیے کسی مخصوص معجزے کا تقاضا کریں کہ جو ان کی کیفیت کو پوری طرح واضح کرے، لہٰذا اس میں کوئی مانع نہیں کہ دوسرے لوگوں کی سلیمان سے وسیع تر حکومت ہو لیکن اس میں حضرت سلیمانؑ کی حکومت کے امتیازات نہیں ہوئے۔

اس بات کی شاہد بعد والی آیت ہے کہ جس میں درحقیقت جناب سلیمانؑ کی اس دعا کی اجابت ظاہر ہوتی ہے اس میں ہواؤں اور شیطانوں کے مسخر ہونے کا ذکر ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ بات حضرت سلیمانؑ کی حکومت کے امتیازات میں سے تھی۔

۲۔ کیا امام مہدیؑ کی حکومت وسیع تر نہ ہوگی؟ گزشتہ عبارت ہی سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام (ارواحنالہ الفداء) کی حکومت ایک عالمی حکومت ہوگی جو یقیناً حکومتِ سلیمانؑ سے بہت وسیع ہوگی۔ البتہ حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت اپنی تمام تر وسعت اور دیگر حکومتوں سے اپنی خصوصیات و امتیازات سے باوجود جناب سلیمانؑ کی حکومت سے مختلف ہوگی اور حضرت سلیمانؑ کی حکومت انھی کے ساتھ مخصوص ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت سلیمانؑ کی گفتگو کمی بیشی، افزوں طلبی اور انحصار جوئی کے لیے نہ تھی گفتگو تو نبوت کے اس کمال کے بارے میں تھی کہ وہ معجزات کے لحاظ سے ایسی خصوصیات رکھتی ہو جو کسی نبی کو دیگر انبیاء سے مشخص کرے اور حضرت سلیمانؑ اسی کے طالب تھے۔

بعض روایات جو اہلِ بیت علیہم السلام کے طرق سے حضرت امام موسیٰ بن جعفرؑ سے منقول ہیں میں بخل کے بارے میں سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ جو بہت جاذبِ توجہ ہے، حدیث اس طرح ہے:

آپؑ کے ایک محب علی بن یقطین نے امامؑ سے سوال کیا: کیا جائز ہے کہ اللہ کا نبی بخیل ہو؟

امامؑ نے فرمایا: نہیں

علی بن یقطین نے عرض کی: پھر حضرت سلیمانؑ نے یہ کیوں کہا

رب اغفرلی و هب لی ملکًا لا ینبغی لاحد من بعدی

پروردگارا! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت عطا کر کہ جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو۔

اس آیت کا مفہوم اور تفسیر کیا ہے؟

امامؑ نے فرمایا:

حکومت دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو ظلم، تسلط اور لوگوں کو مجبور کر کے حاصل کی جائے اور دوسری حکومت وہ کہ جو اللہ کی طرف سے ہو، جیسے ابراہیم کے خاندان کی، طالوت کی اور ذوالقرنین کی حکومت۔ سلیمان خدا سے چاہتے تھے کہ وہ انھیں ایسی حکومت دے کہ ان کے بعد کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ یہ حکومت لوگوں پر ظلم اور قہر و جبر سے حاصل کی گئی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہوا کو ان کے تابع فرمان کر دیا تاکہ جدھر وہ چاہیں وہ آرام سے چل پڑے۔

وہ ہوا صبح کے وقت بھی ایک ماہ کا فاصلہ طے کرتی اور عصر کے وقت بھی ایک ماہ کا فاصلہ طے کرتی۔ نیز اللہ تعالیٰ نے شیطانوں کو ان کے تابع فرمان کر دیا وہ ان کے لیے مکانات تعمیر کرتے اور غواصی و پیراکی کا کام کرتے۔ علاوہ ازیں انھیں پرندوں کی زبان سکھائی گئی اور اللہ نے زمین پر ان کی حکومت قائم کی۔ لہٰذا اس زمانے کے اور بعد کے لوگ سمجھ گئے کہ سلیمان کی حکومت نہ لوگوں کی بنائی گئی تھی اور نہ قہر و غلبہ اور ظلم و ستم سے حاصل ہوئی تھی۔

علی بن یقطین کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: پھر پیغمبر اسلامؐ سے منقول اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

رحم اللہ اخی سلیمان ابن داؤد ما کان ابخلہ

اللہ رحم کرے میرے بھائی سلیمان بن داؤد پر وہ کیسے بخیل تھے؟

امامؑ نے فرمایا:

اس کے دو معانی ہیں۔

پہلا یہ کہ وہ اپنی ناموس اور حرمت کے بارے میں بخیل تھے کہ کوئی ان کے بارے میں غیر مناسب بات کرے۔

دوسرا یہ کہ رسول اللہؐ کی مراد یہ تھی کہ اگر آیت قرآن کی یوں تفسیر کی جائے کہ جیسے بعض جاہل کرتے ہیں کہ سلیمان نے اپنے لیے بے منطیر اور مختص حکومت کا تقاضا کیا تو پھر انھیں ایک بخیل شخص ماننا پڑے گا (اور یہ دراصل ان لوگوں کے لیے طنز ہے)۔[1]

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بعد والی آیات میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ نے سلیمانؑ کی درخواست قبول کر لی اور انھیں خصوصی امتیازات اور عظیم نعمات والی حکومت عطا کی۔ ان امتیازات و نعمات کا پانچ حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ہواؤں کا ایک رہوار اور سواری کی طرح تابع ہونا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ہم نے ہوا کو اس کے تابع کر دیا تاکہ اس کے حکم کے مطابق آرام سے چلے اور جہاں کا وہ ارادہ کرے جا سکے (فسخرنا لہ الریح تجری بامرہ رخاء حیث اصاب)۔

واضح ہے کہ ایک وسیع و عریض حکومت میں تیز رفتار رابطوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بوقت ضرورت سربراہ حکومت تیزی کے ساتھ ملک کے تمام علاقوں میں آ جا سکے۔ اللہ نے یہ امتیاز حضرت سلیمانؑ کو دے رکھا تھا۔

ہوا کیسے ان کے تابع فرمان تھی؟ کتنی تیزی سے چلتی تھی؟ حضرت سلیمانؑ اور ان کے ساتھ ہوا کے ذریعے سفر کرتے ہوئے کس چیز پر سوار ہوتے تھے؟ اور کون سے عوامل انھیں گرنے سے بچاتے تھے اور ہوا کے دباؤ کی کمی بیشی اور دیگر مشکلات کے موقع پر ان کی حفاظت کرتے تھے؟ خلاصہ یہ کہ وہ کیسا اسرار آمیز وسیلہ تھا کہ جو اس زمانے میں حضرت سلیمانؑ کے قبضے میں تھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کی جزئیات اور خصوصیات کے بارے میں جواب ہمارے سامنے واضح نہیں ہے، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ ایک معجزہ تھا کہ جیسے معجزے نبی کے اختیار میں دیئے

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ ص ۴۵۹، بحوالہ کتاب علل الشرائع

جاتے تھے۔ یہ ایک عام اور معمول کے مطابق بات نہ تھی۔ یہ ایک عظیم نعمت اور اعجاز تھا اور ایسا کرنا قدرتِ الٰہی کے لیے سادہ اور آسان سا کام ہے۔ نیز ایسے بہت سے مسائل ہیں کہ اصولی طور پر تو ہم انھیں جانتے ہیں لیکن ان کی جزئیات سے ہم واقف نہیں ہیں۔

اس موقع پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ لفظ "رخاء" (نرم اور ملائم) جو اس آیت میں آیا ہے وہ سورۂ انبیاء کی آیہ ۸۱ میں آنے والے لفظ "عاصفہ" (آندھی) سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے:

ولسلیمان الریح عاصفۃ تجری بامرہ الی الارض التی بارکنا فیھا

ہم نے تیز ہوا کو سلیمان کے لیے مسخر کر دیا کہ جو اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جسے ہم نے برکت دے رکھی تھی۔

اس سوال کا جواب دو طریقوں سے دیا جا سکتا ہے۔

پہلا یہ کہ "عاصفہ" (تیز ہوا) اس کی سرعتِ رفتار کے لیے ہے اور "رخاء" اس کے منظم اور آرام دہ ہونے کی طرف اشارہ ہے، یعنی ہوا کے تیز رفتار ہونے کے باوجود انھیں چلنے میں پریشانی کا احساس نہیں ہوتا تھا، بالکل ہمارے زمانے کے ترقی یافتہ تیز رفتار ذرائع آمد و رفت کی طرح۔ ان میں بھی بعض وسائل ایسے ہیں کہ انسان جب ان کے ذریعے سفر کرتا ہے تو یوں محسوس کرتا ہے جیسے اپنے گھر کے کمرے میں بیٹھا ہے حالانکہ وہ چیز انتہائی تیز رفتاری سے چل رہی ہوتی ہے۔

دوسرا یہ کہ بعض مفسرین نے ان دو آیات کو دو قسم کی ہواؤں کا ذکر سمجھا ہے اور دونوں کو اللہ نے حضرت سلیمانؑ کے اختیار میں دے رکھا تھا۔ ایک تیز رفتار ہوا تھی اور دوسری آہستہ رو۔

۲۔ دوسری نعمت اللہ تعالیٰ نے جناب سلیمانؑ کو یہ عطا کی تھی کہ سرکش موجودات ان کے لیے مسخر کر دیئے گئے تھے اور ان کے اختیار میں دے دیئے گئے تھے تاکہ آپ ان سے مثبت کام لے سکیں۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: "اور ہم نے شیطانوں کو اس کے لیے مسخر کر دیا اور ان میں سے ہر معمار اور غوّاص کو اس کا تابع فرمان بنا دیا" تاکہ ان میں سے کچھ خشکی میں اس کے کہنے کے مطابق تعمیرات کریں اور کچھ دریا میں غوّاصی اور غوطہ زنی کے کام آئیں (والشیاطین کل بناء وغوّاص)[1]۔

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے مثبت کاموں کے لیے موجود قوت ان کے اختیار میں دے دی۔ شیطان کہ جن کے مزاج ہی میں سرکشی ہے وہ ان کے لیے اس طرح سے مسخر ہو گئے کہ ان سے تعمیری اور اصلاحی کام لیا جانے لگا اور گراں بہا منابع سے استفادہ کے لیے وہ استعمال ہونے لگے۔

صرف اس آیت میں نہیں بلکہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ شیطان حضرت سلیمانؑ کے تابع فرمان تھے اور ان کے حکم کے مطابق مثبت کام کرتے تھے۔ البتہ بعض آیات مثلاً زیرِ بحث آیت اور سورۂ انبیاء کی آیت ۸۲ میں "شیاطین" کا لفظ ہے جبکہ سورۂ سبا کی آیت ۱۲ میں "جن" کا لفظ ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ "جن" ایک ایسا موجود ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن عقل و شعور اور طاقت کا حامل ہے۔ نیز جنوں میں

---

[1] "شیاطین" کا "الریح" پر عطف ہے کہ جو "سخرنا" کا مفعول ہے اور "کل بناء و غوّاص" "شیاطین" کا بدل ہے۔

مؤمن بھی ہیں اور کافر بھی اور اس میں کوئی مانع نہیں کہ حکمِ خدا سے وہ ایک نبی کے تابع فرمان ہو جائیں اور مفید کام انجام دیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ "شیاطین" کا ایک وسیع تر معنی ہو کہ جس میں سرکش انسان بھی شامل ہوں اور ان کے علاوہ بھی۔ لفظ "شیطان" کا اطلاق قرآن مجید میں اس وسیع مفہوم پر ہوا ہے (مثلاً سورۂ انعام کی آیت ۱۱۲)۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو یہ طاقت دی تھی کہ وہ تمام سرکشوں کو اپنے سامنے جھکا سکیں۔

۳۔ تیسری نعمت اللہ نے حضرت سلیمانؑ کو یہ عنایت کی تھی کہ انھوں نے تخریب کار اور فسادی قوتوں پر قابو پا رکھا تھا، کیونکہ بہرحال بعض شیطان ایسے بھی تھے کہ جن سے ایک مفید اور اصلاحی قوت کے طور پر کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ قید و بند میں رہیں تاکہ معاشرہ ان کی مزاحمت سے پیدا ہونے والے شر سے محفوظ رہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں قرآن کہتا ہے: اور شیطانوں کا ایک اور گروہ اس کے قابو میں زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا (واٰخرین مقرّنین فی الاصفاد)۔[1]

"مقرنین" "قرن" کے مادے سے مقارنت اور نزدیکی کے معنی میں ہے۔ یہاں یہ لفظ ہاتھ پاؤں یا گردن کو زنجیر میں جمع کرنے کے معنی میں ہے۔

"اصفاد" "صفد" (بروزنِ "نمد") کی جمع ہے جو قید و بند کے وسیلے کے معنی میں ہے، مثلاً ہتھکڑیاں اور بیڑیاں جو قیدیوں کو پہنائی جاتی ہیں۔ بعض نے مقرنین فی الاصفاد سے ایسی زنجیر مراد لی ہے کہ جس سے ہاتھوں کو گردن کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا اور یہ مفہوم "مقرنین" کے معنی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ ان کے الگ الگ گروپ تھے اور ہر گروپ کے لیے الگ قید اور بندش تھی۔

البتہ یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر "شیاطین" سے مراد شیاطینِ جن ہیں کہ جو فطری طور پر جسمِ لطیف رکھتے ہیں تو پھر زنجیر اور ہتھکڑیاں ان کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتیں۔ اس لیے بعض نے کہا ہے کہ یہ تعبیر انھیں تخریبی کارروائیوں سے باز رکھنے کے معنی کے لیے کنایہ ہے۔

۴۔ چوتھی نعمت اللہ تعالیٰ نے جناب سلیمان کو یہ دی تھی کہ انھیں بہت سے اختیارات دے رکھے تھے کہ جن کی وجہ سے کسی کو کچھ عطا کرنے اور یا نہ کرنے میں وہ صاحبِ اختیار تھے۔ جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے: ہم نے اس سے کہا: یہ ہماری عطا و بخشش ہے جسے تو (مصلحت کے مطابق) چاہتا ہے عطا کر اور جس سے تو (مصلحت کے مطابق) روکنا چاہتا ہے روک لے تجھ پر کوئی حساب نہیں ہے (ھٰذا عطاؤنا فامنن او امسك بغیر حساب)۔

"بغیر حساب" یا تو اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے تیرے مقامِ عدالت کی بنا پر تجھے وسیع اختیارات دیئے ہیں اور تجھ سے پوچھ گچھ نہ ہوگی، یا اس کا معنی یہ ہے کہ عطائے الٰہی تجھ پر اس قدر ہے کہ جس قدر بھی تو بخش دے اس میں حساب نہیں ہوگا۔

بعض مفسرین نے اس تعبیر کو صرف گرفتار شیاطین سے مربوط جانا ہے کہ جسے تو چاہے (اور مصلحت دیکھے) آزاد کر دے اور جس کے لیے قید میں مصلحت سمجھے اسے قید کر دے۔

---

[1] "اٰخرین" کا عطف "کل بنّاء" پر ہے اور "سخّرنا" کے مفعول کے حکم میں ہے اور "مقرّنین" "اٰخرین" کی صفت ہے۔

لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے کیونکہ یہ "عطاؤنا" کے ظاہری مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

۵۔ پانچویں نعمت جو اللہ نے حضرت سلیمان کو دی وہ ان کا روحانی مقام تھا کہ جو اللہ نے ان کی اہلیت وقابلیت کی بنا پر انھیں مرحمت فرمایا تھا۔ جیسا کہ زیر بحث آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: اس کے لیے ہمارے پاس بلند مقام اور نیک انجام ہے (وان لہ عندنا لزلفٰی وحسن مآب)۔

یہ جملہ درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے جنھوں نے اس عظیم نبی کے مقام مقدس پر طرح طرح کی ناروا اور بے ہودہ تہمتیں لگانے میں موجودہ تورات کی پیروی کی۔ اس آیت میں قرآن حضرت سلیمانؑ کو تمام تہمتوں سے مبرا قرار دے رہا ہے اور خدا کے ہاں ان کے معزز مقام کی خبر دے رہا ہے۔ یہاں تک کہ "حسن مآب" کہہ کر ان کے انجام بخیر کی خبر بھی دی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ تورات میں آنے والی اس ناروا نسبت کی نفی ہو کہ حضرت سلیمانؑ نے بت پرستوں میں شادی کی تھی، جس وجہ سے ان کا میلان بت پرستی کی طرف ہوگیا تھا۔ موجودہ تورات یہاں تک کہتی ہے کہ انھوں نے بت خانہ بنایا تھا، لیکن قرآن "حسن مآب" کہہ کر ان تمام اوہام وخرافات پر خطِ بطلان کھینچ رہا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ داستانِ سلیمانؑ سے حاصل ہونے والا درس: شک نہیں کہ تاریخ انبیاء ذکر کرنے سے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ ان زندہ واقعات میں سے یعنی حقائق منعکس کیے جائیں تاکہ تربیتی پروگرام کی تکمیل ہوسکے۔ حضرت سلیمانؑ کی داستان سے جو حقائق سامنے آتے ہیں ان میں یہ امور بھی شامل ہیں:

ا۔ ایک طاقت ور حکومت، فراواں مادی وسائل اور وسیع اقتصادی وسائل وخوشحالی اور درخشاں تمدن ان سب کی موجودگی روحانی مقامات اور الٰہی وانسانی اقدار کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ زیر بحث آیات میں حضرت سلیمانؑ کے پاس موجود تمام مادی نعمات کے ذکر کے بعد آخر میں بارگاہِ الٰہی میں ان کے بلند مقام اور نیک انجام کا ذکر کرتی ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

ارء یتم ما اعطی سلیمان بن داؤد من ملکہ؟ فان ذٰلک لم یزدہ الا تخشعًا، ماکان یرفع بصرہ الی السماء تخشعًا لربہ

تم نے دیکھا کہ اللہ نے سلیمان کو کیسی عظیم حکومت دی اس کے باوجود ان میں خشوع وخضوع کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا یہاں تک کہ شدتِ خشوع کے باعث وہ آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف نہیں دیکھتے تھے۔[1]

ب۔ ایک آباد ملک کا نظام چلانے کے لیے تیز رفتار رابطے کی بھی ضرورت ہے۔ مختلف قوتوں سے کام لینے کی بھی اور

---

[1] روح البیان، جلد ۸ ص ۲۹

تخریب کار اور فسادی قوتوں کو روکنے کی بھی ضرورت ہے، نیز انسانی و سماجی مسائل کی طرف توجہ بھی درکار ہے۔ مختلف وسائل و ذرائع سے کام لے کر سرمایہ تولید کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ لائق اور اہل مدبروں اور افسروں کو وسیع اختیارات بھی دینا ضروری ہیں۔ یہ تمام امور واضح طور پر اس داستان سے واضح ہوتے ہیں۔

ج ۔ تمام قوتوں اور طاقتوں سے استفادہ کرنا چاہیے حتیٰ کہ شیطانوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان میں سے بھی جو توجیہ اور ہدایت کے قابل ہیں انھیں صحیح استعمال میں لانا چاہیے اور صرف انھیں قید اور بندش میں ہونا چاہیے جو بالکل قابلِ استفادہ نہیں ہیں۔

۲۔ سلیمانؑ ـــــ قرآن اور تورات میں: قرآن نے اس عظیم نبی کی جو تصویر پیش کی ہے، اس کے مطابق ایک پاک و پاکیزہ، عالی رتبہ، مدبر اور عدالت پیشہ انسان تھے جبکہ موجودہ تحریف شدہ تورات انھیں (نعوذ باللہ) ایک عیاش، ہوس پرست اور بہت سی کمزوریوں کے حامل شخص کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ اسی کتاب میں حضرت سلیمانؑ کی مناجات، مذہبی اشعار اور حکیمانہ باتیں بھی شامل ہیں کہ جو نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ ایک حکیم و دانا، مجاہد اور جوانمرد تھے۔ یہ موجودہ تورات میں عجیب تضاد ہے۔

مزید وضاحت کے لیے اس تفصیلی بحث کی طرف رجوع کریں جو تفسیر نمونہ جلد ۱۸ میں سورۂ سبا کی آیت ۱۲ تا ۱۴ کی تفسیر کے ذیل میں اس ضمن میں کی گئی ہے۔

۴۱۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۝

۴۲۔ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۝

۴۳۔ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ۝

۴۴۔ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۗ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۗ نِعْمَ الْعَبْدُ ۗ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝

ترجمہ

۴۱۔ ہمارے بندے ایوب کو یاد کر، جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے رنج اور اذیت دی ہے

۴۲۔ (ہم نے اس سے کہا) اپنے پاؤں سے زمین پر ٹھوکر مار، یہ ٹھنڈے پانی کا چشمہ نہانے اور پینے کے لیے ہے۔

۴۳۔ اور ہم نے اسے اس کا خاندان عطا کیا اور ان کی طرح اور بھی ان کے ساتھ قرار دیئے تاکہ ہماری طرف سے رحمت ہو اور صاحبانِ فکر کے لیے ایک نصیحت ہے۔

۴۴۔ (اور ہم نے اس سے کہا) مٹھی بھر گندم کی (یا اس جیسی) سینکیں لے اور اسے (اپنی بیوی کو) مار اور اپنی قسم نہ توڑ، ہم نے اسے صابر پایا، کیا اچھا بندہ تھا کہ خدا کی طرف [illegible] رجوع کرنے والا تھا۔

تفسیر

حضرت ایوبؑ کی حیران کن زندگی اور ان کا صبر

گزشتہ آیات میں حضرت سلیمانؑ کی حشمت اور دبدبے کے بارے میں گفتگو تھی کہ جو خداداد قدرت کی مظہر تھی اور حضرت سلیمانؑ کی داستان رسولِ اکرمؐ اور مکہ میں موجود ان مسلمانوں کے لیے ایک نوید کے مانند تھی کہ جو سخت دباؤ میں تھے۔

زیرِ بحث آیات حضرت ایوبؑ کے بارے میں ہیں کہ جو صبر و استقامت کا نمونہ تھے۔ ان کا ذکر اس لیے ہے تاکہ اس وقت کے

اور پھر آج کے اور آئندہ کے مسلمانوں کے لیے مشکلوں اور پریشانیوں میں استقامت، قیام اور جدوجہد کا درس ہو اور انھیں پامردی کی دعوت دی جائے اور اس صبر و استقامت کا حسنِ انجام واضح کیا جائے۔

ایوبؑ تیسرے نبی ہیں کہ جن کی زندگی کا کچھ حصہ اس سورہ میں بیان کیا گیا ہے اور ہمارے عظیم نبیؐ پر فرض کیا گیا ہے کہ ان کی سرگزشت کو یاد رکھیں اور اسے مسلمانوں کے سامنے بیان کریں تاکہ وہ طاقت فرسا مشکلات سے ہراساں نہ ہوں اور اللہ کے لطف و رحمت سے کبھی بھی مایوس نہ ہوں۔

حضرت ایوبؑ کا نام اور ان کی زندگی کا ذکر قرآن کریم کی کئی ایک سورتوں میں آیا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۶۳ اور سورۂ انعام کی آیت ۸۴ میں دیگر انبیاء کے ساتھ ان کے صرف نام پر اکتفا کیا گیا ہے کہ جس سے ان کا مقامِ نبوت ثابت اور واضح ہوتا ہے برخلاف موجودہ تورات کے کہ جو انھیں انبیاء کے زمرے میں شمار نہیں کرتی بلکہ انھیں ایک نیک اور صالح انسان سمجھتی ہے کہ جنکی بہت سی اولاد تھی اور جو صاحبِ مال شخص تھے۔

سورۂ انبیاء کی آیت ۸۳ اور ۸۴ میں ان کی زندگی کے کچھ حالات بیان ہوئے ہیں اور سورۂ ص کی زیرِ بحث آیات میں دیگر مقامات سے مفصل تر حالات بیان ہوئے ہیں اور یہاں اس ضمن میں چار آیتیں آئی ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہمارے بندے ایوب کو یاد کر کہ جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کی: شیطان نے مجھے بہت تکلیف اور اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے (واذکر عبدنا ایوب اذ نادی ربہ انی مسنی الشیطان بنصب وعذاب)۔

"نصب" ("عسر" کے وزن پر) اور "نصب" ("حَسَد" کے وزن پر) دونوں بلا و مصیبت کے معنی میں ہیں۔ اس آیت میں۔

اوّلاً: بارگاہِ الٰہی میں حضرت ایوبؑ کا بلند مقام "عبدنا" (ہمارا بندہ) سے معلوم ہوتا ہے۔

ثانیاً: اشارتاً حضرت ایوب کی شدید اور طاقت فرسا تکلیف اور فراواں مصیبت کا ذکر ہے، اس ماجرے کی تفصیل قرآن میں نہیں آئی لیکن حدیث و تفسیر کی مشہور کتب میں اس کی تفصیل نقل ہوئی ہے۔

کسی شخص نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا:

وہ مصیبت جو حضرت ایوبؑ کو دامن گیر ہوئی، کس بنا پر تھی؟ (شاید سائل کا خیال تھا کہ ان سے کوئی غلط کام سرزد ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اللہ نے انھیں مصیبت میں مبتلا کر دیا)۔

امامؑ نے اس سوال کا تفصیلی جواب دیا جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

ایوب کفرانِ نعمت کی وجہ سے ان عظیم مصائب میں گرفتار نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس شکرِ نعمت کی وجہ سے ہوئے کیونکہ شیطان نے بارگاہِ خدا میں عرض کی کہ یہ جو ایوب تیرا شکرگزار ہے وہ فراواں نعمتوں کی وجہ سے ہے کہ جو تو نے اسے دی ہیں، اگر یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو یقیناً وہ کبھی شکرگزار بندہ نہیں ہوگا۔

اس بنا پر کہ ساری دنیا پر ایوب کا خلوص واضح ہو جائے اور انھیں عالمین کے لیے نمونہ قرار دیا جائے تاکہ

لوگ نعمت اور مصیبت ہر دو عالم میں شاکر و صابر رہیں۔ اللہ نے شیطان کو اجازت دی کہ وہ حضرت ایوب کی دنیا پر قبضہ کرلے۔ شیطان نے اللہ سے خواہش کی ایوب کا فراواں مال و دولت، ان کی کھیتیاں، بھیڑ بکریاں اور آل اولاد سب ختم ہوجائے۔ آفتیں اور مصیبتیں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تباہ و برباد ہوگیا لیکن نہ صرف یہ کہ ایوب کے شکر میں کمی نہیں آئی بلکہ اس میں اور اضافہ ہوگیا۔ خدا سے شیطان نے خواہش کی کہ اب اسے ایوب کے بدن پر بھی مسلط کردے اور وہ اس طرح بیمار ہوجائیں کہ ان کا بدن شدتِ درد کی لپیٹ میں آجائے اور وہ بیماری کے بستر کا اسیر ہوجائے لیکن اس چیز نے بھی ان کے مقامِ شکر میں کمی نہ کی۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے ایوب کا دل توڑ دیا اور ان کی روح کو سخت مجروح کیا۔ وہ یہ کہ بنی اسرائیل کے راہبوں کی ایک جماعت انھیں دیکھنے آئی اور انھوں نے کہا کہ تو نے کون سا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے اس دردناک عذاب میں مبتلا ہے؟ ایوب نے جواباً کہا: میرے پروردگار کی قسم کہ مجھ سے کوئی غلط کام نہیں ہوا میں ہمیشہ اللہ کی اطاعت میں کوشاں رہا ہوں اور میں نے جب بھی کوئی لقمۂ غذا کا کھایا ہے کوئی نہ کوئی یتیم و بے نوا میرے دسترخوان پر ہوتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایوب دوستوں کی اس شماتت پر ہر دوسری مصیبت سے زیادہ دُکھی ہوئے پھر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑا اور شکر کے صفاف و شیریں پانی کو کفران سے آلودہ نہ کیا، صرف بارگاہِ خدا کی طرف رُخ کیا اور مذکورہ جملہ عرض کیا اور چونکہ آپ اللہ کے امتحانوں سے خوب عہدہ برآ ہوئے لہٰذا اللہ نے اپنے اس شاکر و صابر بندے پر پھر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے اور کھوئی ہوئی نعمتیں یکے بعد دیگرے پہلے سے بھی زیادہ انھیں عطا کیں تاکہ سب لوگ صبر و شکر کا نیک انجام دیکھ لیں[1]

بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ شیطان نے حضرت ایوبؑ کو مختلف وسوسوں کے ذریعے اذیت دی تھی۔ کبھی کہتا تھا: تمھاری بیماری بہت طویل ہوگئی ہے اللہ نے تمھیں بھلا دیا ہے۔

کبھی کہتا تھا: تمھارے پاس کیا عظیم نعمتیں تھیں؟ کیسی صحت و طاقت تھی؟ سب خدا نے تم سے چھین لی ہیں اور تم پھر بھی اس کا شکر ادا کر رہے ہو؟

شاید یہ تفسیر اس بنا پر ہو کہ ان مفسرین نے ایوبؑ جیسے پیغمبر، ان کی جان، مال اور اولاد پر شیطان کا تسلط بعید سمجھا ہے،

---

[1] یہ روایت تفسیر نور الثقلین میں تفسیر علی بن ابراہیم کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ یہی مضمون تفسیر قرطبی، تفسیر فخر رازی اور تفسیر صافی وغیرہ میں اور اعلام القرآن میں کچھ فرق کے ساتھ آیا ہے۔ عہدِ عتیق کی کتب میں کتابِ ایوب میں اس سے ملتے جلتے مطالب نظر آتے ہیں اگرچہ یہ مطالب اسلامی کتب میں آنے والی تفصیلات سے مختلف ہیں۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اوّلاً تو یہ تسلط فرمانِ خدا سے تھا۔ ثانیاً وقتی طور پر تھا اور ثالثاً اس عظیم نبی کی آزمائش اور بلندیٔ مقام کے لیے تھا، اس لیے اس سے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔

ہر حال کہتے ہیں کہ ان کی بیماری اور ناراحتی سات سال تک رہی اور ایک روایت کے مطابق سترہ برس تک رہی، یہاں تک کہ آپ کے نزدیک ترین ساتھی بھی ساتھ چھوڑ گئے، صرف ایک بیوی نے وفا میں استقامت کی اور یہ چیز خود ایک شاہد ہے بعض بیویوں کی وفاداری پر۔ لیکن ایوب کو جس چیز سے زیادہ دکھ ہوتا تھا وہ دشمنوں کی شماتت تھی۔ اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت ایوبؑ کو کھوئی ہوئی صحت و سلامتی پھر مل گئی اور رحمت الٰہی کے دروازے ان کے لیے کھل گئے تو لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ سب سے شدید درد آپ کو کون سا تھا، تو آپ نے کہا: دشمنوں کی شماتت۔

انجام کار حضرت ایوبؑ آزمائشِ الٰہی کی اس گرم بھٹی سے صحیح و سالم باہر نکل آئے اور پھر رحمتِ خدا کا آغاز ہوا۔ انھیں حکم دیا گیا کہ "اپنا پاؤں زمین پر مارو" تو پانی کا چشمہ اُبل پڑے گا کہ جو تیرے نہانے کے لیے ٹھنڈا بھی ہوگا اور تیرے پینے کے لیے عمدہ بھی (ارکض برجلك هذا مغتسل بارد وشراب)۔

"ارکض" "رکض" (بروزنِ "مکث") کے مادہ سے زمین پر پاؤں مارنے کے معنی میں ہے اور کبھی یہ لفظ دوڑنے کے معنی میں بھی آتا ہے، لیکن یہاں پہلے والا معنی ہے۔

وہی خدا جس نے خشک اور تپتے بیابان میں شیر خوار اسماعیل کی ایڑیوں کے نیچے چشمہ پیدا کر دیا۔ وہی خدا کہ ہر حرکت و سکون اور ہر نعمت و عنایت جس کی طرف سے ہے، اس نے یہ فرمان ایوب کے لیے بھی صادر فرمایا، پانی کا چشمہ اُبلنے لگا، ٹھنڈا اور میٹھا چشمہ جو اندرونی و بیرونی سب بیماریوں کے لیے شفا بخش تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ اس چشمے میں ایک طرح کا معدنی پانی تھا جو پینے کے لیے بھی اچھا تھا اور بیماریوں کو دُور کرنے کے لیے بھی مؤثر تھا۔ بہر حال کچھ بھی تھا ایک صابر و شاکر نبی کے لیے اللہ کا لطف و کرم تھا۔

"مغتسل" نہانے والے پانی کو کہتے ہیں۔ بعض نے اسے نہانے کی جگہ کے معنی میں سمجھا ہے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال ٹھنڈا ہونے کے لحاظ سے پانی کی تعریف شاید اس طرف اشارہ ہو کہ ٹھنڈے پانی سے نہانا بدن کی صحت و سلامتی کے لیے خصوصی تاثیر رکھتا ہے جیسا کہ موجودہ طب میں بھی ثابت ہو گیا ہے۔

نیز یہ اس امر کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ نہانے کے لیے بہترین پانی وہ ہے جو پاکیزگی اور لطافت کے لحاظ سے پینے کے پانی جیسا ہو۔ اس امر کا شاہد یہ ہے کہ اسلامی احکام میں بھی آیا ہے کہ:

اس سے پہلے کہ پانی سے غسل کرو اس میں سے ایک گھونٹ پی لو[1]

پہلی اور اہم ترین خدائی نعمت صحت تھی، جب وہ ایوب کی طرف لوٹ آئی تو دوسری نعمتوں کے لوٹنے کی نوبت آئی۔ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے: ہم نے اسے اس کے گھر والے بخش دیئے (و وهبنا له اهله)۔ اور ان کے ساتھ ان کے

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱ باب ۱۳ از ابواب آداب الحمام، حدیث ۱

مانند بھی قرار دیئے (و مثلھم معھم) تاکہ ہماری طرف سے رحمت ہو اور صاحبانِ فکر و نظر کے لیے نصیحت بھی (رحمۃ منّا و ذکریٰ لاولی الالباب)۔

ان کا گھرانہ ان کے پاس کیسے واپس آیا، اس سلسلے میں مختلف تفسیریں موجود ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ وہ مر چکے تھے اور اللہ نے انھیں پھر زندگی دی۔

لیکن بعض نے لکھا ہے کہ حضرت ایوبؑ کی طویل بیماری کے باعث وہ اِدھر اُدھر بکھر چکے تھے جب حضرت ایوبؑ صحت یاب ہو گئے تو وہ پھر آپ کے گرداگرد جمع ہو گئے۔

کچھ لوگوں نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ وہ سب یا ان میں سے بعض افراد بھی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے، رحمتِ الٰہی ان کے شاملِ حال ہوئی وہ سب رُو بصحت ہو گئے اور پروانوں کی طرح وجودِ پدر کی شمع کے گرد جمع ہو گئے۔

"اور ان کے ساتھ ان کے مانند بھی قرار دیئے" یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے ان کے گھر کو پہلے سے بھی زیادہ آباد اور پُر رونق کیا اور ایوب کو مزید بیٹے عطا کیے۔

ان آیات میں اگرچہ حضرت ایوبؑ کی مال و دولت کے بارے میں بات نہیں کی گئی لیکن موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے پھر آپ کو مال و دولت بھی فراواں تر عطا فرمایا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں حضرت ایوبؑ کی طرف نعماتِ الٰہی کے لوٹ آنے کا مقصد دو چیزیں شمار کی گئی ہیں: ایک ان پر اللہ کی رحمت کہ جو انفرادی پہلو رکھتی ہے اور درحقیقت صابر و شاکر بندے کے لیے اجر و انعام ہے اور دوسری تمام تاریخِ انسانی میں صاحبانِ عقل و خرد کے لیے درسِ ہدایت، تاکہ وہ مشکلوں اور سختیوں میں صبر و شکیبائی کا راستہ نہ چھوڑیں اور ہمیشہ رحمتِ الٰہی کے امیدوار رہیں۔

اب صرف ایک مشکل ایوبؑ کے لیے باقی تھی وہ تھی وہ قسم جو انھوں نے اپنی بیوی کے بارے میں کھائی تھی اور وہ یہ تھی کہ انھوں نے ان سے کوئی خلافِ مرضی کام دیکھا تھا لہٰذا انھوں نے اس بیماری کی حالت میں قسم کھائی کہ جس وقت ان میں طاقت پیدا ہو گی تو وہ اسے ایک سو یا اس سے کچھ کم کوڑے ماریں گے، لیکن صحت یابی کے بعد وہ چاہتے تھے کہ اس کی خدمات اور وفاداریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے معاف کر دیں لیکن قسم اور خدا کے نام کا مسئلہ درمیان میں تھا۔ خدا نے یہ مشکل بھی ان کے لیے حل کر دی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ ان سے فرمایا گیا ــــ: گندم کی شاخوں (یا اسی قسم کی کسی چیز) کی ایک مٹھی بھر لو اور اس کے ساتھ مارو اور اپنی قسم نہ توڑو (وخذ بیدک ضغثاً فاضرب بہ و لا تحنث)۔

"ضغث" (بروزنِ "حرص") گندم یا جَو کی نرم و نازک شاخوں کی ایک مٹھی یا خرما کے خوشے کے تار یا پھولوں کی طرح کی چیزوں کی ایک مٹھی کے معنی میں ہے۔

حضرت ایوبؑ کی بیوی کا نام ایک روایت کے مطابق لیا بنت یعقوب تھا۔ اس بارے میں کہ اس سے کون سی غلطی ہوئی تھی مفسرین کے درمیان بحث ہے۔

مشہور مفسر ابنِ عباس سے نقل ہوا ہے کہ شیطان یا (کوئی شیطان صفت) ایک طبیب کی صورت میں ایوب کی بیوی کے پاس آیا

اس نے کہا: میں تیرے شوہر کا علاج کرتا ہوں صرف اس شرط پر کہ جس وقت وہ ٹھیک ہو جائے تو وہ مجھ سے یہ کہہ دے کہ صرف میں نے اسے شفایاب کیا ہے، اس کے علاوہ میں اور کوئی اُجرت نہیں چاہتا۔

ان کی بیوی نے جو ان کی مسلسل بیماری کی وجہ سے سخت پریشان تھی اس شرط کو قبول کر لیا اور حضرت ایوبؑ کے سامنے یہ تجویز پیش کی۔ حضرت ایوبؑ جو شیطان کے جال کو سمجھتے تھے، بہت ناراض ہوئے اور قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی کو سزا دیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ جناب ایوبؑ نے اسے کسی کام کے لیے بھیجا تھا تو اس نے دیر کر دی، حضرت ایوب چونکہ بیماری سے تکلیف میں تھے، بہت پریشان ہوئے اور اس طرح کی قسم کھائی۔

بہرحال اگر وہ ایک طرف سے اس قسم کی سزا کی مستحق تھی تو دوسری طرف اس طویل بیماری میں اس کی وفاداری، خدمت اور تیمارداری، اس قسم کے عفو و درگذر کا استحقاق بھی رکھتی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ گندم کی شاخوں کے ایک دستہ یا خوشۂ خرما کی لکڑیوں سے مارنا ان کی قسم کا واقعی مصداق نہیں تھا لیکن خدا کے نام کے احترام کی حفاظت اور قانون شکنی پھیلنے سے روکنے کے لیے انھوں نے یہ کام کیا اور یہ بات صرف اس صورت میں ہے کہ کوئی مستحقِ عفو و درگزر ہو، اور انسان چاہے کہ عفو و درگذر کے باوجود قانون کے ظاہر کو بھی محفوظ رکھے ورنہ ایسے مواقع پر جہاں استحقاقِ عفو و بخشش نہ ہو وہاں ہرگز اس کام کی اجازت نہیں ہے[1]

آخر میں زیرِ بحث آیات کے آخری جملے میں جو اس داستان کی ابتداء و انتہا کا نچوڑ ہے، فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے صابر و شکیبا پایا، ایوب کتنا اچھا بندہ تھا جو ہماری طرف بہت زیادہ بازگشت کرنے والا تھا (انا وجدناہ صابرًا نعم العبد انہ اوّاب)۔

یہ بات کہے بغیر ہی ظاہر ہے کہ ان کا خدا کی بارگاہ میں دعا کرنا اور شیطان کے وسوسوں اور درد، تکلیف اور بیماری کے دُور ہونے کا تقاضا کرنا، مقامِ صبر و شکیبائی کے منافی نہیں اور وہ بھی سات سال اور ایک روایت کے مطابق اٹھارہ سال تک بیماری اور فقر و ناداری کے ساتھ نبھانے اور شاکر رہنے کے بعد۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس جُملے میں حضرت ایوبؑ کی تین اہم صفات کے ساتھ توصیف کی گئی ہے کہ جو جس کسی میں بھی پائی جائیں وہ ایک انسان کامل ہوتا ہے۔

۱۔ مقامِ عبودیت ۲۔ صبر و استقامت ۳۔ پے در پے خدا کی طرف بازگشت

چند اہم نکات

ایوبؑ کی داستان کے اہم درس: اس کے باوجود کہ اس صابر پیغمبر کی ساری سرگزشت اس سورہ کی صرف چار آیتوں میں آئی ہے لیکن یہی مقدار جو قرآن نے بیان کی ہے بہت سے اہم حقائق کے لیے ہدایت بخش ہے۔

---

[1] اس معنی کی نظیر حدودِ اسلامی اور ان کے اجراء کے باب میں خطاکار بیماروں کے بارے میں بھی آئی ہے (کتاب الحدود۔ ابواب حد الزنا)

الف: خدا کی طرف سے آزمائش کا میدان اتنا وسیع اور کشادہ ہے کہ عظیم پیغمبر تک بھی شدید ترین اور سخت ترین آزمائشوں سے گزارے جاتے ہیں کیونکہ اس جہان کی زندگی کا مزاج اسی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ اصولی طور پر انسانوں کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں سخت قسم کی آزمائشوں کے بغیر ظاہر نہیں ہوتیں۔

ب: شدت اور سختی کے بعد فرج و کشائش، یہ دوسرا نکتہ ہے جو اس داستان میں چھپا ہوا ہے۔ جب امواج مشکلات و بلا ہر طرف سے انسان کو دباتی ہیں تو اسے نہ صرف مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے رحمتِ الٰہی کے دروازے کھلنے کی نشانی اور ایک تمہید سمجھنا چاہیے، جیسا کہ امیر المومنین علیؑ فرماتے ہیں:۔

عند تناهی الشدة تکون الفرجة، وعند تضایق حلق البلاء یکون الرخاء

جب سختیاں اپنی بلندی کو پہنچ جاتی ہیں تو فرج و کشائش نزدیک ہو جاتی ہے اور جس وقت بلا و مصیبت کے حلقے زیادہ تنگ ہو جاتے ہیں تو راحت و آسودگی آن پہنچتی ہے[1]

ج: اس داستان سے زندگی کی سخت مشکلات اور مصائب کے بعض فلسفے اچھی طرح سے واضح ہو جاتے ہیں، جو لوگ توحید کی بحث میں آفات اور بلاؤں کو برہانِ نظم کے برخلاف مادۂ نقض سمجھتے ہیں انھیں یہ داستان یہ جواب دیتی ہے کہ ان سخت حوادث کا وجود بعض اوقات انسانوں کی زندگی میں، عظیم انبیاء سے لے کر عام انسانوں تک ایک ضرورت ہوتا ہے، امتحان و آزمائش کی ضرورت، چھپی ہوئی صلاحیتوں کے ظاہر ہونے کی ضرورت اور انسان کے وجود کے ارتقاء و تکامل کی ضرورت۔

لہٰذا بعض روایات میں حضرت صادقؑ سے منقول ہوا ہے:

ان اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الذی یلونهم الامثل فالامثل

سب لوگوں سے زیادہ خدا کے پیغمبر سخت آفتوں اور مشکلات میں گرفتار ہوتے ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے پیچھے قرار پاتے ہیں اپنی شخصیت و مقام کے لحاظ اور مناسبت سے[2]

اسی امام بزرگوار سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ان فی الجنة منزلة لا یبلغها عبدٌ الا بالابتلاء

جنت میں ایک مقام ایسا ہے جس تک کوئی شخص نہیں پہنچ سکتا مگر ابتلائات اور مشکلات سے گزر کر[3]

د:۔ یہ داستان تمام سچے مومنین کو تمام زندگی میں صبر و شکیبائی کا درس دیتی ہے، وہی صبر جس کا انجام ہر میدان میں کامیابی و کامرانی ہے اور جس کا نتیجہ پروردگار کی بارگاہ میں "مقامِ محمود" اور "بلند منزلت" کا حصول ہے۔

ھ: جو آزمائش کسی انسان کو پیش آتی ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوستوں اور ساتھیوں کی بھی آزمائش ہوتی ہے تاکہ ان کی صداقت اور دوستی کا وزن بھی جانچ لیا جائے کہ وہ کس حد تک وفادار ہیں۔ حضرت ایوبؑ جس وقت اپنا مال و ثروت اور صحت و سلامتی

---

[1] نہج البلاغہ کلماتِ قصار جملہ ۳۵۱

[2] و [3] سفینۃ البحار مادہ "بلا" جلد ۱ ص ۱۰۵

کھو بیٹھے، تو ان کے دوست واحباب بھی تھک کر منتشر ہو گئے اور دوستوں اور دشمنوں نے مل کر شماتت وملامت کے لیے زبان کھولی، اور ہر زمانے سے بہتر انھوں نے اپنی اصلیت ظاہر کر دی اور ہم نے دیکھ لیا کہ ان کی زبان سے ایوبؑ کو جو دُکھ پہنچا تھا وہ دوسرے ہر رنج سے زیادہ تھا۔ کیونکہ مشہور ضرب المثل کے مطابق نیزہ وتلوار کے زخم تو مل جاتے ہیں لیکن جو زخم زبان دل پر لگاتی ہے وہ بھرنے والا نہیں ہوتا۔

و : خدا کے دوست وہ نہیں ہوتے جو صرف نعمتوں کے ان کی طرف رُخ کرنے کے وقت اس کی یاد میں رہتے ہوں، بلکہ واقعی دوست وہ ہوتے ہیں جو فراخی، تنگی، مصیبت ونعمت، بیماری وصحت اور فقر وغنا ہر حالت میں اس کی یاد میں رہیں اور مادی زندگی کی دگرگونیاں ان کے ایمان وافکار میں دگرگونی پیدا نہ کریں۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے اس غرّا و پرشور خطبہ میں جو آپؑ نے اپنے باصفا دوست "ہمام" کے لیے پرہیزگاروں کے اوصاف میں بیان فرمایا تھا اور ایک سو سے زیادہ صفات متقین کی بیان کی تھیں اس کے اہم اوصاف میں سے ایک یہ تھی:۔

نزلت انفسھم منھم فی البلاء کالتی نزلت فی الرخاء

ان کی روح بلا ومصیبت کے وقت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ راحت وآرام کی حالت میں (اور زندگی کی تبدیلیاں انھیں دگرگوں نہیں کرتیں)۔

ز : یہ ماجرا ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ نہ تو امکانات ووسائل مادی کا ہاتھ سے نکل جانا اور مصائب ومشکلات اور فقر وفاقہ کا رُخ کرنا، انسان کے لیے خدا کی بے لطفی کی دلیل ہے، اور نہ ہی امکاناتِ مادی کا فراہم ہونا، پروردگار کے قرب سے دوری کی دلیل ہے، بلکہ انسان ان تمام وسائل وامکانات کے ہوتے ہوئے خدا کا خاص بندہ ہو سکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ مال ومقام فرزند کا اسیر نہ ہو جائے، اور ان کے ہاتھ سے نکل جانے سے صبر کی زمام ہاتھ سے نہ چھوڑ دے۔

۲۔ ایوبؑ ـــــ قرآن وتورات میں: اس عظیم پیغمبر کا پاک چہرہ ـــــ جو صبر وشکیبائی کا مظہر ہے، یہاں تک کہ صبرِ ایوبؑ سب کے لیے ضرب المثل ہو گیا ہے، قرآن مجید میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ خدا نے کس طرح سے اس داستان کی ابتدا اور انتہا میں ان کی تعریف کی ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی سرگزشت بھی جاہلوں یا دانا دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہی اور ایسے ایسے خرافات ان پر باندھے گئے جن سے ان کی مقدس وپاک شخصیت منزہ ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیماری کے وقت حضرت ایوبؑ کے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے اور ان میں اتنی بدبو پیدا ہو گئی تھی کہ بستی والوں نے انھیں آبادی سے باہر نکال دیا۔

بلاشک وشبہ اس قسم کی روایت جعلی اور من گھڑت ہے، چاہے وہ حدیث کی کتابوں کے اندر ہی کیوں نہ ذکر ہوئی ہو۔ کیونکہ پیغمبروں کی رسالت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ ہر وقت اور ہر زمانے میں میل ورغبت کے ساتھ ان سے مل سکیں اور جو بات لوگوں کے تنفر وبے زاری اور افراد کے ان سے دور رہنے کا موجب بنے، چاہے وہ تنفر آمیز بیماریاں ہوں یا عیوبِ جسمانی یا اخلاقی خشونت وسختی، ان میں نہیں ہوں گی، کیونکہ یہ چیزیں ان کے فلسفۂ رسالت سے تضاد رکھتی ہیں۔

قرآن مجید پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں کہتا ہے:

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظًّا غليظ القلب لا نفضوا من حولك

رحمتِ الٰہی کے سایے میں تو ان کے لیے نرم و مہربان ہوگیا کیونکہ اگر تو سخت اور سنگ دل ہوتا تو وہ تیرے گردوپیش سے منتشر ہوجاتے۔

(آلِ عمران ـــــ ۱۵۹)

یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ پیغمبر کو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اس کے اطراف سے منتشر ہوجائیں۔

لیکن تورات میں ایک مفصل قصہ "ایوب" کے بارے میں نظر آتا ہے جو "مزامیر داؤد" سے پہلے موجود ہے۔ یہ کتاب ۴۲ فصل پر مشتمل ہے اور ہر فصل میں تفصیلی بحث موجود ہے۔ بعض فصول میں تو انتہائی تکلیف دہ مطالب نظر آتے ہیں، ان میں سے تیسری فصل میں ہے کہ:

"ایوب نے شکایت کے لیے زبان کھولی اور بہت زیادہ شکوہ کیا، جب کہ قرآن نے انکی صبر و شکیبائی کی تعریف کی ہے۔

۳۔ عظیم پیغمبروں کی "اوّاب" کہہ کر توصیف: اسی سورہ "ص" میں تین پیغمبروں کی "اوّاب" کے لفظ کے ساتھ توصیف کی گئی ہے اور وہ ہیں: داؤدؑ، سلیمانؑ اور ایوبؑ۔ سورۂ ق کی آیہ ۳۲ میں یہ صفت تمام جنتیوں کے لیے بیان کی گئی ہے۔

هٰذا ما توعدون لكل اوّاب حفيظ

یہ تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ "اوّابین" کا ایک بلند و بالا مقام ہے۔ جب ہم لغت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ "اوّاب" "اوب" (بروزنِ "قول") کے مادہ سے رجوع کرنے اور بازگشت کے معنی میں ہے۔ یہ رجوع اور بازگشت ـــــ خصوصاً اوّاب کے صیغۂ مبالغہ کی طرف دیکھیں تو تکرار اور کثرت پر دلالت کرتا ہے۔

گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "اوّابین" ان عوامل کے مقابلے میں بہت حساس ہیں جو انھیں خدا سے دُور کرتے ہیں، خواہ وہ عالمِ مادہ کی دل فریبیاں ہوں یا نفس اور شیاطین کے وسوسے، اگر وہ ایک لمحے کے لیے دُور ہوجاتے ہیں تو فوراً متوجہ ہوکر اس کی طرف لوٹتے ہیں اور اگر ایک لحظے کے لیے غافل ہوجاتے ہیں تو اس کی یاد کر کے تلافی کرتے ہیں۔

یہ بازگشت ممکن ہے خدائی اوامر و نواہی کی طرف بازگشت ہو، یعنی ان کا لگاؤ ہر جگہ اس کے فرمان ہی سے ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔

سورۂ سبا کی آیہ ۱۰ میں ہے:

یاجبال اوّبی معہ و الطیر

یہ حضرت داؤدؑ کے بارے میں ہے۔ اس سے اوّاب کا ایک اور معنی بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ ہم آواز ہونا ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے۔

اے پہاڑو اور اے پرندو! داؤد کے ساتھ ہم صدا ہو جاؤ۔

اس بنا پر "اوّاب" وہ شخص ہے جو قوانین، خلقت، اوامرِ الٰہی اور موجوداتِ عالم کی عمومی حمد و تسبیح کے ساتھ ہم صدا اور ہم آہنگ ہو اور اتفاق کی بات ہے کہ "ایوب" کے معانی میں سے ایک "اوّاب" بھی ہے۔

۴۵۔ وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ ○

۴۶۔ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ○

۴۷۔ وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ ○

۴۸۔ وَاذْكُرْ إِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِنَ الْأَخْيَارِ ○

ترجمہ

۴۵۔ اور ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو جو (طاقت ور) ہاتھوں والے اور (بینا) آنکھوں والے تھے۔

۴۶۔ ہم نے انھیں خاص خلوص کے ساتھ خالص کیا تھا اور وہ آخرت کی یاد آوری تھی۔

۴۷۔ اور وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور نیک افراد میں سے ہیں۔

۴۸۔ اور اسماعیل، الیسع اور ذا الکفل کو بھی یاد کرو، وہ سب نیک لوگوں میں سے ہیں۔

تفسیر

چھ اور عظیم پیغمبر

گزشتہ آیات میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی زندگی کے بارے میں شرح وبسط کے ساتھ گفتگو تھی نیز حضرت ایوبؑ جیسے عظیم پیغمبر کی زندگی کے اہم نقاط کے سلسلے میں مختصر سا ذکر تھا۔ زیر بحث آیات میں خدا کے عظیم ترین پیغمبروں میں سے چھ دیگر پیغمبروں کا نام ذکر کیا جارہا ہے۔ نیز ان کی وہ عمدہ صفات جو تمام انسانوں کے لیے نمونہ اور اسوہ بن سکتی ہیں اختصار کے ساتھ بیان کی جارہی ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان چھ عظیم پیغمبروں کے لیے چھ ایسے مختلف اوصاف ذکر کیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک خاص معنیٰ و مفہوم رکھتا ہے۔

پہلے تو روئے سخن پیغمبر اسلامؐ کی طرف کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: یاد کر ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کو (واذکر عبادنا ابراھیم واسحاق ویعقوب)۔

مقام عبودیت و بندگی پہلی صفت ہے جو ان کے لیے بیان ہوئی ہے اور واقعاً ہر چیز اسی میں جمع ہے۔ خدا کی بندگی یعنی اس کے

ساتھ مطلق وابستگی، یعنی اس کے ارادے کے سامنے اپنا کوئی ارادہ نہ رکھنا۔ اور ہر حالت میں اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔

خدا کی بندگی یعنی اس کے غیر سے بے نیازی اور ماسوی اللہ سے بے اعتنائی اور صرف اسی کے لطف و کرم پر نظر رکھنا، یہی انسان کے ارتقاء کی بلندی اور اس کا برترین شرف و افتخار ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ طاقت ور ہاتھوں والے اور بینا آنکھوں کے مالک تھے۔ (اولی الأیدی والابصار)۔

کتنی عجب تعبیر ہے؟ ہاتھوں اور آنکھوں والے!

"ایدی" "ید" کی جمع ہے اور "ابصار" "بصر" کی جمع ہے اور آنکھ اور بینائی کے معنی میں ہے۔

انسان اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دو قوتوں کا محتاج ہے۔

۱۔ ادراک اور پہچان کی قوت۔ ۲۔ کام اور عمل کی قوت۔ دوسرے لفظوں میں "علم" اور "قدرت" سے مدد لینا چاہیے تاکہ اپنے مقصد کو حاصل کر سکے۔

خدا نے ان پیغمبروں کی یہ توصیف کی ہے کہ کاموں کو انجام دینے کے لیے ان کے پاس درک اور پہچان کی کافی طاقت اور قوی بصارت موجود تھی۔

وہ کم خبر افراد نہیں تھے، ان کی سطحِ معرفت اونچی تھی۔ دینِ خدا، اسرارِ آفرینش اور رموزِ زندگی کے بارے میں ان کی آگاہی بہت تھی۔

ارادہ اور قوتِ عمل کے لحاظ سے وہ سُست اور ضعیف و ناتواں افراد نہیں تھے، بلکہ باارادہ، قوی اور آہنی و قاطع ارادے کے مالک تھے۔

یہ تمام راہِ حق کے راہ روؤں کے لیے ایک نمونہ ہے کہ وہ مقامِ عبودیت اور خدا کی بندگی کے بعد، ان دو تیز دھار ہتھیاروں سے مسلح ہوں۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ یہاں ہاتھ اور آنکھ سے مراد دو مخصوص اعضاء نہیں ہیں، کیونکہ بہت سے ایسے افراد ہیں جو یہ دونوں اعضاء تو رکھتے ہیں لیکن نہ تو کافی ادراک و شعور رکھتے ہیں اور نہ ہی قوتِ ارادہ اور نہ عمل کرنے پر قدرت۔ بلکہ یہ دو صفات "علم اور طاقت" کے لیے کنایہ ہیں۔

ان کی چوتھی صفت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے انھیں خاص قسم کے خلوص کے ساتھ خالص کیا ہے (انا اخلصناھم بخالصة)۔

اور وہ تھی دارِ آخرت کی یاد آوری (ذکری الدار)۔[1]

---

[1] "ذکری الدار" ممکن ہے مبتدائے محذوف کی خبر ہو اور تقدیر میں "ھی ذکری الدار" تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ "خالصة" سے "بدل" ہو۔

ہاں وہ ہمیشہ دوسرے جہان کی یاد میں رہتے تھے ۔ ان کی نگاہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی اور اس کی لذات تک محدود نہیں تھی۔ وہ اس زود گزر زندگی کے علاوہ بے پایاں نعمتوں سے معمور ایک جاودانی گھر کو دیکھتے تھے اور ہمیشہ اس کے لیے سعی و کوشش کرتے رہتے تھے ۔

اس بنا پر " الدار" (گھر) جو مطلق طور پر ذکر ہوا ہے سے مراد آخرت کا گھر ہے ۔ گویا اس کے علاوہ کوئی اور گھر وجود ہی نہیں رکھتا اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اس کی طرف جانے والی ایک گذرگاہ ہے ۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں " دار" سے مراد دارِ دنیا ہے اور " ذکری الدار" کی تعبیر اس نیک نامی کی طرف اشارہ ہے جو ان پیغمبروں کے لیے اس دنیا میں باقی رہ گئی لیکن یہ احتمال ـــــ خصوصاً " الدار" کے مطلق ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے ـــــ بہت ہی بعید نظر آتا ہے اور لفظ " ذکریٰ" کے ساتھ بھی چنداں ہم آہنگ نہیں ہے ۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد دارِ آخرت میں نیک نامی اور ذکرِ جمیل ہے ، جب کہ یہ بھی بعید نظر آتا ہے ۔

بہر حال دوسرے لوگوں کے لیے بھی ممکن ہے کہ کبھی کبھی آخرت کے گھر کو یاد کر لیں ، خصوصاً جب ان کے دوستوں میں سے کوئی دنیا سے چلا جاتا ہے یا جب کسی عزیز کے جنازے کے ساتھ یا اس کی یاد منانے کے لیے وہ حاضر ہوتے ہیں ۔ لیکن یہ یاد خالص نہیں ہوتی بلکہ دنیا کی یاد کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے لیکن مردانِ خدا خالص ، عمیق ، دائمی اور مسلسل توجہ دوسرے جہان کی طرف رکھتے ہیں ، گویا وہ ہمیشہ ان کی آنکھوں کے سامنے حاضر ہے اور آیت میں " خالصة" کی تعبیر اسی بات کی طرف اشارہ ہے ۔

ان کی پانچویں اور چھٹی صفت بعد والی آیت میں آئی ہے ، فرمایا گیا ہے : وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور نیک افراد میں سے ہیں (و انھم عندنا لمن المصطفین الاخیار)[1]

ان کا ایمان اور عملِ صالح اس بات کا سبب بنا کہ خدا انھیں اپنے بندوں میں سے چن لے اور منصبِ نبوت و رسالت کے ساتھ مفتخر و معزز بنائے اور ان کی نیکوکاری اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ بطور مطلق " اخیار" (نیکوکار) کہلانے کے حق دار ہو گئے ۔

ان کے افکار نیک ، ان کے اخلاق نیک ، ان کے اعمال اور ساری کی ساری زندگی نیک ہے اور " آنچہ خوباں ہمہ دارند آنہا تنہا دارند" ۔

اسی بنا پر بعض مفسرین نے اس تعبیر سے کہ خدا بغیر کسی شرط کے انھیں " اخیار" کے لفظ سے پکار رہا ہے ، انبیاء کے لیے مقامِ عصمت کا مفہوم لیا ہے[2]

" عندنا" (ہمارے نزدیک) کی تعبیر بہت ہی معنی خیز ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا برگزیدہ اور نیک ہونا

---

[1] " مصطفین" (فا کی زبر کے ساتھ) " مصطفیٰ" کی جمع ہے اور اصل میں " مصطفیین" تھا پہلی " یا" حذف ہو گئی تو " مصطفین" ہو گیا ۔

[2] تفسیر فخر رازی ، جلد ۲۶ ص ۲۱۷

لوگوں کے نزدیک نہیں ہے، جو بعض اوقات اپنی ذاتی جانچ کے لیے چشم پوشی کو جائز سمجھ لیتے ہیں، بلکہ ان کا ان دو صفات سے متصف ہونا ہمارے نزدیک ثابت شدہ ہے، جو دیکھ بھال کر اور ان کے ظاہر و باطن کو جانچ کر انجام پایا ہے۔

مذکورہ تین پیغمبروں کے اہم مقام کی طرف اشارہ کرنے کے بعد دیگر تین انبیاء کی باری آتی ہے۔ فرمایا گیا ہے: اور یاد کر اسماعیل، الیسع اور ذالکفل کو، جو سب کے سب اخیار اور نیک لوگوں میں سے تھے (واذکر اسماعیل و الیسع و ذا الکفل کل من الاخیار)۔

ان میں سے ہر ایک صبر و استقامت اور فرمانِ خدا کی اطاعت میں ایک اُسوہ اور نمونہ تھا خصوصاً اسماعیلؑ جو اپنی جان کو اس کی راہ میں فدا کرنے پر تیار ہو گئے اور اسی بنا پر ان کا نام ذبیح اللہ ہو گیا۔ اپنے باپ کے ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر میں اور اس عظیم مرکز کو رونق بخشنے اور بہت سی دوسری ذمہ داریوں میں بہت زیادہ ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کی زندگی کی طرف توجہ کرنا پیغمبر اسلامؐ اور تمام مسلمانوں کے لیے تقویت بخش ہے۔ ایسے عظیم مردانِ خدا کی زندگی کا مطالعہ انسانوں کی زندگی میں راہنمائی کرتا ہے اور ان میں تقویٰ، فداکاری اور ایثار و قربانی کی روح زندہ کرتا ہے، اور سخت مشکلات میں انھیں ثابت قدم رکھتا ہے۔

"کل من الاخیار" کی تعبیر، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہی توصیف (الاخیار) بعینہٖ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے بارے میں آخری صفت کے طور پر آئی ہے، ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ تین پیغمبر بھی گزشتہ تین پیغمبروں کی تمام صفات کے حامل ہیں۔ کیونکہ خیر مطلق کا ایک وسیع معنی ہے جس میں نبوت بھی آخرت کے گھر کی طرف توجہ بھی اور مقام عبودیت و علم و قدرت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

ان تینوں پیغمبروں میں سے حضرت اسماعیلؑ سب سے زیادہ مشہور اور زیادہ جانے پہچانے ہیں لیکن "الیسع" جن کا نام صرف دو مرتبہ قرآن میں آیا ہے (یہاں اور سورۂ انعام کی آیہ ۸۶ میں) کے بارے میں قرآن کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بھی خدا کے بزرگ پیغمبروں میں سے تھے اور ان بزرگوں میں سے تھے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

و کلاً فضلنا علی العالمین

ہم نے ان میں سے ہر ایک کو عالمین پر برتری و فضیلت بخشی۔ (انعام ـــــ ۸۶)

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر یوشع بن نون ہیں جن پر "الف و لام" داخل ہوا ہے اور اس کی "شین" "سین" سے بدل گئی ہے اور کسی غیر عربی کے نام پر (جبکہ یہ عبرانی ہے) الف و لام کا داخل ہونا کوئی نئی چیز نہیں ہے، جس طرح سے کہ عرب "اسکندر" کو "الاسکندر" کے نام سے پہچانتے ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے اسے ایک عربی لفظ سمجھتے ہیں جو "یسع" (مادہ "وسعت" فعل مضارع) سے لیا گیا ہے اور اسمی پہلو اختیار کرنے کے بعد الف و لام جو مشخصات اسم میں سے ہے اس پر آ گیا ہے۔

سورۂ انعام کی آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اولادِ ابراہیمؑ میں سے تھے لیکن یہ واضح نہیں کرتی کہ آیا وہ بنی اسرائیل میں سے تھے یا نہیں؟

تورات کی کتاب "بادشاہان" میں ان کا نام "الیشع" بن "شلغات" لکھا ہوا ہے اور عبرانی زبان میں الیشع کا معنی "ناجی" اور "شافات" کا معنی "قاضی" ہے۔

بعض اسے اور "خضر" کو ایک ہی سمجھتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور یہ جو بعض اسے "ذاالکفل" ہی سمجھتے ہیں تو یہ زیر بحث آیت کے صریح برخلاف ہے کیونکہ آیت نے ذاالکفل کا "الیسع" پر عطف کیا ہے۔ بہرحال وہ ایک بلند مقام اور پُر استقامت پیغمبر ہیں اور ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کے لیے ہمارے لیے یہی کافی ہے۔

باقی رہے "ذاالکفل" تو مشہور یہی ہے کہ وہ پیغمبروں میں سے تھے اور ان کے نام کا سورۂ انبیاء کی آیہ ۸۵ میں پیغمبروں کے ناموں کے ساتھ اسماعیلؑ اور ادریسؑ کے بعد ذکر اس معنی پر گواہ ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے، وہ انھیں ایوبؑ کا فرزند سمجھتے ہیں جس کا اصلی نام "بشر" یا "بشیر" یا "شرف" تھا۔ بعض انھیں "حزقیل" سمجھتے ہیں کہ ذاالکفل ان کے لقب کے طور پر مشہور ہو گیا ہے[1]

انھیں ذاالکفل کا نام کیوں دیا گیا؟ اس بارے میں اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "کفل" نصیب اور حصہ کے معنی میں بھی آیا ہے اور کفالت و عہدہ داری کے معنی میں بھی علماء نے مختلف احتمال ذکر کیے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا ہے کہ چونکہ خدا نے اپنے ثواب و رحمت کا وافر حصہ انھیں مرحمت فرمایا ہے۔ لہٰذا "ذاالکفل" یعنی (صاحب بہرۂ وافی) کے نام سے موسوم ہوئے۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ انھوں نے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ راتوں کو عبادت کے لیے اٹھیں گے اور دن میں روزہ رکھا کریں گے اور قضاوت اور فیصلہ کرتے وقت ہرگز غصے میں نہ آئیں گے اور وہ اپنے اس عہد و پیمان پر قائم رہے لہٰذا انھیں یہ لقب دیا گیا۔

کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ انھوں نے بنی اسرائیل کے انبیاء کے ایک گروہ کی کفالت کی تھی اور وقت کے ظالم بادشاہ سے انکی جان بچائی تھی اس لیے انھیں یہ نام دیا گیا ہے۔

بہرحال ان کی زندگی کے حالات کی اتنی ہی مقدار جو آج ہماری دسترس میں ہے، خدا کی اطاعت و بندگی اور ظالموں کے مقابلے میں ان کی استقامت پامردی کی دلیل ہے اور ہمارے آج اور کل کے لیے ایک سبق ہے۔ اگرچہ ان کی زندگی کی تفصیلات کے بارے میں زمانے کی دوری کے سبب دقیق طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] اعلام القرآن، تفسیر قرطبی، تفسیر روح البیان اور تفسیر المیزان میں سے ہر ایک نے مذکورہ بالا مطالب کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۴۹۔ هٰذَا ذِكْرٌ ؕ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ۙ
۵۰۔ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۚ
۵۱۔ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ۝
۵۲۔ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ۝
۵۳۔ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ الثلثة
۵۴۔ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ۝ ج صلے

ترجمہ

۴۹۔ یہ تو ایک یاد آوری ہے اور پرہیزگاروں کے لیے اچھا مقام ہے۔
۵۰۔ بہشت کے جاودانی باغات، جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔
۵۱۔ وہ اس میں تختوں پر تکیہ کیے ہوئے (بیٹھے ہوں گے) اور انواع واقسام کے پھل اور طرح طرح کے مشروبات ان کی رسائی میں ہوں گے۔
۵۲۔ اور ان کے پاس ایسی بیویاں ہوں گی جو اپنے شوہروں کی طرف ہی دیکھتی رہتی ہیں اور وہ سب کی سب ہم عمر ہوں گی۔
۵۳۔ یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے قیامت کے دن کے لیے وعدہ کیا جاتا ہے (ناقابلِ شکن وعدہ)۔
۵۴۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

تفسیر

پرہیزگاروں کے لیے وعدہ

یہاں سے اس سورہ کی آیات کا دوسرا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ اس میں پرہیزگاروں کا سرکش باغیوں کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے قیامت میں دونوں گروہوں کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے اور مجموعی حیثیت سے گزشتہ آیات کے مباحث کی تکمیل ہو رہی ہے۔

پہلے تو گزشتہ انبیاء کی سرگزشت اور ان کی زندگی کے اصلاحی و تربیتی نکات کے بارے میں کلّی طور پر فرمایا گیا ہے : یہ ایک تذکر اور یاد آوری ہے (ھٰذا ذکر)[1]

ہاں! ان کی پرشکوہ تاریخ کے نشیب و فراز کو بیان کرنے کا مقصد داستان سرائی نہیں بلکہ ذکر و تذکر تھا۔ جیسا کہ اس سورہ کی ابتداء ہی اسی مسئلے سے کی گئی ہے "ص والقرآن ذی الذکر"

اصل مقصد ان مسلمانوں میں جن کے لیے یہ آیات نازل ہوئی ہیں، فکر و نظر کو بیدار کرنا، معرفت و آگاہی کی سطح بلند کرنا اور استقامت و پامردی کی قوت و طاقت کا اضافہ کرنا ہے[2]

اس کے بعد اس امر کو انفرادی اور انبیاء کی زندگی سے نکال کر کلّی شکل دی گئی ہے۔ متقین کی سرنوشت کو عمومی طور پر محلِ بحث قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے : پرہیزگاروں کے لیے اچھا مقام اور جائے بازگشت ہے (وان للمتقین لحسن مآب)[3]

اس مختصر سے سربستہ جملے کے بعد جو ان کے حال کی خوبی اور اچھائی کی اجمالی طور پر تصویر کشی کرتا ہے اجمال سے تفصیل کی قرآنی روش سے استفادہ کرتے ہوئے اس کی تشریح و تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ان کی بازگشت اس جنت کے جاودانی باغات کیطرف ہے جس کے دروازے ان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں (جنّات عدن مفتحة لھم الابواب)[4]

"جنّات" بہشت کے باغات کی طرف اشارہ ہے اور "عدن" (بروزن "عدل") استقرار و ثبات کے معنی میں ہے اور "معدن" کو اس بنا پر "معدن" کہا گیا ہے کیونکہ مختلف دھاتیں اور گراں قیمت مواد وہاں مستقر ہوتا ہے۔ بہرحال یہ تعبیر یہاں جنت کے باغوں کے جاودانی اور ابدی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

"مفتّحة لھم الابواب" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشتیوں کے لیے دروازے کھولنے تک کی بھی زحمت نہیں ہوگی، گویا بہشت ان کے انتظار میں ہے اور جس وقت اس کی نگاہ ان پر پڑے گی تو آغوش پھیلا دے گی اور انھیں اندر آنے کی دعوت دے گی۔

اس کے بعد بہشتیوں کے خصوصی احترام اور ان کے آرام و سکون کو اس صورت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کی حالت یہ ہوگی کہ وہ اس میں تختوں پر تکیہ لگائے (بیٹھے) ہوں گے اور انواع و اقسام کے فراواں پھل اور مشروبات ان کی دسائی میں ہوں گے۔ جس وقت وہ طلب کریں گے

---

[1] بعض مفسرین نے اس جملے کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد گزشتہ انبیاء کا ذکر جمیل ہے۔

[2] مفسرین کی ایک جماعت نے "ھٰذا ذکر" کو اس بات کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو کچھ گزشتہ انبیاء کے بارے میں بیان ہوا ہے وہ تو ان کا ذکرِ خیر اور ثنا جمیل تھی اور بعد والی آیات آخرت میں ان کے مقامات کو بیان کر رہی ہیں لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے، مگر آیات کا ظاہر کلّی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

[3] "مآب" کا معنی ہے مقام بازگشت اور "حسن" کی "مآب" کی طرف اضافت صفت کی موصوف کی طرف اضافت ہے۔

[4] "جنات عدن" "مآب" سے بدل یا عطف بیان ہے۔

فوراً ان کے پاس پہنچ جائیں گے (متکئین فیھا یدعون فیھا بفاکھۃ کثیرۃ و شراب)[1]۔

کیا یہ سب کچھ جنت کے خدمت گاروں کے ذریعے فوراً ان کے سامنے حاضر ہو جائے گا یا ان کے حاضر ہونے کے لیے ان کا ارادہ ہی کافی ہوگا، اس کے لیے دونوں احتمال موجود ہیں۔

"فاکھۃ" اور "شراب" ("پھل" اور "مشروبات") کا ذکر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ بہشتیوں کی زیادہ تر غذا پھل ہوگی، اگرچہ قرآنی آیات کی صراحت کے مطابق دوسری غذائیں اور کھانے بھی وہاں موجود ہوں گے۔

جیسا کہ اس دنیا میں بھی انسان کے لیے بہترین اور مکمل ترین غذا پھل ہی ہے۔

"کثیرۃ" کی تعبیر مختلف بہشتی پھلوں کی انواع و اقسام کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ اس کے مشروبات اور شراب طہور بھی کئی قسم کی ہوگی جس کی طرف قرآن کی مختلف آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد بہشت کی پاکیزہ بیویوں کے بارے میں بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: بہشتیوں کے پاس ایسی بیویاں ہوں گی کہ جن کی آنکھیں فقط اپنے شوہروں پر جمی ہوں گی وہ سب کی سب جوان اور اپنے شوہروں کی ہم عمر و ہم سن ہوں گی (وعندھم قاصرات الطرف اتراب)۔

"طرف" (بروزن "برف") پلک کے معنی میں ہے اور کبھی نگاہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جنت کی عورتوں کی "قاصرات الطرف" (جو تنگ نگاہ رکھتی ہیں) سے توصیف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے صرف اپنے شوہروں پر نظریں جمائی ہوئی ہیں۔ صرف انھیں سے عشق و محبت کرتی ہیں اور ان کے علاوہ کسی کو بھی تصور میں نہیں لاتیں۔ یہ بات بیویوں کی خوبی میں سے عظیم ترین خوبی ہے۔ بعض مفسرین نے اسے آنکھوں کے مخمور ہونے کے معنی میں سمجھا ہے جو ایک نہایت جاذب و پرکشش حالت ہے۔ ان دونوں معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

"اتراب" ہم سن و سال اور ہم عمر ہونے کے معنی میں ہے یہ جنت کی عورتوں کی اپنے شوہروں کے لیے ایک اور صفت کا بیان ہے، کیونکہ شوہر اور بیوی کے درمیان عمر کی موافقت کشش کو بڑھاتی ہے یا یہ خود انھیں عورتوں کی صفت ہے کہ وہ سب کی سب ہم سن و سال اور جوان ہیں[2]

آخری زیر بحث آیت میں بہشت کی ان تمام ساتوں کی ساتوں مذکورہ نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے روزِ حساب کے لیے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ (ھٰذا ما توعدون لیوم الحساب)۔ ناقابل شکن اور

---

[1] دونوں جگہ "فیھا" کی ضمیر "جنّات عدن" کی طرف لوٹتی ہے اور "فاکھۃ" کی توصیف "کثیرۃ" کے ساتھ اس وصف سے "شراب" کی توصیف کی بھی دلیل ہے اور "متکئین" "یدعون" کی ضمیر کے لیے حال ہے۔ یعنی وہ بہشتِ جاودان میں جس کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور وہ مسندوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے اور مختلف پھلوں اور انواع و اقسام کے مشروبات لانے کا حکم دے رہے ہوں گے۔

[2] "اتراب" جمع ہے "ترب" (بروزنِ "شعر") کی۔

نشاط انگیز وعدہ، خداوندِ عظیم کی طرف سے وعدہ۔

ان نعمات کے جاودانی اور ابدی ہونے کی تاکید کے طور پر مزید ارشاد ہوتا ہے: یہ ہمارا رزق اور ہماری دی ہوئی روزی ہے، یہ ایک ایسی عطا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی اور اس کے لیے فنا کا تصور ہی نہیں ہے (ان ھٰذا لرزقنا ما لہ من نفاد)[1]۔

اس بنا پر زوال و نابودی کا غم۔ جو ایک منحوس سائے کی طرح اس جہان کی نعمتوں پر پڑا ہے۔ وہاں موجود نہیں اور وہ خدا کے پُر بار خزانوں کی برکت سے ہمیشہ مدد لیتا رہتا ہے اور اس کے لیے محدودیت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کسی قسم کی کمی اس میں ظاہر نہیں ہوگی کیونکہ خدا کا ارادہ یہی ہے۔

---

[1] "نفاد" فنا اور نابودی کے معنی میں ہے اور "لرزقنا" کی لام تاکید کے لیے ہے۔

۵۵۔ هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ۙ

۵۶۔ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

۵۷۔ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ۙ

۵۸۔ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ؕ

۵۹۔ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ۝

۶۰۔ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۛؕ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝

۶۱۔ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِى النَّارِ ۝

ترجمہ

۵۵۔ یہ (تو پرہیزگاروں کا اجر ہے) اور طغیان گروں کے لیے بدترین جائے بازگشت ہے۔

۵۶۔ دوزخ ہے، جس میں وہ داخل ہوں گے اور کیا ہی بُرا بستر ہے؟

۵۷۔ یہ حمیم وغساق (جلانے والے اور سیاہ رنگ کے مشروبات) ہیں جن کا مزہ چکھنا ہوگا۔

۵۸۔ اور ان کے علاوہ ان کے لیے ان کی ہم شکل دوسری سزائیں ہوں گی۔

۵۹۔ (ان سے کہا جائے گا) یہ وہ فوج ہے جو تمھارے ساتھ جہنم میں داخل ہوگی (یہ وہی گمراہ سردار ہیں) ان کے لیے مرحبا اور خوش آمدید نہیں ہے۔ وہ سب کے سب آگ میں جلیں گے۔

۶۰۔ وہ (اپنے سرداروں سے) کہیں گے، بلکہ خوش آمدید تمھارے لیے نہ ہو کیونکہ تم نے یہ عذاب ہمارے لیے فراہم کیا ہے، یہ کتنا بُرا ٹھکانا ہے؟

۶۱۔ (اس کے بعد) وہ کہیں گے: پروردگارا! جس نے یہ عذاب ہمارے لیے فراہم کیا ہے، اس کے لیے آگ میں کئی گنا عذاب کا اضافہ فرما۔

۵۵۔ هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ۙ
۵۶۔ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ○
۵۷۔ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ۙ
۵۸۔ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ؕ
۵۹۔ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ○
۶۰۔ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۛؕ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ○
۶۱۔ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِى النَّارِ ○

ترجمہ

۵۵۔ یہ (تو پرہیزگاروں کا اجر ہے) اور طغیان گروں کے لیے بدترین جائے بازگشت ہے۔
۵۶۔ دوزخ ہے، جس میں وہ داخل ہوں گے اور کیا ہی بُرا بستر ہے؟
۵۷۔ یہ حمیم وغساق (جلانے والے اور سیاہ رنگ کے مشروبات) ہیں جن کا مزہ چکھنا ہوگا۔
۵۸۔ اور ان کے علاوہ ان کے لیے ان کی ہم شکل دوسری سزائیں ہوں گی۔
۵۹۔ (ان سے کہا جائے گا) یہ وہ فوج ہے جو تمھارے ساتھ جہنم میں داخل ہوگی (یہ وہی گمراہ سردار ہیں) ان کے لیے مرحبا اور خوش آمدید نہیں ہے۔ وہ سب کے سب آگ میں جلیں گے۔
۶۰۔ وہ (اپنے سرداروں سے) کہیں گے، بلکہ خوش آمدید تمھارے لیے نہ ہو کیونکہ تم نے یہ عذاب ہمارے لیے فراہم کیا ہے، یہ کتنا بُرا ٹھکانا ہے؟
۶۱۔ (اس کے بعد) وہ کہیں گے: پروردگارا! جس نے یہ عذاب ہمارے لیے فراہم کیا ہے، اس کے لیے آگ میں کئی گنا عذاب کا اضافہ فرما۔

"حمیم" گرم اور جلاڈالنے والے پانی کے معنی میں ہے جو دوزخیوں کے مشروبات میں سے ایک ہے۔ یہ کئی قسم کی شرابِ طہور کے مقابلے میں ہے جو گزشتہ آیات میں بہشتیوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔

"غساق" "غسق" (بروزن "رمق") کے مادہ سے، رات کی تاریکی کی شدت کے معنی میں ہے۔ ابن عباس نے اسے ایک بہت ہی سرد مشروب سے (جو ٹھنڈک کی شدت سے انسان کے اندر کو جلا کر زخمی کر دے گا) تفسیر کی ہے۔ لیکن اس لفظ کے مفہوم کی اصل بنیاد میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو اس معنی پر دلالت کرے، سوائے اس کے کہ اس کا مقابلہ "حمیم" سے کیا جائے جو گرم اور جلانے والا پانی ہے۔ ممکن ہے یہی امر اس قسم کے استنباط کا سبب بنا ہو۔

راغب نے مفردات میں اس کی ان قطرات اور پیپ سے تفسیر کی ہے جو دوزخیوں کی جلد سے (اور ان کے بدن کے زخموں سے) باہر آئیں گے۔

ضروری طور پر اس کا سیاہ رنگ ہونا، اس لفظ کے اس پر اطلاق ہونے کا سبب بنا ہے۔ چونکہ اس جلاڈالنے والی آگ کا نتیجہ ایک مٹھی بھر جلے ہوئے بدن سے سیاہ راکھ کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

بہر حال کچھ کلمات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "غساق" کی بو اتنی بری اور تکلیف دہ ہوگی کہ سب کو پریشان کر دے گی۔

بعض دوسرے مفسرین نے اسے عذاب کی ایک ایسی قسم قرار دیا ہے جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کیونکہ وہ ایسے گناہوں اور سخت مظالم کے مرتکب ہوئے ہیں جن سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں تھا لہٰذا ان کی سزا بھی ایسی ہی ہونی چاہیئے۔

جیسا کہ پرہیزگار جنتی ایسے نیک اعمال بجالاتے تھے جنھیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا اس لیے ان سے ایسی جزاء کا وعدہ کیا گیا جس سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں۔

فلاتعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین

(الم - سجدہ ——— ۱۷)

پھر ان کے دوسری قسم کے دردناک عذابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اور ان کے علاوہ انھی کی ہم شکل دوسری سزائیں بھی ان کے لیے ہیں (وآخر من شکله ازواج)[1]

"شکل" (شین کی فتح کے ساتھ) مثل و مانند کے معنی میں ہے اور "ازواج" "انواع و اقسام" کے معنی میں ہے اور یہ گزشتہ عذابوں کے مانند

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "هٰذا" مبتدائے محذوف کی خبر ہے جیسا کہ "حمیم وغساق" بھی اسی طرح ہیں اور تقدیر میں اس طرح تھا "العذاب هذا فلیذوقوه، هٰذا حمیم وغساق" لیکن پہلا احتمال زیادہ بہتر ہے۔

[1] " " ایک محذوف موصوف کی صفت ہے، جو مبتدا ہے اور "ازواج" دوسرا مبتدا ہے، اور "من شکله" اس کی خبر ہے، اور مجموعی طور پر پہلے مبتدا کا جزء ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا۔

"وعذاب أخر ازواج من شکله"

دوسری قسم کے عذابوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے جو یہاں پر سربستہ طور پر بیان ہوئے ہیں اور شاید اس جہانِ مادہ کے اسیروں کے لیے قابلِ توصیف وادراک نہ ہوں۔

یہ حقیقت میں گزشتہ آیات میں ذکر شدہ "فاکھۃ کثیرۃ" کے مقابلے میں ہیں، جو جنت کی مختلف قسم کی نعمتوں اور پھلوں کی طرف اشارہ تھا۔

بہرحال ممکن ہے یہ مشابہت شدت اور ناراحتی کے اعتبار سے ہو یا تمام جہات کے لحاظ سے ہو۔

اس کے بعد ان کی آخری سزا بیان کی گئی ہے اور وہ ہے بُرے ہم نشین اور یہ بھی ایک طرح کی سرزنش ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس وقت گمراہ سردار دوزخ میں جہنم ہوں گے اور اپنی آنکھ سے دیکھیں گے کہ ان کے پیروکاروں کو بھی دوزخ کی طرف لایا جارہا ہے تو ایک دوسرے سے کہیں گے: یہ وہ فوج ہے جو تمھارے ساتھ دوزخ میں داخل ہوگی (ھٰذا فوج مقتحم معکم)۔[1]

ان کے لیے خوش آمدید نہیں ہے (لا مرحبًا بھم)۔

وہ سب کے سب آگ میں جلیں گے (انھم صالوا النار)۔

بعد کے جملوں اور آیات کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے "ھٰذا فوج مقتحم معکم" کا جملہ گمراہی کے پیشواؤں کی گفتگو ہے، جس وقت وہ اپنے پیروکاروں کو جہنم میں داخل ہونے کے لیے تیار دیکھیں گے تو ایک دوسرے سے کہیں گے کہ یہ بھی تمھارے ساتھ ہوں گے۔ بعض مفسرین اسے کفر وعصیان کے سرداروں سے ملائکہ کا خطاب سمجھتے ہیں لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

"مرحبًا" وہ لفظ ہے جو مہمان کو خوش آمدید کہتے وقت کہا جاتا ہے اور "لا مرحبًا" اس کی ضد ہے۔ یہ لفظ مصدر ہے "رحب" (بروزن "محو") کے مادہ سے وسعت مکان کے معنی میں۔ یعنی آئیے، تشریف لائیے، آپ ایک مناسب اور وسیع مکان میں وارد ہو رہے ہیں اور فارسی میں اس کا متبادل خوش آمدید ہے۔

"مقتحم" "اقتحام" کے مادہ سے شدید اور سخت خوفناک کام میں داخل ہونے کے معنی میں ہے اور اکثر پہلے سے غور وفکر اور مطالعہ کیے بغیر کاموں میں وارد ہونے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ تعبیر اس کام کی نشاندہی کرتی ہے کہ گمراہی کے پیروکار مطالعہ اور غور وفکر کے بغیر صرف ہوا وہوس اور اندھی تقلید کی بنا پر جہنم کی شدید اور خوفناک آگ میں داخل ہوں گے۔

بہرحال یہ آواز پیروکاروں کے کانوں تک پہنچے گی اور وہ سردارانِ ضلالت کے ناخوش آمدید کہنے سے سخت ناراض ہوں گے۔ ان کی طرف رخ کرکے وہ کہیں گے: بلکہ تمھارے لیے مرحبا ہو کیونکہ تمھی نے ہمارے لیے اس دردناک عذاب کی راہ ہموار کی تھی اور ہمارے لیے اسے فراہم کیا تھا کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے جہنم (قالوا بل انتم لا مرحبًا بکم انتم قدمتموہ لنا فبئس القرار)۔

---

[1] اس جملہ میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (یقولہ ووساء الضلال بعضھم لبعض ھٰذا فوج مقتحم معکم) گمراہوں کے سردار ایک دوسرے سے کہیں گے یہ فوج بھی تمھارے ساتھ داخل ہونے والی ہے۔

"فبئس القرار" حقیقت میں "جنات عدن" کا لفظ مقابل ہے، جو پرہیزگاروں کے لیے آیا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ دوزخ ایک عارضی اور وقتی جگہ نہیں ہے بلکہ دائمی اور ثابت ٹھکانا ہے۔

اس تعبیر سے پیروکاروں کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں یہ خوبی تو ہے کہ تم سردارانِ ضلالت بھی اس امر میں ہمارے ساتھ شریک ہو اور یہ چیز ہماری دلی تسلی کا باعث ہے یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم پیشواؤں کا جرم ہمارے نزدیک بہت ہی عظیم ہے کیونکہ جہنم کوئی وقتی ٹھکانا نہیں ہے بلکہ ہمارا دائمی ٹھکانا ہے۔

لیکن اس کے باوجود پیروکار صرف اسی بات پر راضی نہیں ہوں گے چونکہ وہ گمراہی کے سرداروں کو جو اس جرم کے اصلی عامل تھے اپنے سے زیادہ مستحق جانتے ہیں لہذا بارگاہِ خداوندی کی طرف رُخ کرکے "کہیں گے: پروردگارا! جس شخص نے ہمارے لیے یہ عذاب فراہم کیا ہے جہنم کی آگ میں اس کے لیے کئی گنا اضافہ فرما" (قالوا ربنا من قدّم لنا ھذا فزدہ عذابًا ضعفًا فی النار)۔

ایک عذاب خود ان کی اپنی گمراہی کی بنا پر اور ایک عذاب ہمیں گمراہ کرنے کی وجہ سے۔

یہ آیت اسی مطلب کے مشابہ ہے جو سورۂ اعراف کی آیہ ۳۸ میں آیا ہے:

ربنا ھٰؤلاء اضلونا فاٰتھم عذابًا ضعفًا من النار

پروردگارا! انھوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے لہذا آگ کا کئی گنا عذاب ان کے لیے قرار دے۔

اگرچہ سورۂ اعراف کی اس آیت کا آخری حصہ یہ بتاتا ہے کہ دونوں کے لیے کئی گنا عذاب ہے (کیونکہ پیروکار بھی تو پیشواؤں کے لیے اجرائی قوت تھے اور گمراہی و فساد کی راہ انھیں کے ذریعے ہموار ہوئی کیونکہ اگر عوام الناس ظالموں کے ظلم کی بھٹی گرم نہ کریں تو ان میں کسی کام کو انجام دینے کی ہمت نہیں ہوتی) لیکن بہرحال اس میں شک نہیں ہے کہ پیشواؤں کا عذاب کئی درجے زیادہ سخت ہے اگرچہ دونوں کا عذاب دگنا ہے۔

ہاں یہ ہے انجام ان لوگوں کا، جنھوں نے آپس میں دوستی کا عہد و پیمان باندھا اور راہِ انحراف و ضلالت میں بیعت کی، جس وقت وہ اپنے اعمال کے بُرے نتائج دیکھیں گے تو ایک دوسرے کے خلاف دشمنی اور نفرین کا اظہار کریں گے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان آیات میں پرہیزگاروں کی نعمتوں کا ذکر طغیان گروں کی سزاؤں اور عذابوں سے زیادہ تنوع رکھتا ہے (پہلے حصے میں سات نعمتوں اور دوسرے حصے میں پانچ عذابوں کی طرف اشارہ ہوا ہے) اور یہ شاید خدا کی رحمت کے اس کے غضب پر سبقت کرنے اور زیادہ ہونے کی بنا پر ہے۔

یا من سبقت رحمتہ غضبہ

اے وہ کہ جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

۶۲۔ وَقَالُوْا مَالَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ؕ ○
۶۳۔ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ○
۶۴۔ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ○

ترجمہ

۶۲۔ وہ کہیں گے: ہم ان لوگوں کو جنھیں ہم اشرار میں شمار کرتے تھے (یہاں جہنم کی آگ میں) کیوں نہیں دیکھتے؟
۶۳۔ کیا ہم نے ان کے ساتھ تمسخر کیا تھا یا (وہ اس قدر حقیر تھے کہ) آنکھیں انھیں دیکھتی ہی نہیں؟
۶۴۔ بے شک یہ بات حق اور ایک واقعیت ہے کہ دوزخی مخاصمانہ باتیں کریں گے۔

تفسیر

اصحابِ دوزخ کی دشمنی

یہ آیات دوزخیوں کی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے ان کی ایک گفتگو بیان کرتی ہیں جس سے ان کے گہرے اور جانکاہ تأسف اور ایک روحانی وجان فرسا حالت کی ترجمانی ہوتی ہے۔

قرآن کہتا ہے: ضلالت کے سردار جب دوزخ میں اپنے اطراف میں دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ہم ان لوگوں کو جنھیں ہم اشرار میں شمار کرتے تھے یہاں کیوں نہیں دیکھتے (وقالوا مالنا لا نرٰی رجالًا کنّا نعدھم من الاشرار)۔

ہاں! ابوجہل اور ابولہب جیسے افراد جب یہ دیکھیں گے کہ دوزخ میں عمار یاسر، خباب، صہیب اور بلال جیسے افراد کا کوئی نام ونشان نہیں ہے، تو وہ اپنے دل میں سوچیں گے اور ایک دوسرے سے سوال کریں گے کہ یہ لوگ کہاں چلے گئے؟

ہم تو ان لوگوں کو خلل ڈالنے والے، زمین میں فساد کرنے والے، اشرار واوباش سمجھتے تھے جو معاشرے کے آرام وسکون کو تباہ وبرباد کرنے اور ہمارے بزرگوں کے افتخارات کو ختم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہماری راہ ہی بالکل غلط تھی۔

کیا ہم نے ان کا مذاق اڑایا تھا یا وہ اس قدر حقیر تھے کہ ہماری آنکھیں انھیں نہیں دیکھتیں (اتخذناھم سخریًّا ام زاغت عنھم الابصار)۔[1]

---

[1] قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "زاغت" جو "زیغ" کے مادہ سے ہے اور حق وصداقت سے انحراف کے معنی میں آتا ہے یہاں اس کی آنکھ کی طرف نسبت (عایشہ اگلے صفحہ پر)

ہاں! ہم ان عظیم المرتبہ انسانوں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے اور اشرار ہونے کا لیبل ان پر لگاتے تھے اور بعض اوقات تو ہم انھیں اس سے بھی پست تر سمجھتے تھے۔ انھیں ایسے حقیر اور ذلیل جانتے تھے جو بالکل آنکھوں میں جچتے ہی نہیں تھے لیکن اب معلوم ہوا کہ ہوا و ہوس اور جہالت و غرور نے ہماری آنکھ پر پردہ ڈال رکھا تھا، وہ تو مقربانِ بارگاہِ خدا تھے اور اس وقت بہشتِ بریں ان کا مسکن ہے۔

مفسّرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمسخر تو دنیا کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور "ام زاغت عنھم الابصار" کا جملہ دوزخ کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے یعنی یہاں ہماری نزدیک بین آنکھ اس دھوئیں اور آگ کے شعلوں کے درمیان انھیں نہیں دیکھ سکتی، البتہ پہلا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ حقائق کا ادراک نہ کرنے کے عوامل میں سے ایک مسائل کو سنجیدگی کے ساتھ نہ لینا اور حقائق کا مذاق اڑانا ہے۔ ہمیشہ سنجیدہ ارادے کے ساتھ مسائل کی تحقیق کرنا چاہیے تاکہ حقیقت واضح اور روشن ہوجائے۔

اس کے بعد دوزخیوں کے درمیان جو باتیں ہوں گی انھیں خلاصے کے طور پر اور جو کچھ گزر چکا ہے اس پر تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: بے شک یہ بات حق اور ایک حقیقت ہے کہ دوزخی مخاصمانہ گفتگو کریں گے (ان ذالك لحق تخاصم اھل النار)[1]

دوزخی اس جہان میں بھی دشمنی اور نزاع میں گرفتار ہیں اور پُرخاش، نزاع اور جدال کی روح ان پر حاکم ہے، اور ہر روز کسی نہ کسی سے دست و گریباں اور گلوگیر ہوتے رہتے ہیں، اور قیامت میں جو چھپی ہوئی چیزوں کے ظاہر ہوجانے کا دن ہے جو کچھ ان کے اندر ہوگا وہ ظاہر ہوجائے گا اور جہنم میں ایک دوسرے کی جان کے درپے ہوجائیں گے، کل کے دوست آج کے دشمن ہوجائیں گے اور کل کے مرید آج کے مخالف ہوجائیں گے، صرف ایمان و توحید کا راستہ اس جہان میں بھی اور اس جہان میں بھی وحدت و پاکیزگی کا راستہ ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ بہشتی تو تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے دوستانہ گفتگو میں مشغول ہوں گے ـــــ جیسا کہ قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوا ہے ـــــ جب کہ دوزخی جنگ و جدال میں مشغول ہوں گے جبکہ وہ تو خود ایک نعمت اور عظیم انعام ہے اور یہ ایک دردناک عذاب ہے۔

ایک نکتہ

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) دی گئی ہے، نہ کہ آنکھ والوں کی طرف اور یہ مطلب میں مبالغہ کے لیے ہے۔

[1] (حاشیہ صفحہ ھذا) "تخاصم اھل النار" ذالك "کا بیان ہے۔

"خدا نے تم مکتب اہلِ بیت کے پیروکاروں کو قرآن میں یاد کیا ہے جبکہ تمھارے دشمن جہنم کی آگ میں کہیں گے کہ ہم یہاں ان لوگوں کو جنھیں ہم اشرار میں شمار کرتے تھے کیوں نہیں دیکھتے؟ کیا ہم نے ان کا مذاق اڑایا تھا یا سخت حقارت کی وجہ سے ہماری آنکھ میں نہیں جچتے تھے؟ خدا کی قسم ان افراد سے مراد تم ہو جنھیں ایک گروہ اشرار سمجھتا ہے، لیکن خدا کی قسم! جنت میں تم شادمان اور مسرور ہو گے جبکہ دوزخی جہنم میں تمھارے خیال میں سرگرداں ہوں گے۔"[1]

---

[1] یہ روایت روضۂ کافی سے نورالثقلین جلد ۴ ص ۴۶۷ پر نقل کی گئی ہے۔

۶۵۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝
۶۶۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝
۶۷۔ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ۝
۶۸۔ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ۝
۶۹۔ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝
۷۰۔ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

ترجمہ

۶۵۔ کہہ دو میں تو صرف ایک ڈرانے والا ہوں اور خدائے یگانہ و قہار کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔
۶۶۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کا پروردگار عزیز و غفار ہے۔
۶۷۔ کہہ دو! یہ ایک بہت بڑی خبر ہے۔
۶۸۔ کہ جس سے تم روگردان ہو۔
۶۹۔ مجھے ملأ اعلیٰ (اور عالم بالا کے فرشتوں) کے بارے میں۔ جبکہ وہ (آدم کی خلقت کے بارے میں) جھگڑ رہے تھے کچھ خبر نہیں ہے۔
۷۰۔ مجھے تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ میں ایک واضح انذار کنندہ ہوں۔

تفسیر

میں ایک نذیر ہوں

چونکہ تمام گزشتہ بحث، چاہے ان میں دوزخیوں کے دردناک عذاب سے متعلق گفتگو تھی یا گزشتہ گنہگار اقوام کے دنیاوی عذاب سے متعلق بحث تھی، سب کی سب مشرکین، سرکشوں اور ظالموں کے لیے انذار و تہدید کا پہلو رکھتی تھی۔ زیر بحث آیات میں اسی مسئلے کو جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کہہ دے کہ میں تو صرف ایک انذار کنندہ (ڈرانے والا) ہوں۔ (قل انما انا منذر)۔

یہ ٹھیک ہے کہ پیغمبر بشارت دینے والا بھی ہوتا ہے اور قرآن مجید کی آیات دونوں معانی پر ناطق ہیں لیکن چونکہ بشارت تو مومنین کے لیے ہوتی ہے اور انذار مشرکین و مفسدین کے لیے اور یہاں روئے سخن دوسرے گروہ کی طرف ہے، لہٰذا صرف انذار کا ذکر ہوا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کوئی معبود خداوند یگانہ و قہار کے علاوہ نہیں ہے۔ (وما من الٰہ الّا اللہ الواحد القہار)۔

اس کے قہر کا ذکر بھی اسی بنا پر ہے تاکہ کوئی اس کے لطف و کرم سے مغرور نہ ہو جائے اور خود کو اس کے قہر سے مامون نہ سمجھے اور کفر و گناہ کے گرداب میں غوطہ زن نہ ہو جائے۔

اور بلافاصلہ پروردگار کی توحید الوہیت و عبادت کی دلیل کے طور پر مزید فرمایا گیا ہے: وہی تو ہے جو آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کا پروردگار ہے۔ وہی خدا جو عزیز و غفار ہے (رب السمٰوات والارض وما بینہما العزیز الغفار)۔

درحقیقت اس آیہ میں خدا کی صفات میں سے تین اوصاف کو بیان کیا گیا ہے، جن میں سے ہر ایک، ایک مقصد کو ثابت کرنے کے لیے ہے۔

پہلا مسئلہ تمام عالم ہستی کے لیے اس کی "ربوبیت" کا مسئلہ ہے، وہ اس سارے جہان کا مالک ہے۔ ایسا مالک جو ان کی تدبیر و تربیت کرتا ہے۔ ایسی ہستی ہی عبادت کے لائق ہے نہ کہ وہ بت جن کے پاس سوئی کی نوک کے برابر بھی اپنا کچھ نہیں۔

دوسرا مسئلہ اس کی "عزت" کا مسئلہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ "عزیز" لغوی معنی کے لحاظ سے اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جس پر کوئی غالب نہ آسکے اور جس چیز کا وہ ارادہ کرے وہ ہو جائے، دوسرے لفظوں میں وہ ہمیشہ غالب ہے اور کبھی بھی مغلوب نہیں ہوتا۔

جو ایسا ہو اس کی قدرت کے پنجے سے نکل بھاگنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اور اس کے عذاب سے کیسے نجات مل سکتی ہے؟

تیسری صفت مقام "غفاریت" اور اس کی بکثرت بخشش ہے جو بازگشت اور اس کی طرف لوٹنے کے دروازے گنہگاروں کے سامنے کھولے رکھتا ہے اور اپنی رحمت کی بارش ان پر برساتا رہتا ہے تاکہ وہ یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ اگر وہ قہار و عزیز ہے تو پھر اس کا مفہوم بندوں کے سامنے رحمت و توبہ کے دروازے بند کرنا ہے۔

حقیقت میں ایک صفت بیانِ خوف ہے اور دوسری صفت بیان رجاء ہے کیونکہ ان دونوں حالتوں کے موازنے کے بغیر انسان کا ارتقاء و تکامل ممکن نہیں۔ یا انسان غرور و غفلت میں گرفتار ہو جاتا ہے یا ناامیدی کے گرداب میں غرق ہو جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس کی عزیز و غفار کے ساتھ توصیف اس کی الوہیت کی ایک اور دلیل ہے کیونکہ صرف وہی ہستی پرستش و عبادت کے لائق ہے جو ربوبیت کے علاوہ سزا دینے پر بھی قدرت رکھتا ہو اور سزا دینے پر قدرت کے علاوہ اس کی رحمت و مغفرت کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہوں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہے اور ایک مختصر مگر ہلا دینے والے انداز میں فرمایا گیا ہے: کہہ دے کہ یہ ایک بہت بڑی

خبر ہے۔ (قل ھو نبؤا عظیم)۔

کہ جس سے تم منہ پھیرے ہوئے ہو (انتم عنہ معرضون)۔

یہ کون سی خبر ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اسے عظیم قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید؟ پیغمبر کی رسالت؟ قیامت اور مومنین و کفار کا انجام؟ توحید و یگانگیٔ خدا؟ یا یہ سب کی سب؟

چونکہ قرآن ان سب امور پر مشتمل ہے اور ان سب کا جامع ہے اور مشرکین کی روگردانی بھی اسی سے تھی، اس لیے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی یعنی قرآن ہے۔

ہاں یہ عظیم آسمانی کتاب ایک بڑی خبر ہے جو تمام عالم ہستی جتنی عظمت رکھتی ہے، کیونکہ یہ اس جہان کے خالق، خالق عزیز و غفار اور واحد و قہار کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ وہ خبر جس کی عظمت کو ایک بہت بڑے گروہ نے اس کے نزول کے وقت نہیں سمجھا، بعض نے اس کا مذاق اُڑایا اور بعض نے اسے جادو کہا اور ایک گروہ نے اسے شاعری قرار دیا۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزری کہ اس "نبأ عظیم" نے اپنے باطن کو ظاہر کیا اور تاریخِ بشریت کی راہ کو بدل کر رکھ دیا۔ وسیع عالم ہستی پر اپنا سایہ فگن ہو گئی اور اس نے اپنے عظیم اور درخشاں تمدن کو ہر ہر میدان میں پھیلا دیا۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس "نبأ عظیم" کا اعلان اس مکی سورہ میں ہوا ہے، ایسے زمانے میں جبکہ مسلمان ظاہراً انتہائی ضعف و ناتوانی میں تھے اور کامیابی و نجات کے راستے ان کے سامنے بند تھے۔

یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں بھی یہ عظیم خبر دنیا والوں پر ـــــ بلکہ خود مسلمانوں پر بھی ـــــ کامل طور پر واضح نہیں ہے، اور مستقبل ہی اس کی نشاندہی کرے گا۔

قرآن کی یہ گفتگو کہ "تم اس سے منہ پھیرے ہوئے ہو" ابھی تک صادق اور سچی ہے اور مسلمانوں کا یہی اعراض اس بات کا سبب بنا ہے کہ فیض الٰہی کے اس جوش مارنے والے چشمے سے پورے طور پر سیراب نہیں ہو سکے اور صحیح طور پر اس کے انوار کے پرتو میں آگے نہیں بڑھ سکے اور فخر و شرف کی چوٹیوں کو سر نہیں کر سکے۔

اس کے بعد حضرت آدمؑ کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں انسان کے مرتبے کی اس حد تک بلندی کا ذکر ہے کہ فرشتوں نے اس کے سامنے سجدہ کیا ـــــ تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے: مجھے ملأ اعلیٰ اور عالم بالا کے فرشتوں کے بارے میں کچھ خبر نہیں (جب کہ وہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے) (ما کان لی من علم بالملأ الاعلی اذ یختصمون)۔

میری آگاہی صرف وحی کے ذریعے سے ہے اور مجھے تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ میں ایک واضح انذار کنندہ ہوں (ان یوحیٰ الیّ الّا انما انا نذیر مبین)۔

اگرچہ فرشتے پروردگار کے ساتھ کوئی جھگڑا اور نزاع نہیں کر رہے تھے، صرف اتنی سی بات تھی کہ جب خدا نے ان سے یہ کہا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانا چاہتا ہوں" تو انھوں نے باتیں شروع کر دیں اور عرض کیا: "کیا تو ایسے کو بنانا چاہتا ہے جو

فساد و خونریزی کرے گا؟ تو ان کے جواب میں فرمایا: "جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے" (بقرہ ـــــ ۳۰)۔ تو ان کی انھیں باتوں پر "مخاصمہ" کا اطلاق ہوا ہے، جو ایک مجازی اطلاق ہے اور جیسا کہ ہم نے اشارتاً بیان کیا ہے کہ یہ حقیقت میں بعد والی آیات کے لیے جو آدم کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں ایک مقدمہ اور تمہید ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "ملأ اعلیٰ" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں شیطان تک بھی شامل ہے، کیونکہ اس وقت شیطان بھی فرشتوں کے زمرے میں تھا اور خدا کے ساتھ مخاصمت کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا، اور اعتراض کرنے لگا اور اس بنا پر ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ خداوندی ہو گیا، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

متعدد روایات میں جو شیعہ اور اہلِ سنت کے ذرائع سے نقل ہوئی ہیں، یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے اصحاب میں سے ایک سے پوچھا:۔

اتدری فیما یختصم الملأ الاعلیٰ؟

کیا تو جانتا ہے کہ عالمِ بالا کے فرشتے کس چیز کے بارے میں بحث و گفتگو کرتے ہیں؟

اس نے عرض کیا: نہیں۔

تو آپؐ نے فرمایا:

اختصموا فی الکفارات والدرجات، فاما الکفارات فاسباغ الوضوء فی السبرات، و نقل الاقدام الی الجماعات، و انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ. و اما الدرجات فافشاء السلام، و اطعام الطعام، والصلوٰۃ فی اللیل والناس نیام

وہ کفارات (وہ کام جو گناہوں کی تلافی کرتے ہیں) اور درجات (وہ چیزیں جو انسان کے درجات میں اضافے کا باعث بنتی ہیں) کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ رہے کفارات تو وہ موسم سرما کی سردی میں بھرے پانی کے ساتھ وضو کرنا اور نماز با جماعت کے لیے قدم بڑھانا، اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے اور "درجات" بہت زیادہ سلام کرنا، دوسروں کو کھانا کھلانا اور رات کو اس وقت نماز پڑھنا جبکہ لوگ سو رہے ہوں[1]

لیکن اس حدیث میں صراحت کے ساتھ یہ بیان نہیں ہوا ہے کہ یہ زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں وارد ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کی تعبیرات زیرِ بحث آیت کی تعبیروں کی طرح ہیں۔ بہرحال اس حدیث سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "مخاصمہ" سے مراد صرف گفتگو ہے نہ کہ جدال و کشمکش۔ گفتگو آدمیوں کے اعمال کے بارے میں ہے اور ان کاموں کے بارے میں جو گناہوں کا

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔ یہی حدیث تفسیر درالمنثور میں کئی ایک حوالوں سے متعدد اصحابِ رسولؐ سے کچھ اختلاف کے ساتھ منقول ہوئی ہے۔

کفارہ بنتے ہیں اور انسان کے درجات میں اضافہ کرتے ہیں۔ شاید ان کی گفتگو ان اعمال کی تعداد کے بارے میں ہے جو ان فضائل کا سرچشمہ بنتے ہیں یا ان درجات کی حد اور معیار کا تعین کرتے ہیں جو ان اعمال سے حاصل ہوتے ہیں اور اس طرح سے آیت کی ایک تیسری تفسیر سامنے آتی ہے جو کئی لحاظ سے مناسب ہے لیکن یہ آیندہ والی آیات کے ساتھ کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ ممکن ہے یہ حدیث فرشتوں کی کسی دوسری گفتگو کے بارے میں ہو نہ کہ اس گفتگو کے بارے میں جو ان آیات کے ساتھ مربوط ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا عدم علم اس معنی میں ہے کہ میں اس سلسلے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں جانتا، صرف وہی کچھ جانتا ہوں جو وحی کے ذریعے مجھ پر نازل ہوتا ہے۔

۷۱۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ○
۷۲۔ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ○
۷۳۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ○
۷۴۔ اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ○
۷۵۔ قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ ○
۷۶۔ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ○
۷۷۔ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ ۚ○
۷۸۔ وَّ اِنَّ عَلَیْكَ لَعْنَتِیْٓ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ○
۷۹۔ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ○
۸۰۔ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۙ○
۸۱۔ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ○
۸۲۔ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۙ○
۸۳۔ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ○

ترجمہ

۷۱۔ اس وقت کو یاد کر جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں گیلی مٹی سے ایک بشر پیدا کروں گا۔

۷۲۔ جس وقت میں اسے درست اور منظم کرلوں اور اپنی روح میں سے اس میں پھونک دوں تو تم سب کے سب اس کے لیے سجدہ کرنا۔

۷۳۔ پس اس وقت تمام فرشتوں نے تو سجدہ کیا۔

۷۴۔ مگر ابلیس نے (سجدہ نہ کیا اس نے) تکبّر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

۷۵۔ کہا اے ابلیس! تجھے کس نے اس مخلوق کو سجدہ کرنے سے روکا، جسے میں نے اپنی قدرت سے خلق کیا ہے؟ کیا تو نے تکبّر کیا ہے یا تو عالین میں سے تھا؟ (اس سے بالاتر کہ تجھے سجدے کا حکم دیا جائے)

۷۶۔ اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے گیلی مٹی سے۔

۷۷۔ فرمایا: آسمانوں (اور ملائکہ کی صفوں) سے نکل جا تو میرا راندۂ درگاہ ہے۔

۷۸۔ اور یقیناً تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت ہوگی۔

۷۹۔ کہنے لگا: میرے پروردگار! مجھے اس دن تک کی مہلت دے دے، جس دن انسان قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

۸۰۔ فرمایا: تجھے مہلت دے دی گئی ہے۔

۸۱۔ لیکن ایک معیّن دن تک کے لیے۔

۸۲۔ اس نے کہا: تیری عزّت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔

۸۳۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں سے تیرے مخلص ہوں گے۔

تفسیر

تکبّر کیا اور راندۂ درگاہ ہوگیا

یہ آیات جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ملأ اعلیٰ کے بارے میں اور ابلیس کی گفتگو سے متعلق ہے۔ اور مجموعی طور پر اس واقعے کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پہلے تو انسانوں کو یاد دلایا جائے کہ ان کا وجود کتنا قیمتی ہے کہ تمام فرشتے ان کے جدِّ امجد آدم کے لیے سجدہ میں گر پڑے۔ ایسی بڑی حیثیت کا مالک انسان کس طرح شیطان اور ہوائے نفس کے چنگل میں اسیر ہوجاتا ہے؟ کس طرح اپنی قدر و قیمت کو نظر انداز کرکے پتھر اور لکڑی کے سامنے سجدہ کرنے لگتا ہے؟

اصولی طور پر تربیت کے مؤثر طریقوں میں سے ایک، زیرِ تربیت افراد کو ان کی عظمت کا احساس دلانا ہے یا زیادہ صحیح لفظوں میں اس طرح سے ان کی بلند حیثیت اور ان کے وجود کی قدر و قیمت انھیں یاد دلانا کہ انسان خود بخود محسوس کرنے لگے کہ انحطاط اور پستی اس کی شان کے لائق نہیں اور خود بخود ان سے کنارہ کشی کر لے۔

ثانیاً شیطان کی ہٹ دھرمی اور اس کا تکبر اور حسد سب ہٹ دھرم اور مغرور افراد کے لیے ایک تنبیہ اور عبرت ہے کیونکہ یہی اس بات کا سبب بن گیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے افتخار کی بلندی سے نیچے گر جائے اور لعنت کی گندگی میں جا گرے۔

ثالثاً ایک ایسے بڑے دشمن کی خبر دی گئی ہے جس نے تمام انسانوں کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی ہے تاکہ سب ہوش میں رہیں اور اس کے دامِ فریب میں نہ پھنسیں۔

یہ امور مجموعی طور پر گزشتہ بحث کا تسلسل ہیں۔

بہرحال زیرِ بحث پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کر جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں گیلی مٹی سے ایک بشر پیدا کروں گا۔ (اذ قال ربك للملٰئكة انی خالق بشرا من طین)۔

لیکن اس بنا پر کہ یہ تصور نہ ہو کہ انسانی وجود کا صرف وہی خاکی پہلو ہے۔ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جس وقت میں اسے منظم کروں اور درست بنا لوں اور اپنی روح میں سے (باشرف اور ممتاز روح جسے میں نے خلق کیا ہے) اس میں پھونک دوں تو تم سب کے سب اس کے لیے سجدہ میں گر پڑنا (فاذا سوّیته و نفخت فیه من روحی فقعوا له ساجدین)۔

اس طرح سے انسان کی خلقت مکمل ہو گئی اور خدا کی خاص روح اور سیاہ گیلی مٹی آپس میں مل گئے اور ایک عجیب و غریب بالکل نیا وجود جس کی بلندی و پستی دونوں بے انتہا ہیں پیدا ہو گیا اور ایک انتہائی زیادہ استعداد رکھنے والا وجود جو "خلیفۃ اللہ" ہونے کے لائق ہو عرصہ وجود میں وارد ہوا۔" اور اس وقت بغیر کسی استثناء کے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا" (فسجد الملٰئكة كلهم اجمعون)۔

اور اس خالق کو حمد و ستائش کے لائق جانا۔ ؎

کار دچنیں دل آویز نقشی زماء و طینی

جس نے اس قسم کا دل آویز نقش پانی اور مٹی سے بنایا ہے

لیکن "صرف ایک جس نے سجدہ نہیں کیا ابلیس تھا، اس نے تکبر کیا اور سرکشی کی اور اسی بنا پر اپنے باعظمت مقام سے نیچے گر گیا اور وہ کافروں میں سے تھا (الا ابلیس استكبر و كان من الكافرین)۔

ہاں! انسان کے لیے بدترین بلائے جان بھی یہی کبر و غرور ہے جو جہالت کے تاریک پردے اس کی چشمِ بینا پر ڈال دیتا ہے اور اسے حقائق کے ادراک سے محروم کر دیتا ہے، اسے سرکشی پر ابھارتا ہے اور مومنین کی صف سے نکال دیتا ہے کہ جو خدا کے مطیع بندوں کی صف ہے اور اسے کافروں کی صف میں پہنچا دیتا ہے کہ جو باغیوں اور سرکشوں کی صف ہے جیسا کہ ابلیس کے ساتھ ہوا۔ اس موقع پر

خدا نے ابلیس سے مؤاخذہ کیا اور باز پرس کی۔ " فرمایا اے ابلیس! اس مخلوق کو سجدہ کرنے سے تمھیں کس نے روکا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا تھا (قال یا ابلیس ما منعك ان تسجد لما خلقت بیدی)۔

یہ بات ظاہر ہے کہ " یدی " (دونوں ہاتھ) کی تعبیر حسّی ہاتھوں کے معنوں میں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہر قسم کے جسم وجسمانیت سے پاک ومنزّہ ہے، بلکہ یہاں پر ہاتھ قدرت کے معنی کے لیے کنایہ ہے کیونکہ عام طور پر انسان اپنی طاقت کو ہاتھ سے عمل میں لاتا ہے۔ اس لیے روزمرّہ کی گفتگو میں یہ لفظ قدرت کے معنی میں فراوانی سے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک فلاں گروہ کے ہاتھ میں ہے، یا فلاں عبادت خانہ یا عمارت فلاں شخص کے ہاتھ سے بنی ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ میرا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچتا یا تیرا ہاتھ پُر ہے تو ان میں کہیں بھی لفظ ہاتھ مخصوص عضو کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ سب کے سب قدرت وتسلّط کے مفہوم کے لیے کنایہ ہیں۔

چونکہ انسان اہم کاموں کو دونوں ہاتھوں سے انجام دیتا ہے اور دونوں ہاتھوں کو کام میں لگانا انسان کی کسی چیز کے لیے انتہائی توجہ اور لگاؤ کی نشانی ہے، لہٰذا زیرِ بحث آیت میں اس تعبیر کا بیان، انسان کی خلقت میں پروردگار کی خصوصی عنایت اور اس کی قدرتِ مطلقہ کو عمل میں لانے کے لیے کنایہ ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: کیا تو نے تکبّر کیا، یا تو اس سے بالاتر تھا کہ تجھے سجدے کا حکم دیا جائے (استکبرت ام کنت من العالین)۔

بلاشک وشبہ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کی قدر ومنزلت اس سے بالاتر ہے کہ وہ خدا کے لیے سجدہ کرے (یا خدا کے حکم سے آدم کے لیے سجدہ کرے) اس بنا پر آخری راہ جو باقی رہ جاتی ہے وہی دوسرا احتمال یعنی تکبّر ہے۔

بعض مفسّرین " عالین " کو یہاں ایسے افراد کے معنی میں سمجھتے ہیں جو ہمیشہ کبر وغرور میں رہیں۔ اس بنا پر اس جملے کا معنی یہ ہوگا: کیا تو نے اب اس وقت ہی تکبر کیا ہے یا تو ہمیشہ سے ہی ایسا تھا؟

لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

البتہ انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ابلیس نے دوسری شق کو انتخاب کیا اور وہ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ اس سے برتر ہے کہ اسے اس قسم کا حکم دیا جائے، لہٰذا انتہائی جسارت کے ساتھ فرمانِ خدا کی مخالفت کرنے کے لیے دلیلیں دینے لگا اور کہا: میں اس (آدم) سے بہتر ہوں، کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو گیلی مٹی سے (قال انا خیر منه خلقتنی من نار و خلقته من طین)۔

وہ حقیقت میں اپنے خیال کے مطابق تین حوالوں سے فرمانِ خدا کی نفی کرنا چاہتا تھا۔

پہلا یہ کہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور وہ مٹی سے جو ایک حقیقت بھی تھی، جیسا کہ قرآنِ مجید نے خود کہا ہے۔

خلق الانسان من صلصال کالفخار وخلق الجانّ من مارج من نار

خدا نے انسان کو خشک شدہ (کھنکتی) مٹی سے پیدا کیا جو اینٹ یا پیالے کی مانند تھی اور جنّوں کو (جن میں سے ابلیس بھی تھا) آگ کے شعلے سے خلق کیا۔

(الرحمٰن ——— ۱۴، ۱۵)

دوسرا یہ کہ جو آگ سے پیدا کیا گیا ہے وہ اس سے برتر و افضل ہے جسے مٹی سے پیدا کیا گیا ہے ۔ کیونکہ آگ مٹی سے افضل و برتر ہے ۔

تیسرا یہ کہ اشرف و افضل موجود کو ہرگز یہ حکم نہیں دینا چاہیے کہ وہ غیر اشرف کے سامنے سجدہ کرے ۔

ابلیس کا سارا اشتباہ اور غلطی ان دو آخری پہلوؤں میں تھی ۔

کیونکہ اول تو آدم صرف مٹی سے پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی عظمت اس روحِ الٰہی کی وجہ سے تھی جو ان میں پھونکی گئی تھی ۔ ورنہ مٹی کہاں اور یہ سارے افتخار ، استعداد اور تکامل کہاں ؟

دوسرے مٹی نہ صرف یہ کہ آگ سے کمتر نہیں ہے بلکہ اس سے کئی درجے برتر ہے ، کیونکہ ساری زندگی اور منابع حیاتی مٹی سے ہی پیدا ہوتے ہیں ۔ تمام نباتات ، پھول ، پھل اور تمام زندہ موجودات مٹی سے ہی وجود پاتے ہیں ۔ تمام گراں بہا معدنیات مٹی کے اندر چھپی ہوئی ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ مٹی انواع و اقسام کی برکات کا منبع ہے ۔ جبکہ آگ اپنی پوری اہمیت کے باوجود جو اسے زندگی میں حاصل ہے ہرگز اس کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتی ، اور وہ صرف مٹی کے منابع سے استفادہ کرنے کا ایک آلہ ہے اور وہ بھی خطرناک آلہ ، اور پھر آگ پیدا کرنے والے مواد بھی زیادہ تر زمین کی برکت سے وجود میں آتے ہیں (ایندھن ، کوئلہ ، تیل اور پٹرول وغیرہ) ۔

تیسرا مسئلہ اطاعتِ حکمِ الٰہی کا ہے ۔ سب کے سب اسی کی مخلوق اور بندے ہیں ، لہٰذا انھیں اس کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے ۔

بہرحال اگر ہم ابلیس کے استدلال کا تجزیہ و تحلیل کریں تو وہ ایک عجیب و غریب کفر اس کی بنیاد ہے ۔ وہ اپنی اس گفتگو سے چاہتا تھا کہ خدا کی حکمت کی بھی نفی کرے اور اس کے امر کو بھی (نعوذ باللہ) بے مآخذ و بے مدرک شمار کرے اور اس کا یہ اعتراض اس کی انتہائی جہالت کی دلیل ہے ، کیونکہ اگر وہ یہ کہتا کہ میری ہوائے نفس مانع ہوئی ہے یا کبر و غرور نے مجھے اجازت نہیں دی اور اسی طرح کا کوئی اور عذر تو اس نے صرف ایک گناہ کا اظہار کیا ہوتا ، لیکن اب جبکہ اس نے اپنے عصیان کی توجیہ کے لیے پروردگار کی حکمت اور اس کے علم کی نفی کی ، تو یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس نے کفر کے پست ترین مرحلے کی طرف سقوط کیا ۔

علاوہ ازیں مخلوق اپنے خالق کے مقابلے میں اپنی طرف سے کوئی استقلال نہیں رکھتی ، جو کچھ اس کے پاس ہے وہ سب اسی کی طرف سے ہے اور شیطان کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے لیے پروردگار کی حاکمیت کے مقابلے میں حاکمیت و استقلال کا قائل تھا ، اور یہ کفر کا ایک اور سرچشمہ ہے ۔

بہرحال شیطان کی گمراہی کا عامل خود پرستی ، غرور ، جہل اور حسد کا مرکب تھا ۔

یہ سب کی سب شیطانی صفات اکٹھی ہوگئیں اور اسے جو سالہا سال سے ملائکہ کا ہم نشیں بلکہ ان کا معلم تھا اس بلندی اور افتخار سے نیچے کھینچ لائیں اور یہ بری صفات جہاں کہیں بھی پیدا ہو جائیں ——— کس قدر خطرناک ہیں ؟

نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں علی علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ۔

اس نے ہزار ہا سال تک پروردگار کی عبادت کی تھی ، لیکن گھڑی بھر کا تکبر اس سب کو جہنم کی طرف

کھینچ کرلے گیا اور سب کچھ برباد کر دیا۔[1]

ہاں! ایک اہم اور عظیم عمارت کو تعمیر تو سال ہا سال میں کیا جاتا ہے لیکن اسے ایک طاقت ور بم کے ساتھ ایک ہی لمحہ میں تباہ کیا جاسکتا ہے۔

یہی موقع تھا جبکہ اس پلید وجود کو ملأ اعلیٰ اور عالمِ بالا کے فرشتوں کی صفوں سے نکال دیا جانا چاہیے تھا۔ لہٰذا خدا نے اسے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آسمانِ بریں سے فرشتوں کی صفوں سے نکل جا، کیونکہ تو میرا راندۂ درگاہ ہے (قال فاخرج منها فانك رجيم)۔

"فاخرج منها" میں ضمیر ممکن ہے صفوفِ ملائکہ یا عوالمِ بالا یا بہشت یا خدا کی رحمت کی طرف اشارہ ہو۔

ہاں اس نامحرم کو یہاں سے چلے جانا چاہیے، کیونکہ یہ اس جگہ کے لائق نہیں ہے۔ یہ تو پاکیزہ اور مقرب لوگوں کی جگہ ہے، یہ آلودہ سرکش اور تاریک دلوں کی جگہ نہیں ہے۔

"رجیم" "رجم" کے مادہ سے سنگسار کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ اس کا لازمہ طرد دینا (نکالنا، بھگانا اور دھتکارنا) ہے لہٰذا کبھی یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یقیناً میری لعنت قیامت کے دن تک تجھ پر پڑتی رہے گی اور تو ہمیشہ میری رحمت سے دور رہے گا (و ان عليك لعنتي الى يوم الدين)۔

اہم بات یہ ہے کہ جس وقت انسان اپنے اعمالِ بد کا بُرا نتیجہ دیکھے تو بیدار ہو جائے اور اس کی تلافی کی فکر کرے۔ لیکن اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز خطرناک نہیں ہے کہ وہ اس طرح سے غرور اور ہٹ دھرمی کے گھوڑے پر سوار رہے اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف چلتا ہی چلا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جبکہ اس کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ صراطِ مستقیم سے بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہی وہ بدبختی تھی جس نے

---

[1] امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

فاعتبروا بما كان من فعل الله بابليس اذا حبط عمله الطويل وجهده الجهيد و كان قد عبد الله ستة آلاف سنة ... عن كبر ساعة واحدة فمن ذا بعد ابليس يسلم على الله بمثل معصيته

خدا کے بندو! عبرت حاصل کرو اس سے جو خدا نے ابلیس کے بارے میں انجام دیا۔ کہ اس کے طولانی اعمال اور فراواں کوششوں کو ــــ جبکہ اس نے چھ ہزار سال تک عبادت کی تھی ــــ ایک گھڑی بھر کے تکبر سے برباد کر دیا تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص وہی ابلیس والا کام انجام دے اور خدا کے غضب سے امان میں رہے (نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲ - خطبہ قاصعہ)

ابلیس کا دامن پکڑ لیا۔

یہ وہ مقام تھا جہاں "حسد" کینہ میں بدل گیا، ایسا کینہ جو سخت اور جڑیں پیدا کر لینے والا تھا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

اس نے کہا: میرے پروردگار! مجھے قیامت کے دن تک جب انسان قبروں سے اٹھائے جائیں گے، مہلت دے (قال رب فانظرنی الی یوم یبعثون)۔

کیا ایسی مہلت جس میں، میں اپنے ماضی پر اشکِ حسرت وندامت بہاؤں؟ کیا ایسی مہلت جس میں میں اپنے قبیح اور برے گناہوں کی تلافی کروں؟ نہیں! نہیں! مجھے تو ایسی مہلت درکار ہے جس میں میں آدم کی اولاد سے انتقام لوں اور سب کو گمراہی کی طرف کھینچ کر لے جاؤں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کی گمراہی، گناہ کا ایک نیا بھاری بوجھ میرے دوش پر رکھ دے گی اور مجھے کفر وعصیان کے منجدھار میں زیادہ سے زیادہ نیچے لے جائے گی۔ ہائے افسوس! وہ کون سی مصیبت ہے جو ہٹ دھرمی، کبر وغرور اور حسد کے ہاتھوں لوگوں کے سروں پر وارد نہیں ہوتی؟

حقیقت میں وہ یہ چاہتا تھا کہ آخری حد تک ممکن وقت تک آدم کی اولاد کو گمراہ کرتا رہے اور چونکہ قیامت کا دن ذمہ داری کے ختم ہونے کا دن ہے اور اس کے بعد وسوسہ اور اغوا کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس درخواست کے ذریعے موت کو اپنے آپ سے دور کر دے اور قیامت تک زندہ رہے، اگرچہ ساری دنیا کے لوگ دنیا سے چل بسیں۔

یہاں مشیتِ الٰہی نے ان دلائل ووجوہ کی بنا پر۔ جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔ اقتضاء کیا کہ ابلیس کی یہ خواہش پوری ہو جائے۔ لیکن مطلق طور پر نہیں بلکہ مشروط صورت میں جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: فرمایا، تجھے مہلت دی گئی (قال فانك من المنظرین)۔

لیکن قیامت کے دن اور مخلوق کے مبعوث ہونے اور قبروں سے اٹھنے کے دن تک نہیں بلکہ "ایک معین دن اور زمانے تک کے لیے (الی یوم الوقت المعلوم)۔

اس بارے میں کہ "یوم الوقت المعلوم" کون سا دن ہے؟ مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔

بعض تو اسے اس جہان کا اختتام سمجھتے ہیں، کیونکہ اس دن تمام زندہ موجودات مر جائیں گے اور صرف خدا کی ذات پاک باقی رہ جائے گی۔ جیسا کہ سورۂ قصص کی آیہ ۸۸ میں بیان ہوا ہے۔

کل شیء ھالك الا وجھہ

اور اس طرح سے ابلیس کی خواہش کا ایک حصہ منظور کر لیا گیا۔

بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے لیکن یہ احتمال نہ تو زیرِ بحث آیات کے ظاہری مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہے کیونکہ ان کا لب ولہجہ بتاتا ہے کہ اس کی تمام خواہش کے ساتھ موافقت نہیں ہوئی اور نہ ہی قرآن کی دوسری آیات کے ساتھ جو اس جہان کے اختتام پر تمام زندوں کی موت کی خبر دیتی ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت ایسے زمانے کی طرف اشارہ ہو جسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے لہٰذا ایک روایت میں جو تفسیر برہان میں امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہے، آیا ہے کہ ابلیس نفخہ اول اور دوم کے درمیانی عرصے میں مر جائے گا۔[1]

یہ وہ منزل تھی جہاں ابلیس نے اپنے دل میں چھپی ہوئی بات کو ظاہر کر دیا اور عمرِ جاودانی کا تقاضا کرنے کے لیے اپنے اصلی مقصد کی نشاندہی کر دی اور کہا: تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کروں گا (قال فبعزتك لاغوينهم اجمعين)۔

"عزت" کی قسم، قدرت پر بھروسہ اور توانائی کے اظہار کے لیے ہے اور یہ پے در پے تاکیدیں (قسم، نون تاکید ثقیلہ اور اجمعین کا لفظ) اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ اپنے عزم و ارادہ میں انتہائی ثبات و استقامت رکھتا تھا اور رکھتا ہے اور آخری سانس تک وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔

لیکن وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ خدا کے خاص بندوں کا ایک گروہ اس کے اثر و نفوذ سے باہر رہے گا اور اس کے وسوسے میں نہیں آئے گا، لہٰذا مجبوراً انھیں اپنی اوپر والی گفتگو سے مستثنیٰ کرتے ہوئے کہتا ہے: "مگر ان میں سے جو تیرے مخلص بندے ہوں گے (الا عبادك منهم المخلصين)۔

وہی لوگ جو تیری معرفت و بندگی کی راہ میں اخلاص اور صدق و صفا سے قدم بڑھائیں گے، جنھیں تو نے بھی قبول کر لیا ہے، اور انھیں خالص کیا ہے اور انھیں اپنی حفاظت میں لے لیا ہے، صرف یہی گروہ ہے جن تک میں کوئی دسترس نہیں رکھتا۔ ورنہ باقی سب کو اپنے فریب کے جال میں پھنسا لوں گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ابلیس کا یہ اندازہ اور گمان درست نکلا اور ہر کوئی کسی نہ کسی طرح سے اس کے جال میں پھنس گیا۔ اور "مخلصین" کے علاوہ کوئی اس سے نہ بچا۔ جیسا کہ قرآن سورۂ سبا کی آیہ ۲۰ میں کہتا ہے:

ولقد صدق عليهم ابليس ظنه فاتبعوه الا فريقا من المؤمنين

ان کے بارے میں ابلیس کا گمان سچ نکلا اور مومنین کے ایک گروہ کے سوا سبھی نے اس کی پیروی کی۔

چند اہم نکات

۱۔ **شیطان کے وجود کا فلسفہ:** زیرِ بحث آیات کے سلسلے میں بہت سے مسائل سامنے آتے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں: شیطان کی خلقت کا مسئلہ۔ فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے کی دلیل۔ فرشتوں پر آدم کی برتری کی علت، اور یہ کہ شیطان کس قسم کے لوگوں پر تسلط جماتا ہے اور کبر و غرور اور خود پرستی کا نتیجہ، سیاہ گیلی مٹی اور روحِ الٰہی سے مراد اور تکاملِ نوع کے مقابلے میں

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۲۴۲

آدم کی پیدائش اور اس کی مستقل خلقت کا مسئلہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل۔ ان کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۳۴ کے ذیل میں، گیارہویں جلد میں سورۂ حجر کی آیہ ۲۶ کے ذیل میں اور چھٹی جلد سورۂ اعراف کی آیہ ۱۱ کے ذیل میں مفصل بحث کی ہے۔

جس چیز کی ہم یہاں نئے سرے سے یاد دہانی کروانا ضروری سمجھتے ہیں وہ اس سوال کے بارے میں ہے جو شیطان کی خلقت کے فلسفہ کے بارے میں کیا جاتا ہے۔

بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر انسان تکامل وارتقاء اور بندگیٔ خدا کے ذریعے سعادت ونیک بختی کے حصول کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو پھر شیطان کے وجود کی کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ کہ جو تکامل وارتقاء کے برخلاف ایک تباہ کن وجود ہے اور وہ بھی ایک ہوشیار، کینہ پرور، مکار، پُرفریب اور پختہ ارادے کا پکا۔

لیکن اگر ہم تھوڑا سا بھی غور وفکر کریں تو جان لیں گے کہ اس دشمن کا وجود بھی انسانوں کے تکامل وارتقاء کے لیے ایک کمک ہے۔

ہم دور نہ جائیں، ہمیشہ سخت دشمنوں کے مقابلے میں جمنے اور ڈٹے رہنے والی طاقتیں ہی جاندار ہوتی ہیں اور وہی اپنی ارتقائی منزلوں کو طے کرتی ہیں۔

تجربہ کار اور طاقت ور کمانڈر اور میدانِ جنگ کے سپاہی وہی ہوتے ہیں جو بڑی بڑی جنگوں میں سخت ترین دشمنوں کے ساتھ نبرد آزما رہے ہوں۔

تجربہ کار اور طاقت ور سیاست دان وہی ہوتے ہیں جو سخت سیاسی بحرانوں میں طاقتور دشمنوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کیے ہوئے ہوں۔

کشتی کے عظیم ہیرو اور بڑے پہلوان وہی ہوتے ہیں جنھوں نے سخت طاقتور حریفوں کے ساتھ زور آزمائی کی ہو۔

اس بنا پر یہ تعجب کی کون سی بات ہے کہ خدا کے عظیم بندے شیطان کے مقابلے میں مسلسل اور پے در پے جہاد کرتے رہنے سے روز بروز زیادہ قوی ہوتے چلے جائیں۔

موجودہ زمانہ کے ماہرین، مزاحمت کرنے والے جراثیموں کے وجود کے فلسفہ کے بارے میں کہتے ہیں: اگر وہ (جراثیم) نہ ہوتے تو انسان کے بدن کے خلیے سُست اور کاہل ہو جاتے اور احتمال ہے کہ انسانوں کے بدن کی نشوونما ۸۰ سنٹی میٹر سے زیادہ نہ ہوتی، سب کے سب بونے آدمیوں کی صورت میں ہوتے، اور اس طرح سے آج کے انسانوں نے مزاحمت کرنے والے جراثیموں کے ساتھ جسمانی مقابلے کی وجہ سے زیادہ طاقت اور نشوونما حاصل کی ہے۔

یہی (ارتقائی صورت) روحِ انسانی کی شیطان اور ہوائے نفس سے مقابلہ کرنے میں ہوتی ہے۔

لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ شیطان کی ذمہ داری ہے کہ وہ بندگانِ خدا کو گمراہ کرے۔ شیطان پہلے دن سے دوسرے موجودات کی طرح پاک وپاکیزہ خلقت رکھتا تھا۔ انحراف، انحطاط، بدبختی اور شیطنت خود اس کے ارادے اور خواہش سے اسے ملی۔ اس بنا پر خدا نے شیطان کو پہلے دن سے شیطان پیدا نہیں کیا۔ اس نے خود چاہا کہ وہ شیطان ہو، لیکن اس کے

باوجود اس کی شیطنت نہ صرف یہ کہ حق طلب بندوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی بلکہ ان کے لیے ترقی کا زینہ ہے۔
(غور کیجیے گا)

البتہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ خدا نے اس کی زندگی کو برقرار رکھنے کی درخواست کو قبول کیوں کیا اور فوراً ہی اسے نابود کیوں نہ کر دیا؟

اس کا جواب وہی ہے جو سطورِ بالا میں بیان کیا گیا ہے اور دوسرے لفظوں میں:

"عالمِ دنیا آزمائش اور امتحان کا میدان ہے (ایسی آزمائش جو انسانوں کی پرورش اور تکامل کا ذریعہ ہے) اور ہم جانتے ہیں کہ آزمائش سخت ترین دشمنوں، طوفانوں اور بحرانوں سے مقابلہ کیے بغیر ممکن نہیں"۔

البتہ اگر شیطان نہ بھی ہوتا تو بھی ہوائے نفس اور نفسانی وسوسے انسان کو آزمائش کی کٹھالی میں ڈالتے، لیکن شیطان کے ہونے سے آزمائش کا یہ تنور زیادہ گرم ہوگیا، کیونکہ شیطان ایک بیرونی عامل ہے اور ہوائے نفس عاملِ اندرونی ہے۔

۲۔ آتشِ غرور سب کچھ جلا دیتی ہے: ان غیر معمولی حساس مسائل میں سے جو امر ابلیس اور اس کے راندۂ درگاہِ خدا ہونے کے واقعے میں توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے، انسان کی تیرگی اور بدبختی میں خود خواہی اور غرور کے عامل کی تاثیر ہے۔ اس طرح سے کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انحراف کا اہم ترین اور خطرناک ترین عامل یہی ہے۔

یہی چیز تھی جو چھ ہزار سال کی عبادت کو ایک ہی لمحہ میں نابود کر گئی، اور یہی چیز تھی جس نے اس موجود کو جو آسمان کے عظیم فرشتوں کا ساتھی تھا بدبختی کے پست ترین گڑھے میں لا پھینکا اور اسے خدا کی ابدی لعنت کا مستحق بنا دیا۔

خود خواہی اور غرور انسان کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ حقیقت کے چہرے کو اس کے اصلی روپ میں دیکھے۔

خود خواہی سرچشمۂ حسد ہے، اور حسد کینہ پروری کا سرچشمہ ہے اور کینہ پروری خوں ریزی اور دوسرے جرائم کا سبب بنتی ہے۔ خود خواہی انسان کو خطائیں اور غلطیاں جاری رکھنے پر ابھارتی ہے اور جب پیدا ہو جائے تو بیدار کرنے والے عوامل کو بے کار کر دیتی ہے۔

خود خواہی اور ہٹ دھرمی انسان کے ہاتھ سے توبہ اور تلافی کی مہلت چھین لیتی ہے اور نجات کے دروازے اس کے لیے بند کر دیتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس قبیح اور مذموم صفت کے خطرناک ہونے کے سلسلہ میں جو کچھ بھی کہا جائے بہت کم ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے:

فعدو الله امام المتعصبين، وسلف المستكبرين، الذى وضع اساس العصبية، ونازع الله رداء الجبرية وادرع لباس التعزز، وخلع قناع التذلل، الا ترون كيف صغّره الله بتكبره، ووضعه بترفعه، فجعله فى الدنيا

مدحورًا واعدّله فی الاٰخرة سعیرًا

یہ (شیطان) دشمنِ خدا، تعصب کرنے والوں کا پیشوا اور مستکبرین کا سلف ہے۔ جس نے تعصب و تکبر اور خود خواہی کی بنیاد رکھی۔ اور خدا کے ساتھ اس کے مقامِ جبروتی کے خلاف نزاع کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے بڑا ہونے کا لباس اپنے بدن پر پہن لیا اور انکسار اور فروتنی کا لباس اتار دیا۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ خدا نے اسے اس کے تکبر کی وجہ سے کیسا ذلیل کیا؟ اور اس کی بلند پروازی کی بنا پر اسے پست و حقیر بنادیا؟ دنیا میں اسے راندۂ درگاہ بنادیا اور آخرت میں جلا ڈالنے والی آگ اس کے لیے تیار کردی۔

(نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲، خطبہ قاصعہ)

۸۴۔ قَالَ فَالْحَقُّ ۖ وَالْحَقَّ أَقُولُ ۝

۸۵۔ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ۝

۸۶۔ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ۝

۸۷۔ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ۝

۸۸۔ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۝

ترجمہ

۸۴۔ فرمایا: حق کی قسم! اور میں حق ہی کہتا ہوں۔

۸۵۔ میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھر دوں گا۔

۸۶۔ (اے پیغمبر!) کہہ دو: میں تم سے کوئی کسی قسم کا اجر طلب نہیں کرتا اور میں متکلفین میں سے نہیں ہوں۔

۸۷۔ یہ (قرآن) تمام عالمین کے لیے تذکر (اور یاد دہانی) کا ذریعہ ہے۔

۸۸۔ اور تم اُس کی خبر ایک مدت کے بعد ضرور سُن لو گے۔

تفسیر

ابلیس کے بارے میں آخری بات

یہ آیات جو سورۂ ص کی آخری آیات ہیں، حقیقت میں اس سورہ کے سارے مضامین کا خلاصہ اور ان تمام مختلف بحثوں کا نتیجہ ہیں جو اس سورہ میں بیان ہوئی ہیں۔

پہلے تو ابلیس کے جواب میں جس نے یہ دھمکی دی تھی کہ وہ مخلصین کے سوا سب انسانوں کو گمراہ کر کے رکھ دے گا، خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے: حق کی قسم! اور میں حق ہی کہتا ہوں (قال فالحق والحق اقول)۔[1]

---

[1] اس جملہ کی ترکیب کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ ممکن ہے کہ "الحق" مبتدا ہو اور "قسمی" جو اس کی خبر ہے محذوف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی خبر "قولی" ہو "فالحق قولی" یا اس میں بھی موجود ہے کہ ایک محذوف مبتدا کی خبر ہو۔ "ھذا ھو الحق" یا "(انا الحق) ہو۔

کہ میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھر دوں گا (لأملئن جهنم منك و ممن تبعك منهم اجمعين)۔

جو کچھ ابتداء سورہ سے یہاں تک بیان ہوا ہے وہ سب حق تھا اور جو کچھ ان عظیم پیغمبروں نے، جن کی زندگی کا ایک گوشہ اس سورہ میں آیا ہے۔ اس کے لیے جنگ و پیکار اور جہاد کیا، وہ حق تھا۔ قیامت اور سرکشوں کے دردناک عذاب اور جنات کی انواع و اقسام کی نعمتوں کی جو باتیں اس سورہ میں بیان ہوئی ہیں وہ سب حق تھیں۔ اس سورہ کا اختتام بھی حق ہے اور خدا حق کی قسم کھاتا ہے اور حق بات کرتا ہے کہ جہنم کو شیطان اور اس کے پیروکاروں سے بھر دوں گا تاکہ انسانوں کو گمراہ کرنے کے بارے میں ابلیس کی اس بات کا ایک قطعی اور دو ٹوک جواب دیا جائے کہ جو اس نے قاطعیت کے طور پر کہی تھی۔ یہ اس لیے ہے تاکہ سب کی ذمہ داری واضح کر دی جائے۔

بہرحال یہ دونوں جملے بہت سی تاکیدات پر مشتمل ہیں: دو مرتبہ حق ہونے کی تاکید ہے اور قسم کھائی گئی ہے۔ اور "لاملئن" بھی نون تاکید ثقیلہ کے ساتھ ہے اور ان سب پر "اجمعین" کی ایک اور تاکید ہے تاکہ کسی کو معمولی سا بھی شک و شبہ اس بارے میں نہ ہونے پائے کہ شیطان اور اس کے پیروکاروں کے لیے کوئی راہِ نجات نہیں ہے اور ان کا اس راہ پر چلتے رہنا انھیں ہلاکت کے گھر تک پہنچا دے گا۔

اس کے بعد اس گفتگو کے آخر میں چار اہم مطالب کی طرف مختصر اور واضح عبارتوں کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: کہہ دے کہ میں تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا (قل ما اسئلكم عليه من اجر)۔

اس طرح سے بہانہ جوئی کرنے والوں کے بہانوں کو ختم کر دیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ میں تو صرف تمھاری نجات اور سعادت کا خواہاں ہوں، نہ تو کوئی مادی اجر تم سے چاہتا ہوں اور نہ ہی معنوی، نہ قدردانی، نہ شکرگزاری، نہ مقام و منزلت اور نہ حکومت، کیونکہ میرا اجر تو خدا کے ذمہ ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات۔ مثلاً سورۂ سبا کی آیہ ۴۷۔ میں اس کی تصریح ہوئی ہے: ان اجری الا علی اللہ

یہ بات خود پیغمبر اکرمؐ کی صداقت کی ایک دلیل ہے کیونکہ جھوٹے مدعی مختلف قسم کے لالچ کے نئے دعوے کرتے ہیں اور ان کا لالچ ان کی کئی باتوں سے بہرصورت واضح و آشکار ہو جاتا ہے۔

دوسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: میں متکلفین میں سے نہیں ہوں بلکہ میری باتیں دلیل و منطق کے ساتھ ہوتی ہیں اور کسی قسم کا تکلف ان میں نہیں ہے۔ میری عبارتیں واضح اور میری باتیں ہر قسم کے ابہام اور پیچیدگی سے خالی ہیں (وما انا من المتكلفين)۔

حقیقت میں پہلا جملہ دعوت کرنے والے کے اوصاف کے بارے میں ہے اور دوسرا جملہ اس کے دعوے کے مطالب کی کیفیت کے متعلق اور واقعاً یہ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کا مصداق ہے۔

تیسرے مرحلے میں اس عظیم دعوت اور آسمانی کتاب کے نزول کا اصلی ہدف بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ قرآن سارے جہان والوں کے لیے صرف نصیحت، یاددہانی اور بیداری کا ذریعہ ہے (ان هو الا ذكر للعالمين)۔

ہاں! اہم بات یہ ہے کہ لوگ غفلت سے باہر نکلیں اور غور و فکر کریں کیونکہ راستہ واضح ہے اور اس کی نشانیاں آشکار ہیں اور انسان کے

اندر ایک ایسی پاک و پاکیزہ فطرت ہے جو اس کی راہنمائی کرتی ہے اور راہِ توحید و تقویٰ کی طرف کھینچتی ہے۔ اہم بات تو بیداری ہے اور پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کی اصلی ذمہ داری یہی ہے۔

یہ تعبیر جس کی نظیر قرآن مجید میں کم نہیں ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انبیاء کی دعوت کے مطالب تمام مراحل میں، خداداد فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور یہ دونوں ایک ساتھ مل کر پیش رفت کرتے ہیں۔

چوتھے اور آخری مرحلے میں مخالفین کو مختصر اور معنی خیز عبارتوں کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، تم اس کی خبر ایک مُدّت کے بعد سُن لوگے (و لتعلمن نبأہ بعد حین)۔

ممکن ہے تم ان باتوں کو سنجیدگی سے ساتھ قبول نہ کرو، اور ان کے پاس سے بے اعتنائی کے ساتھ گزر جاؤ، لیکن بہت جلد میری گفتگو کی صداقت واضح ہو جائے گی۔ اس جہان میں بھی اسلام و کفر کی جنگ میں، اجتماعی اور فکری نفوذ کے مقام پر اور خدائی عذاب کے موقع پر اور دوسرے جہان میں بھی خدا کا دردناک عذاب دیکھ لوگے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ اپنے موقع پر اپنی آنکھ سے مشاہدہ کر لوگے۔ مختصر یہ ہے کہ خدائی تازیانہ آمادہ ہے اور بہت جلد متکبرین اور ظالموں پر برسے گا۔

متکلّف کون ہے؟

زیرِ بحث آیات میں بیان ہوا ہے کہ رسولِ اکرمؐ اپنے افتخارات میں سے ایک یہ شمار کرتے ہیں کہ میں متکلفین میں سے نہیں ہوں۔

روایات میں بہت زیادہ مباحث "متکلفین" کی نشانیوں اور علامتوں کے بارے میں موجود ہیں۔

ایک حدیث میں جو "جوامع الجامع" میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے، یہ آیا ہے:

للمتکلف ثلاث علامات: ینازع من فوقہ، و یتعاطی مالا ینال، و یقول مالا یعلم

متکلف کی تین نشانیاں ہیں۔ ہمیشہ اپنے سے اوپر کے لوگوں سے نزاع اور پرخاش رکھتا ہے، ایسے امور کے پیچھے لگا رہتا ہے جن تک کبھی نہیں پہنچ سکتا، اور ایسے مطالب کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جن سے آگاہی نہیں رکھتا[1]

یہی مضمون ایک دوسری عبارت کے ساتھ امام صادق علیہ السلام سے لقمان حکیم کے کلمات میں بھی آیا ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ کی علی علیہ السلام سے وصیتوں میں بیان ہوا ہے۔

للمتکلف ثلاث علامات، یتملق اذا حضر، و یغتاب اذا غاب، و یشمت بالمصیبۃ

متکلف کی تین نشانیاں ہیں:

---

[1] جوامع الجامع، المیزان جلد ۱۷، ص ۲۴۳ کے مطابق۔

۱۔ سامنے چاپلوسی کرتا ہے۔
۲۔ پیٹھ پیچھے غیبت کرتا ہے۔
۳۔ اور مصیبت کے وقت شماتت کرنے لگتا ہے [1]

امام صادق علیہ السلام سے ایک اور حدیث میں منقول ہے۔

المتکلف مخطیء و ان اصاب. و المتکلف لا یستجلب فی عاقبة امره الا الهوان ،و فی الوقت الا التعب و العناء و الشقاء ، والمتکلف ظاهره ریاء و باطنه نفاق، و هما جناحان بهما یطیر المتکلف ، و لیس فی الجملة من اخلاق الصالحین، ولا من شعار المتقین المتکلف فی ای باب، کما قال الله تعالی لنبیه قال ما اسئلکم علیه من اجر و ما انا من المتکلفین

متکلف خطاکار ہے چاہے وہ ظاہراً حقیقت تک پہنچ بھی جائے۔ متکلف کو آخر الامر سوائے پستی اور خواری کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور آج بھی سوائے رنج و تکلیف اور زحمت و ناراحتی کے اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

متکلف کا ظاہر ریا اور اس کا باطن نفاق ہے اور وہ ہمیشہ ان ہی دونوں پروں کے ساتھ پرواز کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تکلف صالحین کے اخلاق اور متقین کے شعار میں سے نہیں ہے چاہے وہ جس بات میں بھی ہو، جیسا کہ خدا اپنے پیغمبرؐ سے فرماتا ہے: کہہ دے! میں تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا اور میں متکلفین میں سے نہیں ہوں [2]

ان سب روایات سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ متکلفین وہ لوگ ہیں جو حق و عدالت اور راستی و درستی کے راستے سے قدم باہر رکھتے ہوئے حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں، خیالات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ ایسے امور کی جن کے بارے میں آگاہی نہیں رکھتے، خبر دیتے ہیں اور جن امور کو نہیں جانتے ان میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن الگ الگ ہے۔ اور ان کا حضور و غیاب متضاد ہیں وہ خود کو رنج و زحمت میں ڈالتے ہیں اور سر پھڑانے اور بدبختی کے سوا کوئی نتیجہ انھیں نہیں ملتا اور پرہیزگار اور صالح لوگ اس "صفت" سے بالکل پاک اور منزہ ہیں۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۴، ص ۳۷۲
[2] ایضاً

پروردگارا! ہمیں توفیق عنایت فرما کہ ہم تکلف، نفاق، تمرد اور سرکشی کے تمام آثار سے دُور رہیں۔

خداوندا! ہمیں مخلصین کی صف میں قرار دے جن کی تو اپنی حمایت کے سایہ تلے حفاظت فرماتا ہے اور گمراہ کرنے والا شیطان ان سے مایوس ہے۔

بارِالٰہا! ہمیں وہ بیداری اور سمجھ داری مرحمت فرما کہ ہم اس قرآنِ عظیم کے مطالب و معانی کو زندہ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ ہم ساری دنیا کے مسلمانوں کی طاقت و قوت کو اکٹھا کریں اور یک دل اور یک زبان ہو کر تیری راہ میں قدم بڑھائیں اور حق و حقیقت کے دشمنوں کا قلع قمع کر کے رکھ دیں۔

آمین یارب العالمین

سُورۂ صٓ کی تفسیر کا اختتام بروز پیر ۹ شوال ۱۴۰۴ھ

سُورَۃُ زُمَر

مکّہ میں نازل ہوئی

اس کی ۷۵ آیتیں ہیں

آغاز ـــــ ۲۴ شوال ۱۴۰۴ ھجری ـــ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۂ زُمر کے مطالب و مضامین

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اسی بنا پر اس میں زیادہ تر توحید و معاد، قرآن کی اہمیت اور پیغمبر اسلامؐ کے مقام نبوت سے مربوط مسائل سے متعلق گفتگو ہے۔ جیسا کہ مکی سورتوں کا معمول ہے۔

مکہ کا دور دینی اعتقادات کی بنیادوں اور ایمانی اساس کے لحاظ سے مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کا دور تھا۔ لہذا اس سلسلے میں مکی سورتوں میں قوی ترین اور مؤثر ترین مباحث موجود ہیں اور یہی محکم بنیاد تھی جس کے عجیب و غریب اثرات مدینہ میں جنگوں میں، دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں، منافقین کی کارستانیوں کے مقابلے میں اور نظام اسلام کو قبول کرنے میں ظاہر ہوئے اور اگر ہم مسلمانوں کی مدینہ میں تیزی کے ساتھ کامیابی کا راز معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں مکہ کی مؤثر تعلیم و تربیت کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

بہرحال یہ سورہ چند اہم حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ وہ چیز جو اس سورہ میں سب سے زیادہ دکھائی دیتی ہے وہ توحید خالص کے مسئلہ کی طرف دعوت ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں اور جہتوں کے بارے میں نصیحت، نیز توحید خالقیت، توحید ربوبیت اور توحید عبادت کا ذکر ہے۔ اس سورہ کی مختلف آیات میں خدا کی عبادت و بندگی میں اخلاص کا مسئلہ خصوصیت کے ساتھ مذکور ہے، اور اس سلسلے میں اس کی تعبیرات اس قدر مؤثر ہیں کہ وہ انسان کے دل کو اخلاص کی طرف کھینچتی اور جذب کرتی ہیں۔

۲۔ دوسرا اہم مسئلہ جو اس سورہ کے مختلف حصوں میں تقریباً ابتداء سے لے کر آخر تک قابل توجہ ہے، وہ عظیم عدالت الٰہی اور معاد کا مسئلہ ہے۔ ثواب و جزا، بہشت کے بلند مقامات اور دوزخ کی آگ کے سائبانوں کا مسئلہ بھی اس میں مذکور ہے اور قیامت کے دن کے خوف و وحشت، اعمال کے نتائج کے واضح اور آشکار ہونے اور اس عظیم منظر میں خود اعمال کے ظاہر ہو جانے کا معاملہ بھی موجود ہے۔

جھوٹوں اور خدا پر افتراء باندھنے والوں کی صورتوں کے سیاہ ہونے، کافروں کے جہنم کی طرف دھکیلے جانے، ان کے لیے فرشتگانِ عذاب کی طرف سے ملامت و سرزنش کرنے، رحمت کے فرشتوں کی طرف سے بہشتیوں کو بہشت کی طرف دعوت دینے اور انھیں تبریک و تہنیت پیش کرنے کا ذکر بھی ہے۔

یہ مسائل جو معاد کے محور کے گرد گھومتے ہیں توحید کے مسائل کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں گویا ایک ہی کپڑے کا تانا بانا ہیں۔

۳۔ اس سورہ کا تیسرا حصہ جو اس کے صرف تھوڑے سے حصہ پر مشتمل ہے قرآن مجید کی اہمیت ہے لیکن یہ تھوڑا سا حصہ بھی قرآن کی ایک عمدہ تصویر اور قلب و روح پر اس کی قوی تاثیر لیے ہوئے ہے۔

۴۔ چوتھا حصہ جو اس سے بھی مختصر تر ہے گزشتہ اقوام کی سرگزشت اور آیات حق کی تکذیب کرنے والوں کے لیے خدا کا دردناک عذاب بیان کرتا ہے۔

۵۔ اس سورہ کا آخری حصہ، خدا کی طرف بازگشت کے دروازوں کے کھلا ہونے اور توبہ کا مسئلہ ہے۔ اس حصے میں توبہ و رحمت کی مؤثر ترین آیات بیان ہوئی ہیں کہ شاید سارے قرآن میں اس سلسلے میں کوئی آیت اس سے زیادہ خوشخبری دینے والی نہ ہو۔ یہ سورہ سورۂ زمر کے نام سے مشہور ہے اور یہ نام اس سورہ کی آیہ ۷۱ اور ۷۳ سے لیا گیا ہے۔ کبھی اسے اس کی آیہ ۲۰ کی مناسبت سے سورۂ غرف بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ نام مشہور نہیں ہے۔

سورۂ زمر کی فضیلت

احادیث میں اس سورہ کی تلاوت کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ان میں سے ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے۔

من قرء سورۃ الزمر لم یقطع اللہ رجاءہ۔ و اعطاہ ثواب الخائفین الذین خافوا اللہ تعالیٰ

جو شخص سورۂ زمر کی تلاوت کرے خدا (اپنی رحمت سے) اس کی امید منقطع نہیں کرے گا اور ان لوگوں کا اجر اسے عطا کرے گا جو خدا سے ڈرتے ہیں[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے اس طرح نقل ہوا ہے۔

من قرء سورۃ الزمر اعطاہ اللہ شرف الدنیا والآخرۃ۔ و اعزہ بلا مال ولا عشیرۃ، حتی یھابہ من یراہ و حرم جسدہ علی النار

جو شخص سورۂ زمر کی تلاوت کرے گا خدا اسے دنیا و آخرت کا شرف عطا کرے گا اور مال و قبیلہ کے بغیر بھی اسے قدرت و عزت بخشے گا۔ اس طرح سے کہ جو شخص بھی اسے دیکھے گا اس سے ہیبت کھائے گا اور اس کا بدن آتش دوزخ پر حرام کر دیگا[2]

ان فضیلتوں کا اس سورہ کے مضامین کے ساتھ موازنے کی ضرورت ہے۔ سورہ کے مضامین میں پروردگار کا خوف، اس کی رحمت کی امید، عبادت میں اخلاص اور حق تعالیٰ کی ذات پاک کے سامنے سر تسلیم خم کرنا موازنے سے یہ بات اچھی طرح سے واضح ہوتی ہے کہ یہ اجر و ثواب ان لوگوں کے لیے ہے، جو تلاوت کو غور و فکر کے لیے اور غور و فکر کو ایمان و عمل صالح کے لیے وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس سورہ کا مفہوم ان کی روح کے اندر عملی شکل پیدا کرے اور اس کی تجلی ان کی ساری زندگی میں نمایاں ہو۔ ہاں! ایسے ہی اشخاص اس قسم کے عظیم اجر اور پروردگار کی وسیع رحمت کے اہل ہیں۔

---

[1] مجمع البیان، سورۂ زمر کی ابتداء میں۔

[2] مجمع البیان، ثواب الاعمال اور تفسیر نور الثقلین۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ○

۲۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ○

۳۔ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ ؕ وَالَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُہُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ فِیۡ مَا ہُمۡ فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ○

ترجمہ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے

۱۔ یہ کتاب خداوند عزیز وحکیم کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

۲۔ ہم نے اس کتاب کو حق کے ساتھ تجھ پر نازل کیا ہے۔ پس تم خدا کی عبادت کرو اور اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرلو۔

۳۔ آگاہ رہو کہ دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ لوگ کہ جنھوں نے خدا کے علاوہ اپنے اولیاء قرار دے لیے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ ہم ان کی پرستش نہیں کرتے مگر صرف اس لیے کہ یہ ہمیں خدا سے نزدیک کر دیں گے، جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا قیامت کے دن ان کے درمیان اس کا فیصلہ کردے گا، خدا اس شخص کو جو جھوٹا اور کفران کرنے والا ہے کبھی بھی ہدایت نہیں کرے گا۔

تفسیر

دین کو شرک سے پاک کرو

یہ سورہ قرآن مجید کے نزول سے متعلق دو آیات سے شروع ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک آیت میں تو نزولِ قرآن کے مبداء یعنی خدا کی پاک ذات کے متعلق بیان ہے اور دوسری آیت میں قرآن کے مطالب و مقاصد کے بارے میں گفتگو ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: یہ کتاب، خداوند عزیز و حکیم کی طرف سے نازل ہوئی ہے (تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم)۔[1]

ہر کتاب کو اس کے نازل کرنے والے یا لکھنے والے سے پہچاننا چاہیے اور جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس عظیم آسمانی کتاب کا سرچشمہ ایک قادر و حکیم خدا کا علم ہے جس کی بے پایاں قدرت کے مقابلے میں کوئی چیز مشکل نہیں ہے اور کوئی امر اس کے لامتناہی علم سے مخفی نہیں رہتا تو ہمیں اس کے مضامین کی عظمت کا علم ہو جاتا ہے اور مزید کسی وضاحت کے بغیر ہی ہمیں یقین آ جاتا ہے کہ اس کے مطالب حق ہیں اور یہ سراسر حکمت، نور اور ہدایت ہے۔

ضمنی طور پر قرآن کی سورتوں کے آغاز میں اس قسم کی تعبیریں مومنین کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ اس عظیم کتاب میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ خدا کا کلام ہے، پیغمبر کا کلام نہیں ہے اگرچہ پیغمبر اکرمؐ کا کلام بھی بلند مرتبہ اور حکیمانہ ہے۔

اس کے بعد اس آسمانی کتاب کے مطالب و مقصد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کتاب کو حق کے ساتھ تجھ پر نازل کیا ہے (انا انزلنا الیک الکتاب بالحق)۔

اس میں حق کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور تو حق کے سوا اور کوئی مطلب اس میں مشاہدہ نہیں کرے گا۔ اسی وجہ سے حق طلب لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں اور وادیٔ حقیقت کے پیاسے اس کے مطالب کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔

نیز اس کے نازل کرنے کا مقصد چونکہ انسانوں کو خالص دین پہنچانا ہے اس لیے آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اب جبکہ یہ بات ہے تو پھر "خدا کی پرستش کر، اس حال میں کہ اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر لے" (فاعبد اللہ مخلصا لہ الدین)۔

ممکن ہے یہاں "دین" سے مراد خدا کی عبادت ہو کیونکہ اس سے پہلے "فاعبد اللہ" کے ذریعے عبادت کا حکم دیا گیا ہے

---

[1] "تنزیل الکتاب" ایک مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: "ھذا تنزیل الکتاب"
بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "تنزیل الکتاب" مبتداء ہے اور "من اللہ" اس کی خبر ہے۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔ ضمناً "تنزیل" ایک مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں ہے اور صفت کی موصوف کی طرف اضافت ہے یعنی "ھذا کتاب منزل من اللہ ....."

اس بنا پر اس کا لاحقہ جو "مخلصًا لہ الدین" ہے۔ صحتِ عبادت کی شرط یعنی اخلاص اور ہر قسم کے شرک و ریا اور غیرِ خدا سے خالی ہونے کو بیان کرتا ہے۔

اس حالت میں "دین" کے مفہوم کی وسعت اور اس میں کسی شرط کا نہ ہونا زیادہ وسیع معنی پر دلالت کرتا ہے، جس میں عبادت بھی شامل ہے اور دوسرے اعمال بھی اور اعتقادات بھی۔ دوسرے لفظوں میں "دین" انسان کی روحانی اور مادی حیات کے مجموعے کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ لہٰذا خدا کے خالص بندوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام حالات کو اس کے لیے خالص بنائیں اور اس کے غیر کو خانۂ دل، صحن جان اور میدانِ عمل اور دائرۂ گفتار سے دور کر دیں۔ اس کے لیے غور و فکر کریں۔ اسی کے لیے دوست بنائیں۔ اسی کی بات کریں۔ اسی کے لیے عمل کریں اور ہمیشہ اس کی رضا کی راہ میں قدم اٹھائیں۔ کیونکہ "اخلاصِ دین" یہی ہے۔

اسی بنا پر آیت کے مفہوم کو "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت میں یا خاص "عبادت و اطاعت" میں محدود کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی اس پر کوئی واضح دلیل موجود ہے۔

بعد والی آیت میں دوبارہ مسئلہ اخلاص کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آگاہ رہو کہ دینِ خالص اللہ کے لیے مخصوص ہے (الا للہ الدین الخالص)۔

اس عبارت میں دو معانی کی گنجائش ہے۔

پہلا یہ کہ: جسے خدا قبول کرتا ہے وہ صرف دینِ خالص ہے اور صرف اس کے فرمان کے سامنے بلا کسی شرط کے سرِ تسلیم خم کرنا ہے اور ہر قسم کا شرک و ریا اور قوانین خداوندی کو ان کے غیر کے ساتھ ملانا مردود و مسترد ہے۔

دوسرا یہ کہ: خالص دین و آئین صرف خدا سے ہی لینا چاہیے کیونکہ جو کچھ انسانوں کے افکار کا ساختہ و پرداختہ ہے وہ نارسا اور خطا و اشتباہ کی آمیزش رکھتا ہے۔

لیکن سابقہ آیت کے مفہوم کو پیشِ نظر رکھیں تو پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے، کیونکہ وہاں اخلاص کا باعث بندے ہیں۔ اس بنا پر زیرِ بحث آیت میں بھی خلوص کی انھیں کی طرف نسبت ہونی چاہیے۔

اس بات کا دوسرا شاہد وہ حدیث ہے جو پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہوئی ہے۔ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

یارسول اللہ! انا نعطی اموالنا التماس الذکر فھل لنا من اجر؟ فقال رسول اللہ (ص) لا، قال یارسول اللہ! انا نعطی التماس الاجر و الذکر فھل لنا اجر؟ فقال رسول اللہ (ص) ان اللہ تعالیٰ لا یقبل الا من اخلص لہ، ثم تلا رسول اللہ (ص) ھٰذہ الآیۃ الا للہ الدین الخالص۔

یارسول اللہ! ہم اپنے اموال دوسروں کو بخشتے ہیں تاکہ ہم اپنا نام و نمود لوگوں کے درمیان پیدا کریں۔ تو کیا ہمارے لیے کوئی اجر ہے؟

فرمایا: نہیں۔

پھر اس نے عرض کیا: ہم بعض اوقات خدا سے اجر کے حصول کے لیے بھی اور نام و نمود کے لیے بھی بخشش کرتے ہیں، تو کیا اس صورت میں ہمارے لیے کوئی اجر و پاداش ہے۔
پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: خدا کسی بھی چیز کو قبول نہیں کرتا سوائے اس کے جو اس کے لیے خالص ہو۔ پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت کی۔
الا للہ الدین الخالص [1]

بہرحال یہ آیت حقیقت میں گزشتہ آیت کی دلیل بیان کر رہی ہے۔ وہاں قرآن کہتا ہے: کہ خدا کی اخلاص کے ساتھ عبادت کرو اور یہاں اضافہ کرتا ہے: جان لے کہ خدا تو صرف خالص عمل کو ہی قبول کرتا ہے۔

آیاتِ قرآنی اور احادیثِ اسلامی میں مسئلہ اخلاص پر بہت کچھ فرمایا گیا ہے۔ زیرِ بحث جملے کی ابتداء "الا" کے ساتھ جو عام طور پر توجہ مبذول کرنے کے لیے بولا جاتا ہے، اس موضوع کی اہمیت کی ایک اور نشانی ہے۔

اس کے بعد مشرکین کہ جو اخلاص کی راہ چھوڑ کر شرک کی بے راہ روی میں سرگرداں تھے کی کمزور اور فضول منطق کو باطل کرتے ہوئے اس طرح فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جنھوں نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنے اولیاء بنا لیا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ ہم ان کی پرستش نہیں کرتے مگر صرف اس لیے کہ یہ ہمیں خدا سے نزدیک کر دیں، خدا قیامت کے دن جس چیز میں وہ اختلاف کرتے ہیں، ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا اور وہاں ان کے اعمال و افکار کی خرابی اور تباہی سب پر ظاہر ہو جائے گی۔

(والذین اتخذوا من دونہ اولیاء ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی ان اللہ یحکم بینھم فیما ھم فیہ یختلفون) [2]

یہ آیت حقیقت میں مشرکین کے لیے ایک قاطع اور دو ٹوک تہدید ہے کہ قیامت کے دن جو اختلافات کے برطرف ہونے اور حقائق کے ظاہر و آشکار ہونے کا دن ہے۔ خدا ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اور ان کو ان کے اعمال کی سزا دے گا۔ علاوہ ازیں وہ میدانِ محشر میں سب کے سامنے ذلیل و رسوا بھی ہوں گے۔

یہاں بت پرستوں کی منطق وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ:

بعض اس بات کے معتقد ہیں کہ بت پرستی کا ایک سرچشمہ یہ ہے کہ ایک گروہ اپنے گمان میں خدا کی پاک ذات کو اس سے بزرگ و بالا سمجھتا تھا کہ ہماری عقل و فکر اس تک پہنچ سکے اور اس بنیاد پر وہ اسے اس سے منزہ سمجھتا تھا کہ ہم براہِ راست اس کی عبادت کریں۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ ہم ایسے افراد کی طرف رُخ کریں جن کے ذمے خدا کی طرف سے اس عالم کی ربوبیت اور تدبیر کر دی گئی ہے اور انھیں خدا اور اپنے درمیان واسطہ بنائیں۔

---

[1] روح المعانی، جلد ۲۳، ص ۲۱۲ (زیرِ بحث آیات کے ذیل میں)۔
[2] یہ بات واضح ہے کہ زیرِ بحث آیت میں "ما نعبدھم" سے پہلے ایک جملہ مقدر ہے۔ "یقولون ما نعبدھم.....

انھیں "ارباب" اور خداؤں کے طور پر قبول کرلیں اور ان کی پرستش کریں تاکہ وہ ہمیں خدا کے قریب کردیں اور وہ ملائکہ، جن اور کلی طور پر کائنات کے مقدس موجودات ہیں۔

پھر اس بنا پر ان مقدسین تک بھی دسترس ممکن نہیں تھی لہٰذا ان کی مورتیاں اور تصویریں بنالیا کرتے تھے اور ان کی پرستش کیا کرتے تھے، اور یہی وہ بُت تھے اور چونکہ وہ ان مورتیوں اور مقدسین کی ذوات کے درمیان ایک قسم کی وحدت کے قائل تھے لہٰذا وہ بتوں کو بھی "ارباب" اور خدا خیال کرتے تھے۔

اس طرح سے ان کی نزدیک وہ موجوداتِ ممکن ہی خدا تھے جو خداوندِ عالم کی طرف سے پیدا کیے گئے تھے اور ان کے گمان میں وہ بارگاہِ حق کے مقرب اور پروردگار کے حکم سے امورِ عالم کو چلانے والے تھے اور وہ خدا کو رب الارباب (خداؤں کا خدا) جانتے تھے جو عالمِ ہستی کا خالق اور آفریدگار ہے۔ ورنہ بُت پرستوں میں سے بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ یہ پتھر اور لکڑی کے بُت یا ان کے خیالی خدا یعنی فرشتے اور جن وغیرہ تک بھی اس جہان کے خالق و آفریدگار ہوں[1]

البتہ بُت پرستی کے اور بھی بہت سے سرچشمے ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ انبیاء اور صالح لوگوں کا احترام بعض اوقات اس بات کا سبب بنتا تھا کہ ان کی تصویروں اور مورتیوں کا بھی احترام کریں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد ان تصویروں نے ایک مستقل صورت اختیار کرلی اور احترام بھی پرستش میں تبدیل ہوگیا۔ اسی بنا پر اسلام میں مجسمہ سازی کو سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

یہ چیز بھی تواریخ میں آئی ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب چونکہ کعبہ اور سرزمینِ مکہ کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، اس لیے بعض اوقات وہاں سے پتھر کے کچھ ٹکڑے اپنے ساتھ مختلف علاقوں میں لے جاتے تھے۔ پہلے تو صرف احترام کرتے اور پھر آہستہ آہستہ ان کی پرستش کرنے لگ جاتے۔

بہرحال یہ چیز اس بات سے جو "عمرو بن لحی" کی داستان میں منقول ہے کوئی تضاد نہیں رکھتی کہ اس نے شام کے سفر کے موقع پر بُت پرستی کے کچھ مناظر کا مشاہدہ کیا اور پہلی مرتبہ ایک بُت اپنے ساتھ حجاز میں لے آیا اور بتوں کی پرستش اس وقت سے معمول بنی چونکہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے ان میں سے ہر ایک بُت پرستی کی کسی ایک بنیاد کو بیان کرتا ہے اور شامیوں کا بتوں کی پرستش کرنے کا سبب بھی یہی امور یا ان جیسے ہی امور تھے۔

لیکن ہر صورت میں یہ سب بے بنیاد اوہام و خیالات تھے جو ناتوان دماغوں سے ٹپکتے تھے اور لوگوں کو خداشناسی کے اصلی راستے سے منحرف کردیتے تھے۔

قرآن مجید خصوصیت کے ساتھ اس نکتے پر تاکید کرتا ہے کہ انسان بغیر کسی واسطے کے خدا کے ساتھ تعلق پیدا کرسکتا ہے، اس سے گفتگو کرسکتا ہے، راز و نیاز کرسکتا ہے، اپنی حاجت طلب کرسکتا ہے، عفو و بخشش کی درخواست کرسکتا ہے اور توبہ و انابت کرسکتا ہے، یہ سب چیزیں اسی کے لیے ہیں اور اسی کے اختیار و قدرت میں ہیں۔

سورۂ "حمد" اسی حقیقت کو بیان کررہی ہے کیونکہ بندے روزانہ نماز میں اس سورہ کے پڑھنے سے، دائمی طور پر براہِ راست

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۷، ص ۲۴۷ (کچھ فرق کے ساتھ)

اپنے پروردگار کے ساتھ ربط رکھتے ہیں، اس کو پکارتے ہیں اور بغیر کسی واسطے کے اس سے دعا کرتے ہیں اور اپنی حاجات طلب کرتے ہیں۔

اسلامی احکام میں توبہ و استغفار کا طریقہ اور اسی طرح خدائے بزرگ سے ہر قسم کی درخواستیں، جن سے ہماری ماثورہ دعائیں بھری پڑی ہیں، یہ سب اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلام ان مسائل میں کسی واسطے کا قائل نہیں اور یہی حقیقتِ توحید ہے۔

یہاں تک کہ مسئلہ شفاعت اور اولیاء اللہ سے توسل بھی اذنِ پروردگار اور اس کی اجازت کے ساتھ مقید ہے اور وہ بھی اسی مسئلہ توحید پر ایک تاکید ہے۔

اسی طرح سے رابطہ قائم و برقرار رہنا چاہیے کیونکہ وہ ہم سے، خود ہم سے بھی زیادہ قریب ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید

ہم انسان کی شہ رگِ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ (ق ـــــ ۱۶)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے:

واعلموا ان اللہ یحول بین المرء و قلبہ

جان لو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان رہتا ہے (انفال ـــــ ۲۴)

ان حالات میں نہ وہ ہم سے دُور ہے اور نہ ہم اس سے دور ہیں کہ واسطے کی ضرورت پڑے۔ وہ دوسرے ہر شخص کی نسبت ہم سے زیادہ نزدیک ہے وہ ہر جگہ موجود و حاضر ہے اور ہمارے دل کے اندر اس کی جگہ ہے۔

اسی بنا پر واسطوں کی پرستش چاہے وہ فرشتے اور جن ہوں یا ان کے مانند دوسری مخلوق اور چاہے پتھر اور لکڑیوں کے بتوں کی پرستش ہو، ایک بے بنیاد اور جھوٹا عمل ہے۔ علاوہ ازیں پروردگار کی نعمتوں کا کفران بھی ہے، کیونکہ نعمت کا بخشنے والا پرستش کا حقدار ہے نہ کہ یہ بے جان سراپا نیاز و احتیاج موجودات۔

اس لیے آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے: خدا ایسے شخص کو جو جھوٹا اور کفران کرنے والا ہو کبھی ہدایت نہیں کرتا (ان اللہ لا یھدی من ھو کاذب کفار)۔

نہ اس جہان میں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اور نہ دوسرے جہان میں جنت کی طرف ہدایت، کیونکہ اس نے خود ہدایت کے سب دروازوں کے بند ہونے کی بنیاد فراہم کر دی ہے، کیونکہ خدا اپنی ہدایت کا فیض ایسی زمینوں پر بھیجتا ہے جو اسے قبول کرنے کے لائق اور اس کے لیے آمادہ ہوں، نہ کہ ان دلوں میں جو جانتے ہوئے شعوری طور پر ہر قسم کی اہلیت کو تباہ کر دیں۔

"تنزیل" اور "انزال" میں فرق

اس سورہ کی پہلی آیت میں "تنزیل الکتاب" کی تعبیر ہے اور دوسری آیت میں "انزلنا الیک الکتاب" کی تعبیر ہے۔ "تنزیل" اور "انزال" میں کیا فرق ہے اور ان آیات میں تعبیر کا یہ اختلاف کس لیے ہے؟ اس بارے میں جو کچھ چند لغات کے متنوں سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "تنزیل" تو عام طور پر ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کوئی چیز بتدریج اور آہستہ آہستہ نازل ہو، جب کہ "انزال" ایک عام معنی رکھتا ہے۔ جس میں نزولِ تدریجی بھی شامل ہے اور "دفعی" (ایک ہی

مرتبہ کا نزول) بھی ہے[1]

بعض ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ " تنزیل " صرف نزولِ تدریجی ہے اور " انزال " صرف نزولِ دفعی ہے[2]

اس بنا پر مذکورہ تعبیر کا اختلاف ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ قرآن دو قسم کے نزول کا حامل ہے۔ ایک نزولِ دفعی (یعنی ایک ہی مرتبہ) جو شب قدر میں اور ماہ مبارک رمضان میں واقع ہوا، اس موقع پر قرآن اکٹھا پیغمبر گرامی اسلامؐ کے قلب مبارک پر نازل ہوا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر

ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا۔ (قدر ـــــ ۱)

انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ

ہم نے اسے ایک مبارک رات میں نازل کیا۔ (دخان ـــــ ۲)

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن

رمضان وہی مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ (بقرہ ـــــ ۱۸۵)

ان تمام مواقع پر " انزال " کے مادہ سے استفادہ کیا گیا ہے جو قرآن کے دفعی (ایک ہی مرتبہ کے) نزول کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرا نزول جو تدریجاً پیغمبر اکرمؐ کی نبوت کے ۲۳ سالہ دور میں صورت پذیر ہوا۔ ہر حادثے ہر واقعے میں اس سے مناسبت رکھنے والی آیات نازل ہوتی رہیں۔ اس طریقے نے مسلمانوں کو مرحلہ بہ مرحلہ روحانی، اخلاقی، اعتقادی اور اجتماعی کمال کے مدارج طے کرائے۔ جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۱۰۶ میں بیان ہوا ہے۔

وقرآناً فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث ونزلناہ تنزیلاً

ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا جو ایک دوسرے سے جدا آیتوں کی صورت میں ہے تاکہ تو اسے تدریجاً اور آہستہ آہستہ لوگوں کے سامنے پڑھے (اور یہ دلوں میں جذب ہو جائے) اور ہم نے اس قرآن کو قطعی طور پر تدریجاً نازل کیا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض اوقات ایک ہی آیت میں دونوں تعبیریں دو الگ الگ مقاصد کے لیے استعمال ہوئی ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید سورۂ محمد کی آیہ ۲۰ میں کہتا ہے:

و یقول الذین اٰمنوا لولا نزلت سورۃ فاذا انزلت سورۃ محکمۃ وذکر فیھا القتال رأیت الذین فی قلوبھم مرض ینظرون الیک نظر المغشیّ علیہ من الموت

---

[1] مفردات راغب مادہ " نزل " والفرق بین الانزال والتنزیل فی وصف القرآن والملائکۃ ان التنزیل یختص بالموضع الذی یشیر الیہ انزالہ مفرقاً ومرۃ بعد اخری والانزال عام).

[2] تفسیر فخر رازی میں بعض سے یہ فرق نقل ہوا ہے۔

مؤمنین کہتے ہیں کہ کوئی سورہ نازل کیوں نہ ہوئی ؟ جس وقت محکم سورہ نازل ہوجائے گی اور اس میں جنگ کا ذکر ہوگا ، تو ، تو بیمار دل منافقوں کو دیکھے گا کہ وہ کس طرح سے تیری طرف دیکھ رہے ہیں جیسے ان کی روح قبض کی جارہی ہے ۔

گویا مؤمنین ایک سورہ کے تدریجی نزول کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ وہ اس کے خوگر ہوجائیں لیکن چونکہ بعض اوقات ایک سورہ کا تدریجی نزول کچھ مسائل کے موقعوں پر مثلاً جہاد میں منافقین کے سوء استفادہ کا سبب بنتا تھا تاکہ مرحلہ بہ مرحلہ اس سے پہلو تہی کرلیں ، تو ایسے مواقع پر پوری سورۃ ایک ہی ساتھ نازل ہوجاتی تھی ۔

یہ آخری چیز ہے جو ان دونوں تعبیروں کے فرق کے سلسلہ میں کہی جاسکتی ہے اور اس کے مطابق زیر بحث آیات میں دونوں قسم کے نزول کی طرف اشارہ ہوا ہے اس لحاظ سے یہ کامل جامعیت رکھتی ہے ۔

لیکن اس کے باوجود مذکورہ بالا تفسیر اور فرق کے استثنائی مواقع بھی موجود ہیں ۔ منجملہ ان کے سورۂ فرقان کی آیہ ۳۲ میں بیان ہوا ہے ۔

و قال الذین کفروا لولا نزل علیه القرآن جملة واحدة کذالك لنثبت به فؤادك و رتلناه ترتیلاً

کافروں نے کہا قرآن اکٹھا اور یکجا کیوں نازل نہیں ہوتا ؟ یہ اس بنا پر ہے کہ ہم تیرے دل کو محکم کر دیں ، اس لیے ہم نے اسے تدریجاً تیرے لیے پڑھا ہے ۔

البتہ ان دونوں قسم کے نزول میں سے ہر ایک کے کچھ فوائد و آثار ہیں ، جن کی طرف متعلقہ جگہ پر اشارہ کیا گیا ہے [1]

---

[1] قرآن کے تدریجی نزول کے بارے میں ہم نے جلد ۱۵ میں تفصیلی بحث کی ہے ۔

۴۔ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○

۵۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ○

ترجمہ

۴۔ اگر (بفرض محال) خدا کسی کو اپنی اولاد بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا منتخب کر لیتا، وہ منزہ ہے (اس سے کہ کوئی اس کی اولاد ہو) وہ اللہ واحد و قہار ہے۔

۵۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ رات کو دن پر لپیٹ دیتا ہے اور دن کو رات پر اور سورج اور چاند کو اس نے اپنے فرمان کا مسخر بنا دیا ہے، ان میں سے ہر ایک مدتِ معین تک اپنی حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہے، آگاہ رہو کہ وہ قادر اور بخشنے والا ہے۔

تفسیر

وہ ہر چیز پر حاکم ہے، اسے اولاد کی کیا ضرورت ہے؟

گزشتہ آیات میں اس ضمن میں گفتگو ہوئی ہے کہ مشرکین بتوں کو خدا کے نزدیک واسطہ اور شفیع سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بعض معبودوں مثلاً فرشتوں کے بارے میں ایک اور عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ وہ انھیں خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے۔ پہلی زیر بحث آیت اس قبیح خیال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے: اگر خدا کسی کو اپنی اولاد بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا منتخب کر لیتا (لو اراد اللہ ان یتخذ ولدًا لاصطفٰی مما یخلق ما یشاء)۔

وہ اس سے پاک اور منزہ ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو وہ اللہ واحد و قہار ہے (سبحانہ ھو اللہ الواحد القہار)۔

پہلے جملے کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر خدا کسی کو اولاد بنانا ہی چاہتا تو بیٹیوں کا انتخاب کیوں کرتا، جو تمھارے زعم کے مطابق بے قدر و قیمت انسان ہیں، وہ بیٹوں کو منتخب کیوں نہ کرتا؟ اور یہ حقیقت میں مخاطب کے ذہن کے مطابق ایک طرح کا استدلال ہے تاکہ وہ اپنی گفتگو کے بے بنیاد ہونے کو سمجھ لیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر خدا چاہتا کہ اس کی اولاد ہو تو فرشتوں سے برتر و بہتر مخلوق پیدا کرتا۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خدا کی بارگاہ میں بیٹیوں کے وجود کی قدر و قیمت بیٹوں سے کمتر نہیں ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ فرشتے اور حضرت عیسیٰ جو منحرفین کے اعتقاد کے مطابق خدا کی اولاد ہیں۔ بہت ہی باشرف اور لائق موجودات ہیں، اس لیے ان دونوں تفاسیر میں سے کوئی بھی مناسب نظر نہیں آتی۔ بہتر یہ ہے کہ کہا جائے کہ آیت اس مطلب کو بیان کرنا چاہتی ہے کہ اولاد ضروری طور پر مدد اور روحانی تسکین کے لیے ہوتی ہے۔ بفرضِ محال اگر خدا کو اس قسم کی احتیاج ہوتی تو اس کے لیے اولاد کا ہونا ضروری نہیں تھا بلکہ اپنی باشرف مخلوق میں سے کچھ لوگوں کو منتخب کر لیتا جو اس مقصد کو پورا کرتے، اولاد کا انتخاب کیوں کرتا؟

لیکن وہ چونکہ واحد و یگانہ اور ہر چیز پر قاہر و غالب ہے اور ازلی و ابدی ہے، نہ وہ کسی کی مدد کا محتاج ہے اور نہ ہی کسی وحشت کا اس کے لیے کوئی تصور ہے، جو کسی چیز سے روحانی تسکین حاصل ہونے کی وجہ سے برطرف ہو اور نہ ہی وہ نسل کے جاری رہنے کا محتاج ہے۔ اس بنا پر وہ اولاد رکھنے سے پاک و منزہ ہے، چاہے وہ حقیقی اولاد ہو یا اپنائی اور انتخاب کی ہوئی۔

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے یہ کم عقل بے خبر جو کبھی فرشتوں کو خدا کی اولاد خیال کرتے تھے اور کبھی اس کے اور جنوں کے درمیان کسی نسبت کے قائل ہوتے تھے اور کبھی حضرت مسیحؑ یا حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا بتاتے تھے، اس واضح حقیقت سے بے خبر تھے کہ اگر بیٹے سے مراد حقیقی بیٹا ہو تو سب سے پہلے تو اس کا لازمہ جسم ہے، دوسرے تجزیہ کو قبول کرنا ہے (کیونکہ بیٹا باپ کے وجود کا ایک جزو ہوتا ہے جو اس سے جدا ہوتا ہے)۔ تیسرے اس کا لازمہ شبیہ و نظیر کا رکھنا ہے (کیونکہ بیٹا باپ سے مشابہت رکھتا ہے) اور چوتھے۔ اس کا لازمہ بیوی کی احتیاج ہے۔

اور خدا ان تمام امور سے پاک و منزہ ہے۔

نیز اگر اس سے مراد انتخاب کردہ بیٹا ہو اور یعنی اپنایا ہوا ہو تو وہ بھی یا جسمانی کمک و مدد کے لیے ہوتا ہے یا اخلاقی اور اس کے مانند انس کے لیے ہوتا ہے اور خداوند قادر و قاہر ان سب امور سے بے نیاز ہے۔

اس بنا پر "واحد" و "قہار" کی تعبیر ان تمام احتمالات کا مختصر سا جواب ہے۔

بہرحال لفظ "لو" جو عام طور پر محال شرطوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایک فرضِ محال ہے کہ خدا کسی فرزند کا انتخاب کرے اور اگر بفرضِ محال اسے کوئی ضرورت ہوتی تو جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے اس کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ اس کی برگزیدہ مخلوقات اس مقصد کو پورا کر دیتیں۔

پھر اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ خدا مخلوقات سے کوئی احتیاج نہیں رکھتا اور ساتھ ہی توحید اور اس کی عظمت کی نشانیوں کو بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: خدا نے تمام آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے (خلق السماوات و الارض بالحق)۔

ان کا حق ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک عظیم مقصد درمیان میں تھا کہ وہ موجودات کے ارتقاء کے سوا ـــــ جن کے آگے انسان ہیں اور پھر قیامت پر اختتام ہے ـــــ کچھ اور چیز نہیں ہے۔

اس عظیم آفرینش کے بیان کے بعد ایک عجیب وغریب تدبیر اور چھ قسم کے تغیرات اور ان پر حاکم عجیب نظام کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹ دیتا ہے (یکور اللیل علی النھار ویکور النھار علی اللیل)

کیسی عمدہ تعبیر ہے اگر انسان کرۂ زمین سے باہر بیٹھا ہوا ہو اور زمین کی خود اپنے گرد حرکت وضعی کا منظر اور اس کے گرد رات اور دن پیدا ہونے کو دیکھے تو اسے نظر آئے گا کہ گویا مرتب طور پر ایک طرف سے رات کی سیاہ رنگ کی نوار دن کی روشنی پر لپٹی جارہی ہے اور دوسری طرف سے دن کی سفید رنگ کی نوار رات کی سیاہی پر لپٹی جارہی ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "یکور" "تکویر" کے مادہ سے لپیٹنے کے معنی میں ہے اور اربابِ لغت خصوصیت کے ساتھ عمامہ اور دستار سر کے گرد لپیٹنے کو اس کا ایک نمونہ شمار کرتے ہیں تو اس سے ایک نکتہ جو اس قرآنی تعبیر میں پوشیدہ ہے واضح ہوجاتا ہے، اگرچہ بہت سے مفسرین نے اس نکتہ کی طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے مطالب بیان کیے ہیں جو "تکویر" کے مفہوم سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے۔ نکتہ یہ ہے کہ زمین کروی (گول) شکل کی ہے اور اپنے گرد حرکت کرتی ہے اور اس گردش کے زیر اثر رات کی سیاہ نوار اور دن کی سفید نوار ہمیشہ اس کے گرد چکر لگاتی ہے گویا ایک طرف سے سفید نوار سیاہ پر اور دوسری طرف سے سیاہ نوار سفید پر لپیٹی جارہی ہے۔

بہرحال قرآن مجید نور وظلمت اور رات دن پیدا ہونے کے بارے میں مختلف تعبیریں پیش کرتا ہے جن میں سے ہر ایک کسی ایک نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس کی طرف ایک خاص زاویے سے دیکھتی ہے۔

کبھی کہتا ہے:

یولج اللیل فی النھار و یولج النھار فی اللیل

رات کو دن میں تدریجاً داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ (فاطر ـــــ ۱۳)

یہاں رات کے دن میں اور دن کے رات میں چپکے چپکے بغیر کسی شور وشین کے داخل ہونے کے متعلق گفتگو ہے۔

اور کبھی کہتا ہے:

یغشی اللیل النھار

خدا رات کے ظلمانی پردے دن کو پہنا دیتا ہے۔ (اعراف ـــــ ۵۴)

یہاں رات کو ظلمانی پردوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو گویا دن کی روشنی پر پڑتے ہیں اور اسے چھپا دیتے ہیں۔

زیر بحث آیات میں "تکویر" اور ان دونوں کے ایک دوسرے میں لپیٹے جانے سے متعلق گفتگو ہے جبکہ اس میں بھی ایک نکتہ ہے جس کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ ہوچکا ہے۔

اس کے بعد اس جہان کی تدبیر ونظم کے ایک گوشے کو بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس نے سورج اور چاند کو اپنے فرمان کا مسخر قرار دیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک معین مدت تک اپنی حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہے (و سخر الشمس والقمر کل

یجری لاجل مسمّٰی)۔

وہ حرکت جو خورشید کا نور خود اپنے گرد کرتی ہے یا اسی حرکت میں کہ جس میں وہ سارے نظامِ شمسی کے ساتھ کہکشاں کے ایک خاص نقطے کی طرف بڑھ رہا ہے، معمولی سے معمولی بدنظمی بھی دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی چاند کی اپنی حرکت میں جو وہ زمین کے گرد کرتا ہے یا خود اپنے گرد گھومتا ہے (کوئی بدنظمی ہوتی ہے) بلکہ سب کے سب اس کے مطیعِ فرمان ہیں۔ اس کے (آفرینش کے قوانین کے) مسخر ہیں اور اپنی عمر کے اختتام تک اپنی یہی کیفیت جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ سورج اور چاند کے مسخر ہونے سے مراد ان کا پروردگار کے اذن سے انسان کے لیے مسخر ہونا ہو۔ جیسا کہ سورۂ ابراہیم کی آیہ ۳۲ میں ہے:

وسخر لکم الشمس والقمر دائبین

اس نے سورج اور چاند کو جو ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے۔

لیکن زیرِ بحث آیت کے جملوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور اس بات کی طرف توجہ کرنے سے بھی کہ "لکم" کی تعبیر زیرِ بحث آیت میں نہیں ہے، یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

آیت کے آخر میں مشرکین کو ——— بازگشت اور لطف و عنایت کی راہ کھلا رکھنے کے ساتھ ساتھ ——— تہدید کے طور پر فرمایا گیا ہے: جان لو کہ وہ عزیز و غفار ہے (الا ھو العزیز الغفار)۔

اس کی بے انتہا عزت و قدرت کی بنا پر کوئی گنہ گار اور مشرک اس کے عذاب کے پنجے سے بھاگ کر نہیں نکل سکتا اور وہ اپنی غفاریت کے تقاضے سے توبہ کرنے والوں کے عیوب اور گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور انھیں اپنی رحمت کے سایے تلے لے لیتا ہے۔

"غفار" مبالغے کا صیغہ ہے "غفران" کے مادہ سے جو اصل میں ایسی چیز کو چھپانے کے معنی میں ہے جو انسان کو آلودگی سے محفوظ رکھے اور جس وقت یہ خدا کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ نادم اور پشیمان بندوں کے عیوب اور گناہوں کو چھپا دیتا ہے اور انھیں عذاب اور کیفرِ کردار سے بچا لیتا ہے۔ ہاں! وہ صاحبِ عزت و قدرت کے ساتھ ساتھ غفار بھی ہے اور رحمت و غفران کے ساتھ ساتھ "قہار" بھی ہے۔ آیت کے آخر میں ان دونوں اوصاف کا بیان بندوں میں خوف و رجاء کی حالت پیدا کرنے کے لیے ہے جو ہر قسم کے تکامل و ارتقاء کی تحریک کا اصلی عامل ہے۔

۶۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝

۷۔ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۖ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

ترجمہ

۶۔ اس نے تمھیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کی بیوی کو اس (کی باقی ماندہ گیلی مٹی) سے پیدا کیا اور تمھارے لیے آٹھ جوڑے چوپایوں میں سے نازل کیے وہ تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تاریکیوں کے اندر، ایک کے بعد دوسری خلقت عطا کرتا ہے۔ یہ ہے تمھارا پروردگار خدا، (عالم ہستی کی) حکومت اسی کے لیے ہے، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ پھر تم (اس حال میں) راہِ حق سے کس طرح منحرف ہوتے ہو؟

۷۔ اگر تم کفران کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے کبھی بھی کفران کو پسند نہیں کرتا اور اگر تم اس کا شکر ادا کرو گے تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرتا ہے اور کوئی گنہ گار کسی دوسرے کا گناہ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا۔ اس کے بعد تم سب کی واپسی تمھارے پروردگار کی طرف ہے اور جو کچھ تم انجام دیا کرتے تھے وہ اس سے تمھیں آگاہ کرے گا، کیونکہ جو کچھ سینوں میں ہے وہ اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

سب کی ایک ہی نفس سے پیدائش

ان آیات میں پھر آفرینش الٰہی کی عظمت کی نشانیوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے اور انسانوں کے لیے اس کی طرح طرح کی نعمتوں کا حصہ بیان کیا جا رہا ہے۔

پہلے انسان کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا نے تم سب کو ایک ہی شخص سے پیدا کیا ہے، پھر اس کی بیوی کو اس سے پیدا کیا (خلقکم من نفس واحدة ثم جعل منها زوجها)۔

تمام انسانوں کی ایک ہی نفس سے خلقت دراصل ہمارے پہلے جدِ امجد حضرت آدمؑ کی خلقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تمام انسان خلقت کے تنوع، مختلف اخلاق و عادات اور مختلف استعداد اور ذوق کے ساتھ ایک ہی جڑ کی طرف لوٹتے ہیں، کہ جو "آدم" ہے۔

"ثم جعل منها زوجها" دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے پہلے آدم کو خلق کیا پھر اس کے بعد اس کی بیوی کو اس کی باقی ماندہ مٹی سے پیدا کیا۔[1]

اس حساب سے حوّا کی خلقت آدم کی خلقت کے بعد اور اولادِ آدم کی خلقت سے پہلے ہوئی۔

لفظ "ثم" ہمیشہ تاخیرِ زمانی کے لیے نہیں آتا بلکہ کبھی تاخیرِ بیان کے لیے بھی آتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں: ہم نے تمھارا آج کا کام دیکھا پھر تمھارا کل کا کام بھی دیکھا۔ حالانکہ گزشتہ کل کے اعمال مسلماً آج کے اعمال سے پہلے واقع ہوئے ہیں، لیکن ان کا ذکر بعد کے مرحلے میں ہوا۔

یہ جو بعض نے اس تعبیر کو آدم کی خلقت کے بعد اور حوّا کی خلقت سے پہلے عالمِ ذر میں اولادِ آدم کی چیونٹیوں کی شکل میں خلقت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، درست نہیں ہے۔ اس بات کو ہم سورۂ اعراف کی آیہ ۱۷۲ کے ذیل میں "عالمِ ذر" کی تفسیر میں

---

[1] درحقیقت مذکورہ بالا جملے میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے:
خلقکم من نفس واحدة خلقها ثم جعل منها زوجها

بیان کر چکے ہیں [1]

یہ نکتہ بھی یاد دہانی کے قابل ہے کہ آدم کی بیوی کی خلقت خود آدم کے وجود کے اجزا سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی بچی ہوئی گیلی مٹی سے ہوئی تھی۔ جیسا کہ روایات میں اس کی تصریح موجود ہے لیکن وہ روایت جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حوا آدم کی آخری بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہیں ایک بے بنیاد بات ہے جو اسرائیلیات میں سے ہے اور اس مطلب کے ساتھ ہم آہنگ ہے کہ جو موجودہ تحریف شدہ تورات کے سفرِ تکوین کی دوسری فصل میں موجود ہے اور اس سے قطع نظر وہ مشاہدہ اور حس کے بھی برخلاف ہے کیونکہ اس روایت کے مطابق آدم کی ایک پسلی اٹھا دی گئی اور اس سے حوا پیدا ہوئیں، اس لیے مردوں کے بائیں طرف کی ایک پسلی کم ہوتی ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ مرد اور عورت کی پسلیوں کی تعداد میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ فرق ایک افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

اس کے بعد چوپایوں کی خلقت کا ذکر ہے کہ جو انسانوں کی زندگی کے اہم وسائل میں سے ہیں۔ چوپائے ایک طرف تو دودھ اور گوشت کے لیے کام آتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے چمڑے اور بالوں سے لباس اور زندگی کی دوسری ضروریات تیار کی جاتی ہیں۔ نیز سواری اور حمل و نقل کے لیے انسان ان سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمھارے لیے چوپایوں کے آٹھ جوڑے نازل کیے (و انزل لکم من الانعام ثمانیۃ ازواج)۔

آٹھ جوڑوں سے مراد گوسفند، بکری، اونٹ اور گائے کے نر اور مادہ ہیں۔ چونکہ لفظ "زوج" ہر جنس کے نر اور مادہ دونوں کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مجموعی طور پر ۸ زوج ہوں گے (اگرچہ ہماری روزمرہ کی زبان میں "زوج" جوڑے کو کہا جاتا ہے، لیکن عربی زبان میں ایسا نہیں ہے) اسی لیے اس آیت کی ابتداء میں حضرت آدم کی بیوی کو زوج کہا گیا ہے۔

"انزل لکم" (تمھارے لیے نازل کیا) کی تعبیر، جو چوپایوں کے بارے میں ——— جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے ——— اوپر کی طرف سے نیچے کی طرف بھیجنے کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے موقع پر یہ لفظ "نزول مقامی" کے معنی میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی نعمت ہے جو برتر مقام اور بالاتر ہستی کی طرف سے پست تر مخلوق کو عطا کی گئی ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہاں "انزال" "نزل" (بروزنِ رسل) کے مادہ سے، مہمان کی پذیرائی کرنے یا اس پہلی چیز کے معنی میں ہے جو مہمان کی دعوت اور پذیرائی کے لیے لائی جائے۔ جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۹۸ میں جنتیوں کے بارے میں ہے۔

خالدین فیھا نزلاً من عند اللہ

وہ ہمیشہ ہمیشہ بہشت میں رہیں گے یہ خدا کی طرف سے پذیرائی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ چوپائے اگرچہ اوپر کی طرف سے نہیں اترتے لیکن ان کی حیات و پرورش کے مقدمات یعنی بارش کے حیات بخش قطرات اور سورج کی حیات بخش شعاعیں اوپر سے زمین کی طرف آتی ہیں۔

اس تعبیر کی ایک چوتھی تفسیر بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ابتداء میں تمام موجودات عالمِ غیب میں پروردگار کے علم و قدرت کے

---

[1] جلد ۷ کی طرف رجوع کریں۔

خزانے میں تھیں۔ اس کے بعد وہ مقامِ غیب سے مقامِ شہود وظہور میں پہنچی ہیں۔ اس لیے اسے "انزال" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ حجر کی آیہ ۲۱ میں ہے:

وان من شیء الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم

ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ایک معین ومعلوم اندازے کے مطابق ہی اس میں سے نازل کرتے ہیں[1]

البتہ پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ اگرچہ ان تفاسیر کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ممکن ہے کہ یہ سب آیت کے مفہوم میں داخل ہوں۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علیؑ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

انزاله ذالك خلقه اياه

چوپایوں کے آٹھ جوڑے نازل کرنے کا معنی خدا کی طرف سے ان کی خلقت ہی ہے۔

یہ حدیث بھی ظاہراً پہلی تفسیر کی طرف ہی اشارہ ہے، کیونکہ خدا کی طرف سے خلقت ایک ایسی خلقت ہے جو ایک برتر مقام کی طرف سے ہے۔

بہرحال اگرچہ موجودہ زمانے میں چوپایوں سے حمل ونقل کا بہت کم کام لیا جاتا ہے لیکن ان کے دوسرے اہم فائدے نہ صرف یہ کہ گزشتہ زمانے کی نسبت کم نہیں ہوئے بلکہ ان میں اور بھی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ آج بھی انسانوں کی غذا کا بہترین حصہ چوپایوں ہی کے دودھ اور گوشت سے حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ لباس اور دوسری ضروریاتِ زندگی بھی انھی کے بالوں اور چمڑے سے تیار کی جاتی ہیں۔ اسی بنا پر دنیا کے بڑے بڑے ممالک کی آمدنی کا ایک اہم حصہ انھیں جانوروں کی پرورش سے صورت پذیر ہوتا ہے۔

اس کے بعد آفرینشِ الٰہی کے مختلف طریقوں میں سے ایک اور طریقہ کو بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے جنین کی خلقت کے مختلف مراحل۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تاریکیوں کے پردے میں ایک کے بعد دوسری خلقت، اور ایک کے بعد دوسری آفرینش عطا کرتا ہے (یخلقکم فی بطون امهاتکم خلقاً من بعد خلق فی ظلمات ثلاث)۔

یہ بات کہے بغیر ہی ظاہر ہے کہ "خلقاً من بعد خلق" سے مراد مکرر پے درپے اور یکے بعد دیگرے کئی خلقتیں ہیں نہ کہ صرف دو خلقتیں۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ "یخلقکم" اس بنا پر کہ فعل مضارع ہے، استمرار پر دلالت کرتا ہے اور جنین کے ایک دوسرے سے مختلف اور عجیب وغریب اور حیرت انگیز مرحلوں اور اس میں ان عجیب تبدیلیوں کے واقع ہونے کی طرف ایک مختصر اور پُرمعنی اشارہ ہے، جو ماں کے پیٹ میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جنین شناس علماء کے بقول یہ سب کچھ پروردگار کی آفرینش کے نمونوں میں سے عجیب ترین اور ظریف ترین ہے۔ یہاں تک کہ جنین شناسی کا علم، توحید اور خدا شناسی کا ایک مکمل دورہ شمار ہوتا ہے اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو

---

[1] تفسیر المیزان "روح المعانی" زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

ان مسائل کی باریکیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی ان کے پیدا کرنے والے کی حمد و ستائش نہ کرنے لگیں۔

"ظلمات ثلاث" (تین تاریکیوں) کی تفسیر شکم مادر کی تاریکی، رحم کی تاریکی اور مشیمہ (وہ مخصوص تھیلی جس میں جنین ہوتا ہے) کی تاریکی ہے جو حقیقت میں تین مخیم اور دبیز پردے ہیں جو "جنین" کے اوپر پڑے ہوئے ہیں۔

عام تصویر بنانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل نور اور روشنی کے سامنے تصویر بنائیں لیکن انسان کا پیدا کرنے والا اس عجیب اندھیری جگہ میں پانی پر اس طرح نقش و نگار اور تصویر بناتا ہے کہ سب اسے دیکھ کر محو ہو جاتے ہیں اور ایسے مقام پر جہاں کسی بھی قسم کی دسترس کسی کی طرف سے نہیں ہے، اس کی روزی اور رزق لگاتار پہنچاتا ہے تاکہ وہ تیزی کے ساتھ نشو و نما پائے اور اس وقت اس امر کا وہ سخت محتاج ہوتا ہے۔

سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی ایک مشہور دعائے عرفہ ہے جو درس توحید کا ایک کامل و عالی دورہ ہے۔ اس میں آپؑ خدا کی نعمتوں اور اس کی قدرتوں کو شمار کرتے وقت، اس کی بارگاہ میں اس طرح عرض کرتے ہیں:

وابتدعت خلقی من منی یمنی، ثم اسکنتنی فی ظلمات ثلاث، بین لحم وجلد و دم، لم تشهد بخلقی، ولم تجعل الی شیئا من امری، ثم اخرجتنی الی الدنیا تاما سویا

میری خلقت و آفرینش کی ابتداء منی کے ناچیز قطرات سے قرار دی۔ پھر مجھے تین تاریکیوں کے اندر گوشت، پوست اور خون کے درمیان ساکت کر دیا۔ میری خلقت کو تو نے آشکار نہیں کیا اور اس پوشیدہ جگہ پر میری خلقت کو مختلف مراحل میں جاری رکھا اور میری زندگی کے امور میں سے کسی ایک کو بھی میرے سپرد نہیں کیا۔ پھر مجھے کامل و سالم دنیا میں منتقل کر دیا[1]

(جنین کے دور اور اس کے مختلف مراحل کی خلقت کے بارے میں جلد ۲ میں سورہ آل عمران کی آیہ ۶ کے ذیل میں اور جلد ۱۴ میں سورۂ حج کی آیہ ۵ کے ذیل میں ہم نے گفتگو کی ہے۔)

تین توحیدی حلقوں انسانوں کی خلقت، چوپایوں کی پیدائش اور جنین کی مختلف حالتوں اور مرحلوں کے بارے میں بیان کرنے کے بعد آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ ہے تمہارا پروردگار خدا، تمام عالم ہستی کی حکومت اسی کے لیے ہے۔ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر (ایسے میں) تم راہ حق سے کس طرح منحرف ہوتے ہو (ذالکم الله ربکم له الملک لا اله الا هو فانی تصرفون)۔

گویا انسان کو توحید کے ان عظیم آثار کے مشاہدہ کے بعد پروردگار کے مقام شہود تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد اپنی مقدس ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ ہے تمہارا خدا، معبود اور پروردگار، اور واقعاً اگر چشم بینا ہو تو اسے ان آثار کی اوٹ میں اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ سر والی آنکھ تو آثار کو دیکھتی ہے اور دل والی آنکھ آثار کے پیدا کرنے والے کو۔ ؎

باصد ہزار جلوہ برون آمدی کہ من — باصد ہزار دیدہ تماشا کنم ترا

---

[1] دعائے عرفہ (مصباح الزائر ابن طاؤس)

تُو تو ایک لاکھ جلووں کے ساتھ باہر آیا ہے اور میں بھی ایک لاکھ آنکھوں سے تجھے دیکھ رہا ہوں۔

"ربکم" کی تعبیر اور اسی طرح "لہ الملک" کی تعبیر حقیقت میں خدا کی ذاتِ پاک ہی میں معبود منحصر ہونے کی ایک دلیل ہے جو "لا الٰہ الا ھو" میں بیان ہوئی ہے۔ (غور کیجیے گا)

جب خالق وہی ہے تو مالک و مربی بھی وہی ہے، تمام عالمِ ہستی کی مالکیت بھی اسی کے لیے ہے۔ پھر اس کے سوا کسی اور کا کون سا نقش ہے کہ اسے عبودیت کے لائق سمجھا جائے؟

یہ وہ منزل ہے کہ گویا وہ ایک سوئی ہوئی جماعت اور ایک غافل اور ہر چیز سے بے خبر گروہ کو پکار کر کہتا ہے، فانّٰی تصرفون۔ اس حالت میں تم کس طرح غافل ہوئے اور راہِ توحید سے منحرف ہو گئے ہو؟[1]

پروردگار کی ان عظیم نعمتوں کے ذکر کے بعد اگلی آیت میں شکر و کفران کے حوالے سے اس کے مختلف پہلوؤں کو مورد مطالعہ قرار دیا گیا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: تمھارے کفران اور شکر کا نتیجہ تمھاری ہی طرف لوٹتا ہے اور اگر تم کفران کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے (اور اسی طرح اگر تم اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ گے تو اسے اس کی بھی احتیاج نہیں ہے) (ان تکفروا فان اللہ غنیّ عنکم)۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: پروردگار کی یہ بے نیازی اور غنا اس سے مانع نہیں ہے کہ تمھیں شکر کا ذمہ دار قرار دے اور کفران سے روک دے۔ چونکہ فریضہ خود ایک لطف اور ایک دوسری نعمت ہے۔ ہاں! وہ اپنے بندوں سے ہرگز کفرانِ نعمت پسند نہیں کرتا اور اگر اس کا شکر بجالاؤ تو وہ یہ تمھارے لیے پسند کرتا ہے (ولا یرضٰی لعبادہ الکفر و ان تشکروا یرضہ لکم)۔[2]

ان دو مطالب کو بیان کرنے کے بعد اس سلسلے کا تیسرا مسئلہ پیش کیا گیا ہے اور وہ ہے ہر شخص کی اس کے اپنے عمل پر باز پرس۔ کیونکہ ذمہ داری اور "تکلیف" کا مسئلہ اس مطلب کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے: کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا (ولا تزر وازرۃ وزر اخرٰی)۔

اور چونکہ ذمہ داری جزاء و سزا کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لہٰذا چوتھے مرحلے میں معاد کے مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پھر تم سب کی واپسی تمھارے پروردگار کی طرف ہوگی اور وہ تمھیں ان چیزوں سے آگاہ کرے گا جنھیں تم انجام دیا کرتے تھے (ثم الٰی ربکم مرجعکم فینبئکم بما کنتم تعملون)۔

اور چونکہ محاسبہ اور جزا کا مسئلہ پوشیدہ بھیدوں سے آگاہی کے بغیر ممکن نہیں ہے لہٰذا آیت کو اس جملہ پر ختم کیا گیا ہے۔ "وہ ان تمام باتوں سے آگاہ ہے جو سینوں میں چھپی ہوئی ہیں اور جو کچھ سینوں پر حکم فرما ہے (انہ علیم بذات الصدور)۔

---

[1] توجہ رکھیں کہ "انی" کبھی "این" (کہاں) اور کبھی "کیف" (کس طرح) کے معنی میں آتا ہے۔

[2] لفظ "یرضہ" مشہور قرأت میں ہاء کی پیش کے ساتھ ضمیر کے اشباع کے بغیر پڑھا جاتا ہے کیونکہ اصل میں یہ "یرضاہ" تھا۔ الف جزم کی وجہ سے گر گیا اور "یرضہ" ہو گیا ہے۔ یعنی طور پر توجہ رکھنا چاہیے کہ یہ ضمیر شکر کی طرف لوٹتی ہے۔ اگرچہ قبل کی عبارت میں شکر کا لفظ صراحت کے ساتھ نہیں آیا۔ لیکن "ان تشکروا" اس پر دلالت کرتا ہے جیسے "اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی" کی ضمیر عدالت کی طرف لوٹتی ہے۔

اس طرح سے ذمہ داری اور اس کی خصوصیات اور اسی طرح انسانوں کی مسئولیت اور جزا و سزا کا فلسفہ مجموعی طور پر مختصر جملوں میں ایک نظم و ترتیب کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

ضمنی طور پر یہ آیت مکتب جبر و اکراہ کے طرفداروں کا ایک دندان شکن جواب ہے۔ باعثِ افسوس ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں میں کم نہیں ہیں۔ صراحت کے ساتھ قرآن کہتا ہے: وہ اپنے بندوں کے کفران کرنے پر ہرگز راضی نہیں ہے۔ یہ بات خود ایک واضح دلیل ہے کہ اس نے کافروں کے بارے میں کبھی بھی کفر کا ارادہ نہیں کیا ہے (جیسا کہ مکتب جبر کے پیروکار کہتے ہیں) کیونکہ جب وہ کسی چیز سے راضی نہیں ہے تو یقیناً اس کا ارادہ بھی نہیں کرے گا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کا ارادہ اس کی رضا سے جُدا ہو؟

تعجب تو ان متعصب لوگوں پر ہے جو اس واضح عبارت پر پردہ پوشی کرنے کے لیے چاہتے ہیں کہ لفظ "عباد" کو مومنین یا معصومین میں محصور کر دیں۔ حالانکہ یہ لفظ مطلق ہے اور واضح طور پر تمام بندوں کے لیے ہے۔ ہاں! خدا کفر و کفران اپنے بندوں میں سے کسی کے لیے بھی پسند نہیں کرتا۔ جیسا کہ بغیر کسی استثناء کے ان سب کے لیے شکر کو پسند کرتا ہے[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہر شخص کی، اس کے اعمال کے مقابلہ میں اصل مسئولیت، منطقی اصول کے مطابق اور تمام ادیان آسمانی کے مسلّمات میں سے ہے[2]

البتہ کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کسی دوسرے کے جرم میں شریک ہو لیکن یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہ کسی طرح سے اس عمل کے مقدمات یا خود اس عمل کے ایجاد کرنے میں دخل رکھتا ہو۔ ان لوگوں کے مانند جو کوئی بُری بدعت قائم کر جاتے ہیں یا کسی قبیح و غلط رسم کی بنیاد ڈال جاتے ہیں۔ تو جو شخص بھی اس پر عمل کرے گا، اس کا گناہ "مسبب اصلی" کے لیے بھی لکھا جائے گا۔ بغیر اس کے کہ اس پر عمل کرنے والوں کے گناہ میں کسی چیز کی کمی ہو[3]

---

[1] "شکر" اس کی اہمیت، اس کا فلسفہ، اس کا مفہوم حقیقی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ہم جلد ۱۰ میں سورۂ ابراہیم کی آیہ ۵ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

[2] اس سلسلے میں بھی جلد ۱۲ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۱۵ کے ذیل میں گفتگو ہو چکی ہے۔

[3] اس سلسلے میں بھی جلد ۶ میں سورۂ انعام کی آیہ ۶۴ کے ذیل میں ہم نے بحث کی ہے۔

تفسیر

کیا عالم وجاہل برابر ہیں ؟

گزشتہ آیات میں توحید استدلالی اور آفاق وانفس میں عظمتِ خدا کی نشانیوں کے حوالے سے معرفتِ پروردگار کے متعلق گفتگو تھی۔ زیرِ بحث آیات میں پہلے توحید فطری کی بات کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ انسان عقل وخرد اور نظام آفرینش کے مطالعے سے جو کچھ درک کرتا ہے وہ فطری طور پر اس کی روح کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ مشکلات اور حوادث کے طوفانوں میں یہ توحید فطری خود کو ظاہر کر دیتی ہے لیکن فراموش کار انسان طوفانِ حوادث گزر جانے کے بعد دوبارہ غفلت وغرور میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

فرمایا گیا ہے: جس وقت انسان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے (تو نورِ توحید اس کے دل میں جگمگا اٹھتا ہے اور وہ) اپنے پروردگار کو پکارتا ہے۔ اس حال میں وہ اسی کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنے گناہ اور غفلت پر پشیمان ہوتا ہے (و اذا مس الانسان ضر دعا ربہ منیبا الیہ)۔

لیکن جب خدا اپنی طرف سے کوئی نعمت اسے عطا کرتا ہے تو وہ گزشتہ ابتلاء اور مشکلات کو بھول جاتا ہے جن کی وجہ سے لطفِ الٰہی کے دامن سے وابستہ ہوا (ثم اذا خولہ نعمۃ منہ نسی ما کان یدعوا الیہ من قبل)۔[1]

وہ خدا کے لیے شریک اور شبیہ بنا لیتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں تاکہ اپنی گمراہی کے علاوہ لوگوں کو بھی راہِ خدا سے منحرف کر دیں (و جعل للہ اندادا لیضل عن سبیلہ)۔

یہاں انسان سے مراد عام انسان اور انبیاء کی تعلیمات کے سایے میں تربیت نہ پانے والے انسان ہیں۔ ورنہ مردانِ حق کے ہاتھوں تربیت پانے والے انسان خود ان کی طرح "سراء" و "ضراء" میں تکالیف وراحت میں اور ناکامیوں اور کامیابیوں میں ہمیشہ اس کی یاد میں رہتے ہیں اور اس کے دامنِ لطف سے وابستہ رہتے ہیں۔

یہاں "ضُر" سے مراد ہر قسم کا گزند، نقصان، ناراحتی اور تکلیف ہے چاہے وہ جسمانی پہلو سے ہو یا روحانی سے۔

---

[1] "نسی ما کان یدعوا الیہ" میں "ما" کیا معنی دیتا ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بحث ہے۔ ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ یہ "ما" موصولہ ہے اور "ضر" کی طرف اشارہ ہے (یہ معنی تمام معانی میں سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے، اور سطورِ بالا میں ہم نے اسی کو انتخاب کیا ہے)۔ بعض اسے "اللہ" کے معنی میں لیتے ہیں۔ بعض اسے "ما مصدریہ" اور دعاء کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ سورۂ یونس کی آیہ ۱۲ میں ہے۔

و اذا مس الانسان الضر دعانا لجنبہ او قاعدا او قائما فلما کشفنا عنہ ضرہ مر کان لم یدعنا الی ضر مسہ

(اس [illegible] کر لیا جائے تو یہ آیت بھی ہمارے مذکورہ پہلے معنی کے لیے ایک شاہد ہے۔

"خوّلہ" "خول" (بروزنِ "عمل") کے مادہ سے، کسی چیز سے سرکشی اور ہمیشہ کی پریشانی کے معنی میں ہے اور چونکہ اس قسم کی مخصوص توجہ کا لازمہ عطا و بخشش ہے۔ اس لیے یہ مادہ "بخشنے" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ایک گروہ نے یہ بھی کہا ہے کہ "خَول" (بروزنِ "عمل") خدمت گزاری کے معنی میں بھی آیا ہے اس بنا پر "خوّلہ" کا معنی یہ ہوگا کہ "اسے خدمت گزار بخشا" اور پھر ہر قسم کی نعمت بخشنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

بعض نے اس مادہ کو فخر و مباہات کے معنی میں سمجھا ہے۔ اس بنا پر مذکورہ جملے کا مطلب ہے کسی کو عطائے نعمت کے ذریعے مفتخر بنانا۔[1]

مجموعی طور پر یہ جملہ عطا و بخشش کے علاوہ خدا کی خاص توجہ اور عنایت کو بھی بیان کرتا ہے۔

"منیبًا الیہ" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان سخت حالات میں جبکہ غرور و غفلت کے تمام پردے ہٹ جاتے ہیں، تو خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے اس سب کو چھوڑ کر خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور "انابۃ" اور بازگشت کے مفہوم میں یہ حقیقت بھی چھپی ہوئی ہے کہ انسان کا اصلی مقام اور اس کا مبدا و مقصد بھی خدا ہی تھا۔

"انداد" "ند" (بروزن "مد") کی جمع ہے اور مثل و مانند کے معنی میں ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ "مثل" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ لیکن "ند" کسی چیز کی حقیقت اور اس کے جوہر میں مماثلت کے معنی میں ہے۔

"جعل" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان اپنے وہم و گمان اور خیالِ خام سے خدا کے لیے مثل و مانند تراشتا ہے اور جعل کرتا ہے یعنی وہ چیز جو کسی طرح بھی حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتی۔

"لیضل عن سبیلہ" اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مغرور و گمراہ لوگ صرف اپنی ہی گمراہی پر بس نہیں کرتے بلکہ وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس وادی کی طرف کھینچ لے جائیں۔

بہرحال قرآن مجید کی آیات میں توحید فطری اور زندگی کے سخت حوادث کا ربط بارہا بیان کیا گیا ہے، کیونکہ یہ حوادث اس کی تجلّی گاہیں ہیں ——— نیز اس مغرور انسان کی بدل جانے والی حالت اور کم ظرفی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ انسان طوفانوں میں تو توحیدِ خالص اور رنگِ الٰہی کو اپنا لیتا ہے اور طوفان کے رکتے ہی اس رنگ کو بدل دیتا ہے، یا اور ہٹ دھرمی سے شرک کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے۔

ایسے متلون مزاج افراد کس قدر زیادہ ہیں اور ایسے لوگ کتنے کم ہیں کہ جن میں کامیابیاں نعمتیں، راحت و آرام اور طوفانِ حوادث کسی قسم کا کوئی تغیر پیدا نہیں کرتے۔

ہاں! ایک پانی کا برتن یا ایک چھوٹا سا لوٹا معمولی سی ہوا سے اُلٹ جاتا ہے لیکن ایک بڑا سمندر اپنی عظمت کی وجہ سے سخت طوفانوں کے مقابلے میں بھی اپنی جگہ پر رہتا ہے اور اسی وجہ سے اس نے اپنے لیے آرام کا نام اپنایا ہوا ہے۔

آیت کے آخر میں ایسے انسان کو صریح، قاطع اور زوردار تہدید کے ساتھ مخاطب کرنے کے لیے قرآن کہتا ہے: اس سے کہہ دے:

---

[1] لسان العرب، مفردات راغب اور تفسیر روح المعانی کی طرف رجوع کریں۔

تو اپنے کفر اور کفران سے تھوڑا سا فائدہ اٹھالے، چند دن اور غفلت اور غرور میں بسر کرلے لیکن یہ جان لے کہ آخرکار تو اصحابِ دوزخ سے ہے (قل تمتع بکفرك قلیلاً انك من اصحاب النار)۔

کیا اس قسم کے کوتاہ فکر گمراہ اور گمراہ کرنے والے انسان کا انجام اس کے علاوہ بھی کچھ ہوسکتا ہے؟

بعد والی آیت میں موازنہ کیا جارہا ہے اور یہ مختلف مسائل سمجھانے میں قرآن کی جانی پہچانی روش ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا ایسا شخص قدر و قیمت والا ہے یا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں پروردگار کی عبادت اور سجدہ و قیام میں مشغول رہتا ہے، اس کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے، عذابِ آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کی امید رکھتا ہے (امّن هو قانت اٰناء اللیل ساجدًا و قائمًا یحذر الاٰخرة و یرجوا رحمة ربه)۔[1]

کہاں وہ مشرک و فراموش کار، مشکوک مزاج، گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا انسان اور کہاں یہ بیدار، نورانی اور باصفا دل والا انسان۔ کہ جس وقت رات کی تاریکی میں غافلوں کی آنکھیں نیند میں بند ہوتی ہیں، وہ اپنی پیشانی کو اپنے محبوب کی چوکھٹ پر رکھے ہوئے ہوتا ہے اور خوف و رجاء کے ساتھ اسے پکار رہا ہوتا ہے۔

ایسے افراد نہ تو نعمت کے وقت اپنے آپ کو سزا سے امان میں سمجھتے ہیں اور نہ ہی بلاء و مصیبت کے وقت اس کی رحمت سے قطعِ امید کرتے ہیں اور یہ دونوں عوامل ان کے وجود کو ہمیشہ اور مسلسل متحرک رکھتے ہوئے ہوش اور احتیاط کے ساتھ، دوست کی طرف لے جاتے ہیں۔

"قانت" "قنوت" کے مادہ سے، خضوع کے ساتھ اطاعت میں لگے رہنے کے معنی میں ہے۔

"اٰناء" "انا" (بروزن "صدا" و "فنا") کی جمع ہے۔ ساعت اور وقت کی کچھ مقدار کے معنی میں ہے۔

رات کی ساعت اور گھڑی کا ذکر اس بنا پر ہے کہ اس وقت حضورِ قلب زیادہ اور ریا سے آلودگی دیگر اوقات کی نسبت بہت کم ہوتی ہے۔

"ساجدًا" کو "قائمًا" پر اس وجہ سے مقدم رکھا ہے کیونکہ سجدہ عبادت کا بالاتر مرحلہ ہے۔ نیز رحمت کا مطلع ہونا اور اس کا آخرت کے ساتھ مشروط نہ ہونا، خدا کی رحمت کی وسعت اور دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں اس کی موجودگی کی دلیل ہے۔

ایک حدیث میں جو علل الشرائع میں امام باقرؑ سے اور اسی طرح کتابِ کافی میں آپ ہی سے نقل ہوئی ہے، بیان ہوا ہے کہ یہ آیت (اَمّن هو قانت اٰناء اللیل) نمازِ شب کے معنی میں ہے۔[2]

یہ بات واضح ہے کہ یہ تفسیر بھی بہت سی دوسری تفاسیر کی طرح ویسے ہی ایک واضح مصداق کے مانند ہے جیسے قرآن کی مختلف آیات کے

---

[1] اس جملے میں محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے:
اهذا الذی ذکرناه خیر اَمن هو قانت اٰناء اللیل .....

[2] علل الشرائع اور کافی (نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۷۹ کے مطابق)

ذیل میں مصداق کے طور پر تفاسیر بیان ہوئی ہیں اور یہ آیت کے مفہوم کو نمازِ شب میں محدود نہیں کرتی۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کہہ دے کہ کیا علم والے اور بے علم برابر ہوتے ہیں (قل هل يستوي الذين يعلمون و الذين لا يعلمون)۔

نہیں: وہ یکساں نہیں ہیں۔ "صرف صاحبانِ فکر و نظر ہی ان سے متوجہ ہوتے ہیں" (انما يتذكر اولوا الالباب)۔

اگرچہ مذکورہ سوال ایک وسیع سوال ہے اور آگاہ و ناآگاہ اور صاحبانِ علم اور بے علم لوگوں کے درمیان ایک واضح موازنہ ہے۔

لیکن اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس سوال سے پہلے ایک اور سوال ہے اور وہ ہے مشرکین کے مومنین شب زندہ دار کے برابر نہ ہونے کے بارے میں۔ اس لیے دوسرا سوال بھی زیادہ تر اسی مسئلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ یہ ہٹ دھرم اور دل کے اندھے مشرک، ان پاک و روشن ضمیر اور مخلص مومنین کے برابر نہیں ہیں۔ کیا وہ ان افراد کے مساوی ہیں جو اس واضح و روشن حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں؟

بہرحال یہ جملہ جو استفہام انکاری سے شروع ہوا ہے اور اسلام کے اساسی اور بنیادی شعاروں میں سے ہے، جاہلوں کے مقابلے میں علم اور علماء کے مقام کی عظمت کو واضح کرتا ہے اور چونکہ یہ نابرابری مطلق صورت میں ذکر ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں گروہ نہ تو بارگاہِ خدا میں یکساں ہیں اور نہ ہی آگاہ مخلوق کی نظر میں، نہ دنیا میں ایک صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں اور نہ ہی آخرت میں، نہ ظاہر میں یکساں ہیں اور نہ ہی باطن میں۔

چند اہم نکات

ان دونوں آیتوں میں چند عمدہ نکات کی طرف کچھ لطیف اشارے موجود ہیں، جو تھوڑا سا غور کرنے پر واضح ہو جاتے ہیں ـــــ مثلاً۔

۱۔ پہلی آیت میں تلخ و ناگوار واقعات، دل کی آنکھ کے سامنے سے غرور و غفلت کے پردوں کے ہٹنے، نورِ ایمان کے جلوہ گر ہونے اور پروردگار کی طرف بازگشت اور توبہ و انابت کا ایک فلسفہ بیان ہوا ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے ایک جواب ہے جو زندگی کے تلخ حوادث کو پروردگار کی عدالت یا نظام آفرینش پر ایک اعتراض کی بات سمجھتے ہیں۔

۲۔ دوسری آیت عمل اور خود سازی کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور علم و معرفت پر جا کر ختم ہوتی ہے، کیونکہ جب تک خود سازی نہ ہو اس وقت تک نورِ معرفت دل میں نہیں چمکتا اور اصولی طور پر یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔

۳۔ "قانت آناء الليل" کی تعبیر جو اسمِ فاعل کی صورت میں آئی ہے "الليل" کے لفظ کے مطلق ہونے کی طرف

توجہ کرتے ہوئے ان کی خدا کی بارگاہ میں، عبودیت وخضوع کے دوام واستمرار کی دلیل ہے، کیونکہ اگر عمل میں دوام نہ ہو تو اس کی تاثیر بہت کم ہوتی ہے۔

۴۔ اضطراری علم وآگاہی، جو نزولِ بلا کے وقت حاصل ہوتی ہے اور انسان کا مبدء آفرینش کے ساتھ رشتہ قائم کردیتی ہے، اسی صورت میں علم کا مصداق بنتی ہے جبکہ وہ طوفان یا مشکل ختم ہونے پر بھی برقرار رہے۔ لہٰذا زیرِ بحث آیات ان لوگوں کو جاہلوں میں سے قرار دیتی ہیں جو بلاء ومصیبت کے وقت تو بیدار ہوجاتے ہیں لیکن اس کے بعد پھر فراموشی میں غرق ہوجاتے ہیں۔ اس بنا پر حقیقی عالم وہ ہیں جو ہر حالت میں اس کی طرف توجہ رکھتے ہیں۔

۵۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے: علم اور جہالت کے فرق کو بھی صاحبانِ فکر ونظر ہی سمجھتے ہیں کیونکہ جاہل تو علم کی قدر وقیمت کو جانتا ہی نہیں ہے۔ حقیقت میں علم کا ہر مرحلہ دوسرے مرحلے کے لیے مقدمہ اور تمہید ہے۔

۶۔ اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں علم کا معنی چند ایک اصطلاحات یا اشیاء کے درمیان مادی روابط اور اصطلاح کے مطابق مروّجہ علوم نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ایک خاص معرفت اور آگاہی ہے جو انسان کو "قنوت" یعنی پروردگار کی اطاعت، اس کی عدالت کا خوف اور اس کی رحمت کی امید کی طرف دعوت دیتی ہے۔ یہ ہے علم کی حقیقت اور مروّجہ علوم بھی اگر اس قسم کی معرفت کے لیے کارآمد ہوں تو علم ہیں اور اگر غرور وغفلت اور ظلم وفساد فی الارض کا سبب بنیں اور ان سے مذکورہ کیفیت اور خاص حالت حاصل نہ ہو تو پھر وہ قیل وقال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

۷۔ جو کچھ بے خبر لوگ خیال کرتے ہیں اور مذہب کو افیون سمجھتے ہیں، اس کے برخلاف انبیاء کی اہم ترین دعوت علم ودانش کی طرف ہی تھی اور انھوں نے جہالت سے اپنی بیزاری کا ہر جگہ اعلان کیا ہے۔ آیاتِ قرآنی نے اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ہر موقع سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ روایاتِ اسلامی میں بھی بہت سی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں کہ جن سے بالاتر علم کی اہمیت کا تصور نہیں ہوسکتا۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے:

لاخیر فی العیش الا لرجلین عالم مطاع او مستمع واع

زندگی کا سوائے دو اشخاص کے کوئی فائدہ نہیں ہے ایک وہ عالم جس کے نظریات وتعلیمات کا اجراء ہو اور دوسرے وہ طالب علم جو عالم کی بات کو کان دھر کے سُنے [1]

---

[1] کافی، جلد اوّل، باب "صفۃ العلم والفضلہ" حدیث ۱

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

ان العلماء ورثة الانبياء وذالك ان الانبياء لم يورثوا درهماً ولا ديناراً، وانما اورثوا احاديث من احاديثهم، فمن اخذ بشيء منها فقد اخذ حظاً وافراً، فانظروا علمكم هذا عمن تأخذونه فان فينا اهل البيت في كل خلف عدولا ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين

علماء انبیاء کے وارث ہیں کیونکہ انبیاء درہم و دینار اپنی یادگار کے طور پر نہیں چھوڑتے، بلکہ علوم و احادیث ان کی یادگار ہوتی ہیں جس شخص کے پاس اس میں سے کچھ حصہ ہو اس کے پاس میراثِ انبیاء کا فراواں حصہ ہے۔ اس کے بعد امامؑ مزید فرماتے ہیں: اب تم دیکھو کہ تم اپنا علم کس شخص سے اخذ کر رہے ہو (واقعی علماء سے یا علماء نما سے) جان لو کہ ہم اہلِ بیت میں سے ہر زمانے میں عادل اور قابلِ اعتماد افراد موجود رہتے ہیں جو غلو اور تجاوز کرنے والوں کی تحریف اور منحرف لوگوں کے بے بنیاد دعووں اور جاہلوں کی توجیہات کی اس پاک دین سے نفی کرتے ہیں[1]

۸۔ آخری آیت میں تین گروہوں کے بارے میں بات ہو رہی ہے: علماء، جہلاء اور اولوالالباب۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے ان تینوں گروہوں کی تفسیر میں بیان ہوا ہے:

نحن الذين يعلمون وعدونا الذين لا يعلمون وشيعتنا اولوا الالباب

عالم تو ہم ہیں اور ہمارے دشمن جاہل ہیں اور ہمارے شیعہ اولوالالباب ہیں[2]

یہ بات واضح ہے کہ یہ تفسیر آیت کے واضح مصداق کے بیان کے طور پر ہے اور آیت کے مفہوم کی عمومیت کی نفی نہیں کرتی۔

۹۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ امیر المومنین علیؑ ایک رات مسجدِ کوفہ سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے، جبکہ کمیل بن زیاد کہ جو آپ کے خاص دوستوں میں سے تھے، آپؑ کے ساتھ ساتھ تھے۔ اثنائے راہ میں ایک شخص کے گھر کے قریب سے گزرے۔ گھر سے قرآن کی تلاوت کی آواز آ رہی تھی اور وہ اس آیت کو دلنشیں اور دلگداز آواز کے ساتھ پڑھ رہا تھا: اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاءَ اللَّيْلِ ... . کمیل دل ہی دل میں اس شخص کی حالت پر بہت خوش ہوئے اور اس کی روحانیت پر مسرور ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ زبان سے کچھ کہتے، امامؑ نے کمیل کی طرف رُخ کیا اور فرمایا: اس شخص کی صدا تیرے لیے باعثِ حیرت نہ ہو، یہ شخص اہلِ دوزخ میں سے ہے اور میں عنقریب تجھے اس کی خبر دوں گا۔

---

[1] کافی، جلد اول باب "صفة العلم وفضله" حدیث ۲

[2] تفسیر مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

کمیل اس پر تعجب میں ڈوب گئے۔ پہلی بات تو یہ کہ امامؑ نے بہت جلدی کمیل کی فکر اور نیت کو جان لیا اور دوسری یہ کہ اس شخص کے دوزخی ہونے کی خبر دی جو ظاہری طور پر صالح نظر آتا تھا۔ کچھ مدت یونہی گزر گئی، یہاں تک کہ خوارج کا مسئلہ اس حد کو پہنچ گیا کہ وہ امیرالمومنینؑ کے مقابلے میں آکھڑے ہوئے اور حضرتؑ نے ان سے جنگ کی۔ حالانکہ وہ قرآن کو جس طرح کہ وہ نازل ہوا تھا حفظ کیے ہوئے تھے۔ امیرالمومنین علیؑ نے کمیل کی طرف رُخ کیا جبکہ تلوار آپؑ کے ہاتھ میں تھی اور ان سرکش کافروں کے سر زمین پر گر پڑے تھے، تو آپؑ نے شمشیر کی نوک سے ان میں سے ایک سر کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

اے کمیل! اَمَن هو قانت اٰناء اللیل

یہ وہی شخص ہے جو اس رات قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔

اور اس کی حالت تجھے معلوم بھی ہوئی تھی اور اس کی حالت نے تیرے تعجب اور حیرت کو بڑھا دیا تھا۔ کمیل نے حضرت کا بوسہ لیا اور استعفار کی۔[1]

---

[1] "سفینۃ البحار" جلد ۲ ص ۴۹۶ حالاتِ کمیل

۱۲۔ اور مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں ہی سب سے پہلا (تسلیم کرنے والا) مسلمان بنوں۔
۱۳۔ کہہ دے: اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو میں قیامت کے عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔
۱۴۔ کہہ دے: میں تو صرف خدا کی عبادت کرتا ہوں، اس حال میں کہ میں اپنے دین کو اس کیلئے خالص رکھتا ہوں۔
۱۵۔ تم اس کے بجائے جس کی چاہو پرستش کرو۔ کہہ دے: قیامت کے دن واقعی خسارے میں وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے خود اپنا اور اپنے وابستگان کا سرمایۂ وجود گنوا دیا ہے۔ آگاہ رہو کہ یہی واضح خسارہ ہے۔
۱۶۔ ان کے لیے ان کے سر کے اوپر کی طرف بھی آگ کا سائبان ہوگا اور ان کے پاؤں کے نیچے سے بھی آگ کا سائبان ہوگا۔ یہ وہ چیز ہے جس سے خدا اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ اے میرے بندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔

تفسیر

مخلص بندوں کا طرزِ حیات

گزشتہ آیات میں مغرور مشرکین اور فرمانِ خدا کے مطیع مومنین کا فرق نیز علماء و جہلاء کے درمیان موازنہ کیا گیا تھا۔ اب زیرِ بحث آیات میں سچے اور مخلص بندوں کے طرزِ حیات میں سے سات دستوروں کا ذکر چند آیات میں سمو دیا گیا ہے اور ان میں سے ہر آیہ "قُل" سے شروع ہوتی ہے۔

پہلے تقویٰ کا ذکر ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے: کہہ دے! اے میرے مومن بندو! اپنے پروردگار سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو، (قل یا عباد الذین آمنوا اتقوا ربکم)[1]۔

ہاں تقویٰ یعنی خود کو گناہ سے بچانا اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس ہے۔ یہ خدا کے مومن بندوں کا پہلا کام ہے۔ تقویٰ جہنم کی آگ سے بچاؤ کے لیے ایک ڈھال ہے اور انحراف سے باز رکھنے کا ایک عامل ہے۔ تقویٰ بازارِ قیامت کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور پروردگار کی بارگاہ میں انسان کے مرتبہ و مقام کا معیار ہے۔

دوسرے حکم میں اس دنیا میں احسان اور نیکوکاری کا ذکر ہے، کیونکہ یہ دنیا دارِ عمل ہے۔ اس کے لیے احسان کا نتیجہ بیان کرکے لوگوں کو

---

[1] یہ بات واضح ہے کہ "یا عبادِ" کا خطاب خدا کی طرف سے ہے اور اگر اللہ پیغمبر اکرمؐ سے کہتا ہے کہ یہ بات کرو تو اس سے مراد یہ ہے کہ میری طرف سے انھیں خطاب کرو۔

اس کی تشویق دلائی گئی ہے، فرمایا گیا ہے: ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اس دنیا میں کوئی نیکی کی ہے، بہت بڑا اجر و ثواب ہے۔ (للذین احسنوا فی ھٰذہ الدنیا حسنۃ)[1]

ہاں اس دنیا میں دوستوں اور بیگانوں کے ساتھ گفتار میں، عمل میں، طرزِ فکر و نظر میں نیکوکاری کا نتیجہ دونوں جہان میں مطلق طور پر اجر کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، کیونکہ نیکی کا نتیجہ نیکی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

حقیقت میں تقویٰ تو ایک بازر کھنے والا عامل ہے اور احسان و نیکی حرکت پیدا کرنے والا عامل ہے، جو مجموعی طور سے ترکِ گناہ اور فرائض و مستحبات کی انجام دہی دونوں پر مشتمل ہے۔

تیسرا حکم شرک و کفر اور گناہ سے آلودہ مراکز و مقامات سے "ہجرت" کرنے کی تشویق ہے۔ فرمایا گیا ہے: خدا کی زمین وسیع ہے (وارض اللہ واسعۃ)۔

درحقیقت یہ ان کمزور ارادے والے بہانہ جُو افراد کے لیے جواب ہے جو کہتے تھے کہ ہم مشرکین کی حکومت کے تسلط کی وجہ سے اپنے خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی انجام دہی پر قادر نہیں ہیں۔ قرآن کہتا ہے: خدا کی سرزمین نگہ میں ہی محدود نہیں ہے، مکہ نہ ہوا تو مدینہ سہی، دنیا وسیع ہے، اپنے آپ کو حرکت دو اور شرک و کفر و خفقان والے مراکز سے نقل مکانی کر جاؤ کہ جو تمھیں آزادی اور انجامِ فرائض سے مانع ہیں۔ نقل مکانی کر جاؤ۔

مسئلہ ہجرت اہم ترین مسائل میں سے ہے، اس نے آغازِ اسلام میں حکومتِ اسلامی کی کامیابی کی تکمیل کی۔ اسی بنا پر تاریخِ اسلام کی بنیاد اور سرآغاز بنا۔ دوسرے زمانوں میں بھی یہ مسئلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ طریقہ ایک طرف تو مومنین کو دباؤ اور گھٹن کے سامنے جھکنے اور گھٹنے ٹیکنے سے باز رکھتا ہے اور دوسری طرف سے عالم کے مختلف حصوں میں اسلام کے صدور کا عامل بھی ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے:

> ان الذین توفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃً فتھاجروا فیھا فاولئک مأواھم جھنم و ساءت مصیرًا۔ (نساء، ۹۷)
>
> ظالموں اور مشرکوں کی روح قبض کرتے وقت قبضِ روح کرنے والے فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم کس حالت میں تھے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں: ہم مستضعف تھے اور اپنی سرزمین میں دباؤ اور سختی میں تھے لیکن فرشتے انھیں جواب دیتے ہیں: کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی، تم نے ہجرت کیوں نہ اختیار کی، ان کی جگہ جہنم ہے اور وہ کتنی بُری جگہ ہے۔

---

[1] اکثر مفسرین نے "فی ھٰذہ الدنیا" کو "احسنوا" سے متعلق قرار دیا ہے۔ اس بنا پر "حسنۃ" مطلق ہوگی اور ہر قسم کے اجر پر مشتمل ہوگی، خواہ وہ اس جہان میں ہو یا دوسرے جہان میں۔ نیز اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ایسے مقام پر تنوین عظمت کی دلیل ہے، اس اجر کی عظمت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

یہ چیز اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ ماحول کا دباؤ اور گھٹن ، ایسے مقام پر جہاں سے ہجرت کرنا ممکن ہو ۔ بارگاہِ خداوندی میں عذر نہیں بن سکتا ۔

(اسلام میں ہجرت کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۴ میں سورۂ نساء کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں اور جلد ۷ ، سورۂ انفال کی آیہ ۷۲ ، کے ذیل میں بحث کی جا چکی ہے ۔)

چونکہ ہجرت سے عام طور پر زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں ، اس لیے چوتھا حکم صبر و استقامت کا اس صورت میں بیان کیا گیا ہے : صبر کرنے والے اور استقامت دکھانے والے اپنا اجر و ثواب بے حساب حاصل کریں گے (انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب)[1]

" یوفّی " کی تعبیر جو " وفی " سے اور اعطاءِ کامل کے معنی میں ہے اور " بغیر حساب " کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ استقامت دکھانے والے صابر لوگ بارگاہِ خداوندی سے برترین اور افضل ترین اجر پائیں گے اور کسی بھی عمل کی صبر و استقامت کے برابر اہمیت نہیں ہے ۔

اس بات کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادقؑ نے رسول اللہؐ سے بیان فرمائی ہے ۔

اذا نشرت الدواوین ونصبت الموازین ،لم ینصب لاھل البلاء میزان ،ولم ینشر لھم دیوان ثم تلا ھٰذہ الآیۃ : انما یوفّی الصابرون اجرھم بغیر حساب

جس وقت اعمال نامے کھولے جائیں گے اور پروردگار کی عدالت کے ترازو نصب ہوں گے تو ایسے اشخاص کے لیے جو مصائب اور سخت حوادث میں گرفتار رہے ہیں اور انھوں نے استقامت سے کام لیا ہے ، نہ تو وزن کے لیے میزان نصب ہوگی اور نہ ہی ان کا اعمال نامہ کھولا جائے گا ۔

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے اپنی گفتگو کے شاہد کے عنوان سے مذکورہ بالا آیت کی تلاوت کی کہ خدا صابروں کو بے حساب اجر دے گا ۔[2]

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کی پہلی ہجرت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس میں جعفر بن ابی طالب کی سرکردگی میں ایک بڑے گروہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی ۔ ہم نے یہ بارہا بیان کیا ہے کہ باوجود اس کے کہ شانِ نزول آیات کے مفاہیم کو واضح کرتی ہیں لیکن انھیں محدود نہیں کرتیں ۔

پانچویں حکم میں اخلاص کے بارے میں شرک کے ہر شائبہ سے پاک اور خالص توحید کے متعلق گفتگو ہے لیکن یہاں گفتگو کا لب و لہجہ

---

[1] " بغیر حساب " ممکن ہے " یوفّی " سے متعلق ہو یا " اجرھم " سے حال ہو لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے ۔

[2] " تفسیر مجمع البیان " زیر بحث آیات کے ذیل میں اور یہی معنی مختصر سے فرق کے ساتھ تفسیر قرطبی میں حسین بن علیؑ سے ان کے جد رسول اللہؐ سے نقل ہوا ہے ۔

بدل جاتا ہے اور پیغمبر خدا اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: میں تو اس بات پر مامور ہوں کہ خدا ہی کی عبادت کروں، اس حال میں کہ میں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کیے رکھوں (قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصًا لہ الدین)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے، اور میں اس بات پر مامور ہوں کہ میں پہلا مسلمان بنوں (و امرت لان اکون اوّل المسلمین)۔

یہاں پر چھٹا حکم یعنی اسلام اور فرمانِ خدا کے سامنے پوری طرح سرِ تسلیم خم کرنے میں سبقت کرنے کے بارے میں ہے۔

ساتواں اور آخری حکم قیامت کے دن خدا کی سزا سے متعلق ہے۔ یہ بھی اسی لب ولہجہ میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا گیا ہے: کہہ دے: اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو قیامت کے عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں (قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم)۔

یہ اس لیے ہے تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ پیغمبر بھی بندگانِ خدا میں سے ہیں، وہ بھی خالص طور سے عبادت کرنے پر مامور ہیں، وہ بھی خدا کے عذاب وسزا سے ڈرتے ہیں اور وہ بھی فرمانِ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مامور ہیں، بلکہ وہ دوسروں کی نسبت سنگین تر ذمہ داری رکھتے ہیں کہ وہ سب سے آگے بڑھ کر رہیں۔

وہ کبھی بھی مقامِ الوہیت کے مدعی اور عبادت کے راستے سے باہر قدم رکھنے کے دعویدار نہیں تھے بلکہ وہ تو اپنے مقامِ عبودیت پر فخر ومباہات کرتے تھے اور اسی بنا پر وہ ہر چیز میں نمونہ اور اُسوہ ہیں۔

وہ ان جہات میں اپنے لیے دوسروں سے امتیاز کے قائل نہیں ہیں اور یہ بات خود ان کی عظمت اور حقانیت کی ایک واضح و روشن نشانی ہے۔ جھوٹے مدعیوں کی طرح نہیں جو دوسروں کو تو اپنی پرستش کی دعوت دیتے تھے اور اپنے آپ کو مافوق البشر اور ولا تر گوہر کی حیثیت سے متعارف کرواتے تھے۔ ایسے لوگ بعض اوقات اپنے پیروکاروں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ انھیں ہر سال ان کے وزن کے برابر سونا اور جواہرات دیں۔

رسولؐ تو درحقیقت یہ فرماتے ہیں:

"میں ایسے سلاطینِ جابر کی طرح نہیں ہوں جو لوگوں کو تو کچھ ذمہ داریوں کی انجام دہی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں لیکن خود اپنے آپ کو ذمہ داری سے مافوق سمجھتے ہیں"۔

اور یہ حقیقت میں ایک اہم تربیتی مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ ہر مربی ورہبر کو اپنے مکتب کے احکام کی انجام دہی میں سب سے آگے قدم بڑھانا چاہیے۔ وہ اپنے آئین کا سب سے پہلا مومن، سب سے زیادہ کوشش کرنے والا اور سب سے زیادہ فداکاری کرنے والا ہونا چاہیے تاکہ لوگ اس کی صداقت پر ایمان لائیں اور اس کو ہر چیز میں اپنے لیے راہنما اور اسوہ سمجھیں۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا مسلمان ہونا نہ صرف زمانے کے لحاظ سے ہے، بلکہ تمام جہات میں آپ پہلے مسلمان تھے۔ ایمان کے لحاظ سے، اخلاص وعمل اور فداکاری کے اعتبار سے اور جہاد واستقامت کی جہت سے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ساری زندگی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے۔

زیر بحث آیات میں سات احکام (تقویٰ، احسان، ہجرت، صبر، اخلاص، تسلیم اور خوف) کے ذکر کے بعد مسئلہ اخلاص چونکہ خصوصیت کے ساتھ شرک کے مختلف اسباب وعوامل کے مقابلے میں ایک خصوصیت رکھتا ہے، لہذا تاکید کے لیے اسے دوبارہ بیان کیا گیا ہے اور اسی لب ولہجہ میں فرمایا گیا ہے: کہہ دے: میں تو خدا ہی کی عبادت کرتا ہوں اس حال میں کہ اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھتا ہوں (قل اللہ اعبد مخلصًا لہ دینی)[1]

لیکن تم اس کے علاوہ جس کی چاہو پرستش کرتے رہو (فاعبدوا ما شئتم من دونہ)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کہہ دے! یہ نقصان اٹھانے والوں کا راستہ ہے، کیونکہ حقیقی زیاں کار وہی تو ہیں جو اپنی عمر اور وجود کا سرمایہ یہاں تک کہ اپنے وابستگان کو بھی قیامت کے دن ہاتھ سے گنوا بیٹھیں گے (قل ان الخاسرین الذین خسروا انفسھم واھلیھم یوم القیامۃ)۔

نہ تو انھوں نے اپنے وجود سے ہی کچھ فائدہ اٹھایا ہے اور نہ ہی سرمایۂ عمر سے کچھ حاصل کیا ہے، نہ ان کا خاندان اور اولاد ان کی نجات کا ذریعہ بنتے ہیں اور نہ ہی بارگاہِ حق میں ان کی آبرو اور شفاعت کا سبب ہوتے ہیں۔

آگاہ رہو کہ واضح خسارہ یہی ہے (الا ذالک ھوالخسران المبین)۔

آخری زیر بحث آیت میں ان کے ایک اور واضح خسارے اور نقصان کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے: ان کے لیے ان کے سروں کے اوپر آگ کے سائبان ہیں اور ان کے پاؤں کے نیچے بھی آگ کے سائبان ہیں (لھم من فوقھم ظلل من النار ومن تحتھم ظلل)۔

اس طرح سے وہ ہر طرف سے آگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس سے بالاتر اور کون سا خسران ہوگا اور اس سے بڑھ کر دردناک عذاب اور کیا ہوگا؟

"ظلل" جمع "ظلہ" (بروزن "قلہ") اس پردے کے معنی میں ہے جو اوپر کی طرف سے نصب ہو، اس بنا پر اس کا اس فرش پر اطلاق جو ان کے پاؤں کے نیچے بچھا ہوا ہے، ایک قسم کا مجازی اطلاق ہے اور اس لفظ کے مفہوم میں توسیع کے حوالے سے ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ چونکہ دوزخی جہنم کے کئی طبقات میں گرفتار ہوں گے اس لیے آگ کے پردے ان کے سروں کے اوپر بھی ہوں گے اور ان کے پاؤں کے نیچے بھی۔ اس لیے لفظ "ظلل" کا اطلاق نچلے پردوں پر بھی مجاز نہیں ہے۔

---

[1] "اللہ" کا مقدم ہونا جو کہ "اعبد" کا مفعول ہے یہاں "حصر" کے لیے ہے یعنی میں صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں اس بنا پر "مخلصًا لہ دینی" جو کہ حال ہے، اس معنی پر ایک نئی تاکید ہے۔

سُورۂ عنکبوت کی آیہ ۵۵ اسی آیت کے مانند ہے ۔

یوم یغشٰھم العذاب من فوقھم ومن تحت ارجلھم و یقول ذوقوا ما کنتم تعملون

اس دن خدا کا عذاب انھیں سر کے اوپر سے بھی اور پاؤں کے نیچے سے بھی (ہر طرف سے) ڈھانپ لے گا اور ان سے کہے گا اس کا مزہ چکھو کہ جو تم کیا کرتے تھے ۔

یہ درحقیقت ان کے دنیا کے حالات کا تجسم ہے کہ جہالت و کفر و ظلم نے ان کے تمام وجود کو گھیر رکھا تھا، اور ہر طرف سے انھیں ڈھانپ لیا تھا ۔

اس کے بعد تاکید اور عبرت کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: یہی تو وہ چیز ہے کہ جس سے خدا اپنے بندوں کو ڈراتا ہے ۔ جب ایسا ہے تو اے میرے بندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو (ذالک یخوّف اللہ بہ عبادہ یا عباد فاتقون)۔

اس آیت میں "عباد" (بندے) کی تعبیر اور اس کی خدا کی طرف اضافت اور وہ بھی تکرار کے ساتھ، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا عذاب کی کوئی تہدید کرتا ہے تو وہ بھی اس کے لطف و رحمت کی بنا پر ہے تاکہ بندگانِ حق اس قسم کے بُرے انجام میں گرفتار نہ ہوں ۔ یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس آیت میں "عباد" سے مراد خصوصیت کے ساتھ مومنین لیں بلکہ یہ سب کے لیے ہے، کیونکہ کسی شخص کو بھی اپنے آپ کو عذابِ الٰہی سے مامون نہیں سمجھنا چاہیے ۔

چند اہم نکات

۱۔ خُسران وزیاں کی حقیقت: خسران ـــــ جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے :ـــــ

اصل میں سرمایہ ہاتھ سے دے بیٹھنا اور اس کا کم ہو جانا ہے ۔ کبھی تو اس کی انسان کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے زیاں کیا اور اس نے نقصان اٹھایا اور کبھی عمل کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور کہتے ہیں : اس کی تجارت میں نقصان ہوا ہے ۔

دوسری طرف "خسران" کبھی تو ظاہری سرمایوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے ، جیسے مال اور دنیاوی مقام ، اور کبھی معنوی سرمایوں کے بارے میں جیسے صحت و سلامتی، عقل و ایمان اور ثواب اور یہی وہ چیز ہے جس کا خدا نے "خسران مبین" نام رکھا ہے اور جس جس خسران کو خدا نے قرآن میں بیان کیا ہے وہ دوسرے ہی معنی کی طرف اشارہ ہے نہ کہ وہ جو دنیاوی سرمایوں اور عام تجارتوں سے مربوط ہے [1]

قرآن نے حقیقت میں انسانوں کو ان تجارت پیشہ افراد سے تشبیہ دی ہے جو بہت زیادہ سرمایے کے ساتھ اس جہان کے تجارت خانہ میں قدم رکھتے ہیں ، بعض کو تو بہت زیادہ نفع ہوتا ہے اور بعض کو سخت نقصان ۔

---

[1] مفردات، مادہ "خسر"

۱۷۔ وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۙ

۱۸۔ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○

۱۹۔ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ○

۲۰۔ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ○

ترجمہ

۱۷۔ جن لوگوں نے طاغوت کی عبادت سے اجتناب کیا اور خدا کی طرف لوٹے، بشارت اور خوشخبری انھی لوگوں کے لیے ہے، اس بنا پر میرے ان بندوں کو بشارت دے دو۔

۱۸۔ وہ لوگ جو باتوں کو (غور سے) سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور یہی عقل مند ہیں۔

۱۹۔ کیا تو اس شخص کو جس کے لیے عذاب کا حکم قطعی ہو چکا ہے رہائی بخش سکتا ہے؟ کیا تو اس شخص کو جو آگ کے اندر ہے پکڑ کر باہر لے آسکے گا؟

۲۰۔ لیکن وہ لوگ جنھوں نے خدا کا تقویٰ اختیار کیا ہے ان کے لیے تو بہشت میں بالاخانے ہیں، جن کے اوپر پھر بالاخانے ہیں اور ان کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ خدا کا وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

تفسیر

خدا کے حقیقی بندے

قرآن نے پھر ان آیات میں موازنے کی روش سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان متعصب اور ہٹ دھرم مشرکین کے مقابلے میں جن کی سرنوشت جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ پروردگار کے خاص اور حقیقت کے متلاشی بندوں کے متعلق گفتگو شروع کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان لوگوں کے لیے جنھوں نے "طاغوت" کی عبادت سے اجتناب کیا ہے اور خدا کی طرف بازگشت کی، بشارت اور خوشخبری ہے (والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا و انابوا الی اللہ لھم البشریٰ)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "بشریٰ" یہاں مطلق ہے لہٰذا ہر قسم کی خدائی نعمتوں پر مشتمل ہے چاہے وہ مادی ہوں یا معنوی، لیکن یہ عظیم بشارت ایسے لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو طاغوت کی پرستش سے اجتناب کریں اور خدا کی طرف لوٹ آئیں۔ سارا ایمان و عمل صالح اسی جملے میں جمع ہے۔

کیونکہ "طاغوت" اصل میں "طغیان" کے مادہ سے حد سے تجاوز کرنے والے معنی میں ہے۔ اس لیے یہ لفظ ہر تجاوز کرنے والے اور خدا کے سوا ہر معبود، جیسے شیطان اور ظالم حکمران پر بولا جاتا ہے (یہ لفظ واحد و جمع دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے)[1]

اس بنا پر "طاغوت سے اجتناب" اس وسیع و عریض معنی کا حامل ہے یعنی ہر قسم کے شرک، بت پرستی، ہوس پرستی اور شیطان پرستی سے دوری نیز حکام جور اور ظلم کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنے والوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور "انابوا الی اللہ" تقویٰ پرہیزگاری اور ایمان کا جامع ہے۔ یقیناً اس کے افراد ہی بشارت کے اہل ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ طاغوت کی عبادت صرف رکوع و سجود کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ ہر قسم کی اطاعت کے مفہوم میں ہے جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

من اطاع جبارًا فقد عبدہ

جس شخص نے کسی ستم گر حکمران کی اطاعت کی اس نے اس کی عبادت کی[2]

پھر ان خاص بندوں کے تعارف کے لیے قرآن کہتا ہے: میرے خاص بندوں کو بشارت دے دے (فبشر عباد)[3]

---

[1] بعض مفسرین مثلاً زمخشری کا کشاف میں یہ نظریہ ہے کہ "طاغوت" اصل میں طغوت (بروزن "فعلوت") مثل "ملکوت" تھا پھر وہ مقلوب ہوگیا اور لام الفعل عین الفعل سے مقدم ہوگئی اور "طوغت" ہوگیا اور واؤ کے الف سے بدل جانے کے بعد "طاغوت" ہوگیا اور کئی لحاظ سے تاکید کے معنی دیتا ہے صیغہ مبالغہ معنی مصدری اور قلب کی وجہ سے (تفسیر کشاف جلد ۴ ص ۱۲۰)

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں جلد ۷، ص ۴۹۲

[3] "عباد" اصل میں "عبادی" تھا۔ یا حذف ہوگئی اور زیر اس کا قائم مقام ہے۔

وہ لوگ جو بات (غور سے) سنتے ہیں اور اس میں سے جو بات زیادہ اچھی ہوتی ہے، اس کی پیروی کرتے ہیں (الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ)۔

وہ ایسے لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور وہی عقل و خرد رکھنے والے ہیں (او لئک الذین ھداھم اللہ و اولئک ھم اولوا الالباب)۔

یہ دو آیات جو اسلامی شعار کی صورت میں سامنے آئی ہیں، مسلمانوں کی حریت فکر اور مختلف مسائل میں (اچھی سے اچھی بات کو) انتخاب کرنے کی خوب نشاندہی کرتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: میرے بندوں کو بشارت دے دے اور اس کے بعد ان خاص بندوں کا اس صورت میں تعارف کروایا گیا ہے: وہ ہر کسی کی بات کو غور سے سنتے ہیں یہ دیکھے بغیر کہ کہنے والا کون ہے اور کیا نظریہ رکھتا ہے اور عقل و خرد کی قوت کے ساتھ ان میں سے بہترین کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ وہ کسی قسم کا تعصب اور ہٹ دھرمی نہیں کرتے اور کسی قسم کی تنگ نظری ان کی فکر و نظر میں نہیں ہے۔ وہ حق کے متلاشی اور حقیقت کے پیاسے ہیں وہ جہاں کہیں بھی انھیں ملے، لپک کر اس کا استقبال کرتے ہیں اور اس کے صاف چشمے سے بغیر روک ٹوک کے پیتے ہیں اور سیراب ہوتے ہیں وہ نہ صرف حق کے طالب اور اچھی گفتگو کے پیاسے ہیں بلکہ "خوب" اور "خوب تر" میں سے اور "نیک" اور "نیک تر" میں سے دوسرے کا انتخاب کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ بہترین اور برترین کے خواہاں ہیں۔

ہاں! یہی ہے نشانی ایک سچے مسلمان اور حق طلب مؤمن کی۔

"یستمعون القول" (بات کو سنتے ہیں) میں "قول" سے کیا مراد ہے۔ اس ضمن میں مفسرین نے گوناگوں تفسیریں کی ہیں۔

بعض نے اس سے قرآن مراد لیا ہے اور جو کچھ اس میں احکام اور مباحات کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے وہ ان میں سے احکام کی پیروی کو احسن کی پیروی سمجھتے ہیں۔

بعض دوسروں نے اس کی مطلق اوامر الٰہیہ سے تفسیر کی ہے، چاہے وہ قرآن میں ہوں یا غیر قرآن میں۔

لیکن ان محدود تفسیروں کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ آیت کا ظاہری مفہوم ہر قسم کے قول اور ہر بات پر محیط ہے۔ خدا کے باایمان بندے تمام باتوں میں سے اس بات کو انتخاب کر لیتے ہیں جو "احسن" ہے اور اس کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے عمل میں اسی پر کاربند ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے مذکورہ بالا آیت میں صاحبان ہدایت الٰہی کو اسی گروہ میں منحصر کر دیا ہے جیسا کہ عقل مندوں کو بھی انھیں میں منحصر قرار دیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گروہ ظاہری و باطنی ہدایت کا حامل ہے۔ ظاہری ہدایت عقل و خرد کے طریق سے اور باطنی ہدایت نور الٰہی اور امداد غیبی کے راستے سے، اور یہ دونوں افتخار اس قسم کے حقیقت کے متلاشی حریتِ فکر کے حامل لوگوں کے لیے ہیں۔

چونکہ پیغمبرؐ خدا گمراہوں اور مشرکین کو ہدایت کرنے سے بہت لگاؤ رکھتے تھے اور ان لوگوں کے انحراف سے انھیں بہت تکلیف

اور زیادہ دلپذیر ہوتا ہے۔

"غرف" جمع ہے "غرفہ" کی "غرف" (بروزن "حرف") کے مادہ سے۔ یہ کسی چیز کو اوپر اٹھانے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے اس پانی کو جو چلو کے ساتھ چشمے سے اٹھا کر پیتے ہیں "غرفہ" کہتے ہیں۔ یہ لفظ بعد ازاں کسی عمارت کے اوپر والے حصے اور منازل کے بالائی طبقات کے معنی میں بولا جانے لگا۔

بہشت کے یہ حسین و خوبصورت بالاخانے، ان نہروں کے ساتھ، جو ان کے نیچے بہہ رہی ہیں، سجائے گئے ہیں، اسی لیے آیت کے آخر میں ہے: ان کے نیچے دوامی نہریں جاری ہیں (ابنیۃ تجری من تحتھا الانھار)۔

ہاں! "یہ خدائی وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا" (وعد اللہ لا یخلف اللہ المیعاد)۔[1]

چند اہم نکات

۱۔ اسلام اور حریتِ فکر: بہت سے مذاہب اپنے پیروکاروں کو دوسروں کی باتوں کے مطالعے اور تحقیق سے منع کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی منطق کی کمزوری کی وجہ سے اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں پڑھنے والا دوسروں کی منطق قبول نہ کرلے اور اس طرح ان کے پیروکار ان کے ہاتھ سے نکل جائیں۔

لیکن جیسا کہ زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے، اسلام نے اس بارے میں "کھلے دروازوں" کی تدبیر اپنائی ہے اور انھی لوگوں کو خدا کے سچے بندے قرار دیتا ہے جو اہلِ تحقیق ہیں، ایسے کہ جو نہ تو دوسروں کی باتوں کو سننے سے گھبراتے ہیں اور نہ ہی کسی قید و شرط کے بغیر سر تسلیم خم کرتے ہیں اور نہ ہی کسی وسوسے کو قبول کرتے ہیں۔

اسلام ایسے ہی لوگوں کو بشارت دیتا ہے جو باتوں کو غور سے سنتے ہیں اور ان میں سے جو بہت اچھی ہیں انھیں انتخاب کرلیتے ہیں، نہ صرف یہ کہ اچھی باتوں کو بری باتوں پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ پھولوں میں سے بھی جو پھول بہتر ہوتا ہے اسے انتخاب کرتے ہیں۔

قرآن ان بے خبر جاہلوں کی شدید مذمت کرتا ہے جو پیامِ حق سنتے وقت کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور سر پر کپڑا ڈال لیتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت نوحؑ کے ارشادات میں ایسے لوگوں کی بارگاہِ پروردگار میں شکایت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اٰذانھم و استغشوا ثیابھم واصرّوا واستکبروا استکبارًا

خداوندا! جب بھی میں نے انھیں بلایا تاکہ تو انھیں بخش دے تو انھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے اوپر کپڑا ڈال لیا، اپنی گمراہی پر اصرار کیا اور بہت تکبر کیا۔ (نوح ——— ۷)

---

[1] زمخشری کشاف میں کہتے ہیں:
"وعد اللہ" مفعول مطلق کے طور پر منصوب تاکید ہے کیونکہ "لھم غرف" "وعد ھم اللہ غرفا" کے معنی میں ہے۔

اصولی طور پر وہ مکتب جو قوی منطق رکھتا ہے، اس کے لیے دوسروں کی باتوں سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ ہی ان کی طرف سے مسائل کے پیش ہونے پر اسے خوف کھانے کی ضرورت ہے۔ ڈرنا تو انھیں چاہیے جو کمزور اور بے منطق ہیں۔

یہ آیت ایسے لوگوں کو جو ہر بات کو بغیر کسی قید و شرط کے قبول کر لیتے ہیں "اولوا الالباب" اور "ہدایت یافتہ افراد" شمار نہیں کرتی، ان کی مثال ان بھیڑوں کی سی ہے جو کسی سبزہ زار میں چرتے وقت، کوئی تحقیق نہیں کرتیں۔ آیت ان دو اوصاف کو ایسے لوگوں کے ساتھ مخصوص کرتی ہے جو نہ تو بے قید و شرط تسلیم کے افراط میں گرفتار ہیں اور نہ ہی خشک اور جاہلانہ تعصبات کی تفریط میں۔

۲۔ چند سوالوں کا جواب: ا۔ ممکن ہے یہاں یہ سوال پیش کیا جائے کہ اسلام میں کتبِ ضلال کی خرید و فروش کیوں منع ہے؟

۲۔ قرآن کو کفار کے ہاتھوں میں دینا کیوں حرام قرار دیا گیا ہے؟

۳۔ جو شخص کسی مطلب کو جانتا ہی نہیں وہ اس میں سے انتخاب کیسے کرے گا اور اچھے کو برے سے کس طرح جدا کرے گا؟ کیا اس بات سے دور لازم نہیں آتا؟

پہلے سوال کا جواب واضح ہے، کیونکہ زیرِ بحث آیات میں ایسی باتوں کے متعلق بحث ہے جن میں ہدایت کی اُمید ہو جب غور و فکر اور تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو گیا ہو کہ فلاں کتاب گمراہ کرنے والی ہے تو پھر وہ اس حکم کے موضوع سے خارج ہو جائے گی۔ اسلام کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ لوگ ایسے راستے میں قدم رکھیں جس کا نادرست اور غلط ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

البتہ جب تک یہ امر کسی پر ثابت نہ ہوا ہو اور وہ صحیح دین قبول کرنے کے لیے، مختلف مذاہب کے بارے میں تحقیق کر رہا ہو اس وقت تک ان تمام کتابوں کا مطالعہ اور تحقیق کر سکتا ہے لیکن مطلب ثابت ہو جانے کے بعد اس کو ایک زہریلے مادہ کی طرح ہر کسی کی دسترس سے باہر رکھنا چاہیے۔

باقی رہا دوسرے سوال کے بارے میں تو اس صورت میں قرآن غیر مسلم کے ہاتھ میں دینا جائز نہیں ہے جب کہ یہ اس کی ہتک اور بے حرمتی کا باعث ہو ورنہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ غیر مسلم واقعاً اسلام کے بارے میں تحقیق کی فکر میں ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ قرآن کا اس مقصد کے لیے مطالعہ کرے تو نہ صرف یہ کہ قرآن اسے دینے میں کوئی حرج اور رکاوٹ نہیں ہے بلکہ شاید اسے دینا واجب ہو اور جنھوں نے اسے حرام قرار دیا ہے ان کی مراد اس صورت کے علاوہ دوسری صورت ہے۔

اسی لیے عظیم اسلامی معاشرے اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ قرآن کا دنیا کی زندہ زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے اور دعوتِ اسلامی کی نشر و اشاعت کے لیے اسے حق طلبی اور حقائق کے پیاسوں تک پہنچانا چاہیے۔

تیسرے سوال کے سلسلے میں اس نکتے پر توجہ کرنا چاہیے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ذاتی طور پر کسی کام سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، البتہ جب کوئی دوسرا اسے انجام دے لیتا ہے تو پھر وہ بھی اچھے اور برے میں تشخیص کر سکتا ہے اور عقل و خرد کی قوت اور وجدان کے سرمائے سے ان میں سے بہترین کا انتخاب کر سکتا ہے۔

مثلاً ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو فنِ معماری اور تعمیر کے کام سے آگاہ نہ ہوں، یہاں تک کہ وہ اینٹیں بھی صحیح طریقے پر ایک دوسرے پر نہ رکھ سکیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک اچھی عمارت کی اعلیٰ کیفیت میں اور ایک قبیح بے ڈھنگی اور ناموزوں عمارت میں

تمیز کر سکیں۔

بہت سے افراد کو ہم پہچانتے ہیں جو خود تو شاعر نہیں ہیں لیکن بزرگ شعراء کے اشعار کے وزن میں تمیز کر سکتے ہیں اور انھیں بے وقعت تکلفاً کہنے والے شعراء کے اشعار سے جُدا کر سکتے ہیں، کچھ لوگ خود تو کشتی نہیں لڑتے لیکن کشتی لڑنے والوں کے درمیان فیصلہ اور ان میں سے اچھے کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

۲۔ **حریتِ فکر اور اسلامی روایات:** احادیثِ اسلامی میں جو زیرِ بحث آیات کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں یا مستقل طور پر منقول ہوئی ہیں اس امر پر بہت زور دیا گیا ہے۔

ان میں سے ایک حدیث امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اپنے ایک دانش مند صحابی ہشام بن حکم سے فرمایا:۔

یاھشام ان اللہ تبارك و تعالیٰ بشر اھل العقل و الفھم فی کتابه، فقال فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه

اے ہشام! خداوند تعالیٰ نے اہلِ عقل و فہم کو اپنی کتاب میں بشارت دی ہے اور فرمایا ہے: میرے ان بندوں کو بشارت دے دو جو باتوں کو (غور سے) سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کی پیروی کرتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور وہ صاحبانِ عقل و فکر ہیں[۱]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں فرمایا:

ھو الرجل یسمع الحدیث فیحدث به کما سمعه لا یزید فیه و لا ینقص

یہ آیت ایسے لوگوں کے بارے میں جو حدیث سنتے ہیں اور بے کم و کاست اور بغیر کمی و بیشی کے دوسروں کے لیے نقل کرتے ہیں[۲]

البتہ اس حدیث سے مراد "فیتبعون احسنه" کی تفسیر ہے کیونکہ بہترین باتوں کی پیروی کرنے کی ایک نشانی یہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہ کرے اور بعینہٖ دوسروں تک پہنچا دے۔ نہج البلاغہ میں امیرالمؤمنین حضرت علیؑ کے کلمات قصار میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

الحکمة ضالة المؤمن فخذ الحکمة ولو من اھل النفاق

حکمت آمیز باتیں مؤمن کی گم شدہ چیز ہے، پس وہ حکمت کو لے لے چاہے وہ منافق کے پاس سے ملے[۳]

---

[۱] کافی، جلد ۱، کتاب العقل، حدیث ۱۲

[۲] نور الثقلین، جلد ۴، ص ۴۸۲، حدیث ۲۴

[۳] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۸۰

۴۔ تطبیق یا شانِ نزول: مفسّرین نے کئی ایک شانِ نزول بیان کی ہیں۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ والذین اجتنبوا الطاغوت ..... کی آیت اور اس کے بعد والی آیت تین افراد کے بارے میں وارد ہوئی ہے جو زمانۂ جاہلیت میں (اس آلودہ ماحول میں مشرکین کے شور و غوغا کے سامنے نہیں جھکے اور) وہ کہتے تھے لا الٰہ الا اللہ ــــ وہ سلمان فارسی۔ ابوذر غفاری اور زید بن عمرو تھے۔[1]

بعض روایات میں زید بن عمرو کی جگہ سعید بن زید آیا ہے۔[2]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیہ افمن حق علیہ کلمۃ العذاب ..... ابوجہل وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[3]

لیکن بعید نہیں ہے کہ یہ اصطلاحی شانِ نزول میں سے نہ ہو بلکہ آیت کے واضح مصادیق پر تطبیق کی گئی ہو۔

---

[1] تفسیر "قرطبی" و "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] "درالمنثور" طبق نقل تفسیر المیزان جلد ۱۷ صفحہ ۲۶۷

[3] اس قول کو "روح المعانی" نے بعض سے نقل کیا ہے۔

۲۱۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝

۲۲۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

ترجمہ

۲۱۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اسے چشموں کی صورت میں زمین میں داخل کیا پھر اس سے زرعی پیداوار نکالتا ہے جو مختلف رنگ کی ہوتی ہے پھر یہ خشک ہو جاتی ہے اس طرح سے کہ تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد اور بے روح ہے وہ اسے درہم و برہم کر دیتا ہے اور ریزہ ریزہ بنا دیتا ہے۔ اس ماجرے میں صاحبانِ عقل کے لیے ایک نصیحت ہے۔

۲۲۔ کیا وہ شخص جس کا سینہ خدا نے اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہے اور وہ نورِ الٰہی کے مرکب پر سوار ہے (ان دل کے اندھوں کی طرح ہے جن کے دل میں نورِ ہدایت داخل نہیں ہوا) وائے ہے ان کے لیے جو ذکرِ خدا کے مقابلے میں سخت دل رکھتے ہیں وہ واضح گمراہی میں ہیں۔

تفسیر

وہ لوگ جو نور کے مرکب پر سوار ہیں

قرآن ان آیات میں دوبارہ توحید و معاد کے دلائل پیش کرتا ہے اور ان مباحث کی تکمیل کرتا ہے جو گزشتہ آیات میں کفر و ایمان کے

سلسلے میں بیان ہوئے۔

نظامِ جہانِ ہستی میں پروردگار کی عظمت و ربوبیت کے آثار میں سے، آسمان سے نزولِ بارش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر اس بے رنگ پانی سے ہزاروں رنگ کے نباتات کی پرورش اور حیات کے مراحل کو طے کرنے اور آخری مرحلے تک پہنچنے کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے تمام مومنین کے لیے ایک نمونے کے طور پر فرماتا ہے: کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا پھر اسے چشموں کی صورت میں زمین میں داخل کیا (الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء فسلکہ ینابیع فی الارض)۔[1]

بارش کے حیات بخش قطرے آسمان سے برستے ہیں۔ زمین کی نفوذ پذیر تہہ انھیں زمین کے اندر قبول کر لیتی ہے اور جب وہ نفوذ ناپذیر تہہ تک پہنچ جاتے ہیں تو وہاں رک جاتے ہیں اور زمین انھیں ذخیرہ کر لیتی ہے اور اس کے بعد چشموں، نالوں اور کنوؤں کی صورت میں باہر بھیجتی ہے۔

"سلکہ" (بارش کے پانی کو زمین کے اندر داخل کیا) اسی امر کی طرف اشارہ ہے جو ہم نے سطورِ بالا میں بیان کیا ہے۔

"ینابیع" "ینبوع" کی جمع ہے اور "نبع" کے مادہ سے ہے کہ جو زمین سے پانی کے جوش مارنے کے معنی میں ہے۔

اگر زمین میں ایک ہی نفوذ ناپذیر تہہ ہوتی تو بارش کے پانی کے ایک بھی قطرے کو اپنے اندر ذخیرہ نہ کر سکتی اور آسمان سے بارش برسنے کے بعد سارا پانی دریاؤں میں جا پڑتا اور اس صورت میں نہ تو کوئی چشمہ ہوتا نہ نہریں اور نہ نالے ہوتے اور نہ ہی کنویں ہوتے اور اگر اس میں ایک نفوذ پذیر تہہ ہی ہوتی تو سارا پانی زمین کی گہرائیوں میں چلا جاتا اس طرح سے اس تک دسترس ہی ممکن نہ ہوتی۔ زمین کی ان دو تہوں نفوذ پذیر اور نفوذ ناپذیر۔ کا ایسے منظم اور جچے تلے فاصلے پر ہونا اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ نیز یہ بات قابلِ توجہ ہے بعض اوقات ـــــ نفوذ پذیر اور نفوذ ناپذیر ـــــ کئی طبقات اوپر نیچے ہوتے ہیں جن سے اونچی سطح پر، نیم گہرے اور گہرے کنویں کھودنے میں استفادہ کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: پھر خدا اس کے ذریعے نباتات کو نکالتا ہے جو مختلف رنگ کے ہوتے ہیں (ثم یخرج بہ زرعاً مختلفاً الوانہ)۔

ان کی انواع بھی مختلف ہیں۔ جیسے گندم، جو، چاول اور مکی اور ان کی کیفیتیں بھی مختلف ہیں اور ان کا ظاہری رنگ بھی۔ بعض گہرے سبز رنگ کے، بعض ہلکے سبز رنگ کے، بعض کے پتے چوڑے اور پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض کے باریک اور پتلے وغیرہ وغیرہ۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "زروع" ایسے پودے کو کہا جاتا ہے جس کا تنا قوی نہ ہو اس کے مقابلے میں لفظ "شجر" ہے

---

[1] "ینابیع" ترکیب نحوی کے لحاظ سے "منصوب بنزع خافض" ہے اور اصل میں "فی ینابیع" تھا (تفسیر روح المعانی و روح البیان)

جو زیادہ تر اس درخت کو کہا جاتا ہے جس کا تنا قوی ہو۔

"زرع" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو غیر غذائی نباتات کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ طرح طرح کے پھول، سجاوٹ کی گھاس اور دوائیوں کی جڑی بوٹیاں وغیرہ جو بہت متنوع اور گوناگوں رنگوں اور صورتوں والی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات تو ایک ہی شاخ پر بلکہ ایک ہی پھول میں یہ مختلف رنگ بہت ہی عمدہ اور خوبصورت پہلو بہ پہلو دکھائی دیتے ہیں اور زبانِ بے زبانی سے خدا کی توحید اور تسبیح کا نغمہ سنا رہے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان نباتات کی حیات کے کچھ اور مراحل پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

اس کے بعد یہ زراعت ختم ہو جاتی ہے اس طرح سے کہ تو اسے زرد اور بے روح دیکھتا ہے۔

(ثم یھیج فتراہ مصفرًا)[1]۔

تیز ہوا ہر طرف سے چلتی ہے اور جو پودا کمزور ہو چکا ہوتا ہے اسے اس کی جگہ سے اکھاڑ دیتی ہے۔ پھر خدا اسے درہم برہم کر کے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے (ثم یجعلہ حطامًا)۔

"ہاں! اس واقعے میں صاحبانِ فکر و نظر کے لیے نصیحت اور یاد آوری ہے" (ان فی ذالک لذکری لاولی الالباب)۔

اس عظیم منظر میں پروردگار کی ربوبیت اور عالمِ ہستی کے باعظمت اور بچے تلے نظام کے سلسلے میں ایک امر توجہ طلب اور تذکر ہے اور زندگی کے ختم ہونے کے بارے میں بھی ایک تذکر ہے اور اس کے بعد قیامت اور مُردوں کے نئے سرے سے زندہ ہونے کے سلسلہ میں بھی یاد آوری ہے۔

یہاں اگرچہ عالمِ نباتات کا منظر پیش کیا گیا ہے، لیکن یہ انسانوں کو خبردار کرتا ہے کہ اسی طرح سے تمھاری حیات میں بھی تکرار ہوگا، ممکن ہے کہ اس کی مُدت مختلف ہو لیکن اس کا اصول ایک ہی ہے تولّد و پیدائش، نشاط و جوانی اور پھر پژمردگی اور بڑھاپا اور آخر میں موت۔

توحید و معاد کے اس درس کے بعد مومن و کافر کے درمیان ایک موازنہ پیش کیا گیا ہے تاکہ اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ قرآن اور وحیٔ آسمانی بھی بارش کے قطروں کی طرح ہے جو دلوں کی سرزمین پر نازل ہوتی ہے جس طرح صرف آمادہ اور اہل زمین ہی بارش کے حیات بخش قطرات سے فائدہ اٹھاتی ہے اسی طرح سے آیاتِ الٰہی سے بھی صرف وہی دل بہرہ مند ہوتے ہیں جو اس کے سایۂ لطف میں خود سازی کے لیے آمادہ و تیار ہوتے ہیں، فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جس کے سینے کو خدا نے اسلام قبول کرنے کے لیے کشادہ کر دیا ہے اور وہ نورِ الٰہی کے مرکب پر سوار ہے، ان بے نور سنگدلوں کی طرح ہے جن کے دلوں میں خدا کی ہدایت نہیں پہنچی

---

[1] "یھیج" "ھیجان" کے مادہ سے ہے۔ لغت میں یہ لفظ دو معنی میں آیا ہے۔ ایک پودے کا خشک اور زرد ہونا اور دوسرا حرکت میں آنا اور جوش و خروش دکھانا۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں معانی ایک ہی بنیاد کی طرف لوٹیں، کیونکہ جس وقت پودا خشک ہو جائے تو گویا پھر بکھر جانے اور حرکت و ہیجان کے لیے آمادہ و تیار ہو جاتا ہے۔

(افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ)[1]۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وائے ہے ان پر جو سخت اور نفوذ ناپذیر دل رکھتے ہیں اور جن میں ذکرِ خدا کچھ بھی اثر نہیں کرتا (فویل للقاسیۃ قلوبھم من ذکر اللہ)۔

نہ سود مند نصیحتیں ان پر اثر کرتی ہیں، نہ انذار و بشارت، نہ قرآن کی ہلا دینے والی آیات انھیں حرکت میں لاتی ہیں اور نہ ہی وحی کی حیات بخش بارش انہیں تقویٰ و فضیلت کے پھول اگاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ:

نہ طراوتی نہ برگی نہ گلی نہ سایہ دارند

نہ ان میں کچھ طراوت ہے، نہ ان پر کوئی پتہ ہے، نہ ہی پھول اور نہ سایہ ہے۔

ہاں! یہ لوگ ضلالِ مبین اور واضح گمراہی میں ہیں (اولئک فی ضلال مبین)۔

"قاسیۃ" "قسوۃ" کے مادہ سے خشونت، سختی اور نفوذ ناپذیری کے معنی میں ہے۔ اسی لیے سخت پتھروں کو "قاسی" کہتے ہیں، ان دلوں کو "قلوبِ قاسیہ" (سخت دل) کہا جاتا ہے کہ جو نورِ حق و ہدایت کے لیے کوئی رغبت اور جھکاؤ نہیں رکھتے، نرم اور رام نہیں ہوتے اور نورِ ہدایت ان میں نفوذ نہیں کرتا، فارسی میں اسے سنگدل سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہرحال یہ تعبیر شرح صدر، سینے کی کشادگی اور وسعتِ روح کے مقابلے میں آئی ہے، کیونکہ کشادگی قبولیت کے لیے آمادگی کے لیے کنایہ ہے۔ ایک بیابان اور وسیع گھر بہت سے انسانوں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے اور فراخ سینہ اور کشادہ روح زیادہ سے زیادہ حقائق کو قبول کرنے کے اہل ہوتی ہے۔

ایک روایت پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے، ابنِ مسعود کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر اسلامؐ سے اس آیہ کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا "افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ" انسان کا شرح صدر کیسے ہوتا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

اذا دخل النور فی القلب انشرح والفتح

جس وقت نور انسان کے دل میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ وسیع و کشادہ ہو جاتا ہے۔

میں نے عرض کیا: اے خدا کے رسول! اس کی نشانی کیا ہے؟

فرمایا:

الانابۃ الی دار الخلود، والتجافی عن دار الغرور، والاستعداد للموت قبل نزولہ

اس کی نشانی ہمیشہ کے گھر کی طرف توجہ، غرور کے گھر سے علیحدگی اور موت کے استقبال کے لیے

---

[1] اس آیت میں ایک محذوف ہے جو بعد والے جملے کے قرینے سے واضح ہو جاتا ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے:

افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ کمن ھو قاسی القلب لا یھتدی بنور

اس کے نزول سے پہلے آمادہ ہونا ہے [1]

تفسیر علی بن ابراہیم میں بیان ہوا ہے کہ " افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام " کا جملہ امیر المومنین علیؑ کے بارے میں نازل ہوا ہے اور بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ " فویل للقاسیۃ قلوبھم " کا جملہ ابولہب اور اس کے بیٹوں کے متعلق ہے [2]

یہ بات واضح ہے کہ یہ شانِ نزول حقیقت میں مفہوم کلی کے واضح مصادیق کے مانند ہے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ " فھو علی نور من ربہ " میں نور اور روشنی کا ذکر ایک سواری کے طور پر ہے کہ جس پر مومنین سوار ہوں گے ۔ اس کی سرعت رفتار عجیب، اس کا راستہ واضح اور اس کے دوڑنے کی طاقت تمام جہان پر محیط ہوگی ۔

شرح صدر اور قساوتِ قلب کے عوامل

قبولیتِ حق ، ادراکِ مطالب اور خود جوشی کے اعتبار سے سب انسان یکساں نہیں ہیں ۔ بعض ایک لطیف اشارے یا ایک مختصر سی گفتگو سے حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لیتے ہیں ، ایک تذکر انھیں بیدار کر دیتا ہے اور ایک ہی نصیحت ان کی روح میں ایک طوفان برپا کر دیتی ہے ۔ جبکہ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں کہ شدید ترین خطاب اور واضح ترین دلائل اور قوی ترین پند و نصائح بھی ان پر معمولی سا اثر نہیں ڈالتے اور یہ مسئلہ سادہ سا نہیں ہے ۔

قرآن اس سلسلے میں کیسی عمدہ تعبیر بیان کرتا ہے کہ بعض کو شرح صدر اور وسعتِ روح کا حامل اور بعض کو تنگ سینے والا قرار دیتا ہے ۔ جیسا کہ سورۂ انعام کی آیہ ۱۲۵ میں ہے :

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد فی السماء

جس شخص کو خدا ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینے کو اس طرح سے تنگ کر دیتا ہے جیسے وہ آسمان کی طرف چڑھ جائے گا ۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ افراد کے حالات کے مطالعے سے کامل طور پر واضح ہو جاتا ہے ۔ بعض کی روح تو اس طرح سے وسیع اور کشادہ ہوتی ہے کہ جس قدر حقائق اس میں داخل ہوں وہ آسانی کے ساتھ انھیں قبول کر لیتی ہے لیکن بعض کی روح اور فکر اس طرح سے محدود ہوتی ہے گویا کوئی جگہ کسی حقیقت کے لیے اس میں نہیں ہے ۔ جیسے ان کا دماغ ایک محفوظ جگہ میں آہنی دیواروں کے اندر بند ہے ۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۶۹۱ (تفسیر سورۂ زمر ، زیر بحث آیات کے ذیل میں) یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ شیخ مفید کی روضۃ الواعظین میں بھی نقل ہوئی ہے ۔

[2] تفسیر صافی ، زیر بحث آیات کے ذیل میں ۔

البتہ ان دونوں میں سے ہر ایک کے کچھ عوامل و اسباب ہیں۔ ارباب دانش اور صالح علماء کے ساتھ دائمی ربط و تعلق، مسلسل و پے در پے مطالعات، خود سازی اور تہذیب نفس گناہ سے پرہیز خصوصاً حرام غذا سے اور خدا کو یاد کرنا شرح صدر کے عوامل و اسباب میں سے ہے۔

اس کے برعکس جہالت، گناہ، ہٹ دھرمی، جنگ و جدال، برے لوگوں یعنی فاسقوں، فاجروں اور مجرموں کی صحبت، دنیا پرستی و ہوس پرستی، تنگی روح اور قساوت قلب کا باعث بنتی ہے۔

یہ جو قرآن کہتا ہے کہ خدا جس شخص کو ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا شرح صدر کر دیتا ہے یا جسے خدا چاہتا ہے کہ گمراہ کرے تو اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے۔ یہ "چاہنا" اور "نہ چاہنا" بلاوجہ نہیں ہوتا۔ اس کا سرچشمہ خود ہماری ہی ذات ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

اوحی اللہ عزوجل الی موسٰی یا موسٰی لا تفرح بکثرۃ المال، ولا تدع ذکری علٰی کل حال، فان کثرۃ المال تنسی الذنوب، وان ترک ذکری یقسی القلوب

خدا نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اے موسیٰ! مال کی کثرت پر خوش نہ ہونا اور میری یاد کو کسی حالت میں ترک نہ کرنا کیونکہ مال کی زیادتی اکثر گناہوں کی فراموشی کا سبب بن جاتی ہے اور میری یاد کو ترک کر دینا دل کو سخت کر دیتا ہے[1]

ایک دوسری حدیث میں امیرالمومنینؑ سے منقول ہے:

ما جفت الدموع الا لقسوۃ القلوب، وما قست القلوب الا لکثرۃ الذنوب

آنسو خشک نہیں ہوتے مگر دلوں کے سخت ہو جانے سے اور دل سخت نہیں ہوتے مگر گناہوں کی زیادتی سے[2]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو پروردگار کا ایک پیغام یہ تھا:

یا موسٰی لا تطول فی الدنیا املک، فیقسو قلبک، والقاسی القلب منی بعید

اے موسیٰ! دنیا میں اپنی آرزوؤں کو لمبا نہ کر، کیونکہ اس سے تیرا دل سخت اور انعطاف ناپذیر ہو جائے گا اور سنگدل مجھ سے دور ہوتے ہیں[3]

---

[1]، [2] بحارالانوار، جلد ۷، ص ۵۵ (حدیث ۲۲-۲۴)

[3] کافی جلد دوم، باب "القسوۃ" حدیث ۱

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے اس طرح منقول ہے:

لمتان: لمة من الشيطان و لمة من الملك، فلمة الملك الرقة و الفهم، ولمة الشيطان السهو والقسوة

القاء دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک القائے شیطانی اور دوسرا القائے ملک (فرشتہ) فرشتے کا القاء دل کی نرمی اور فہم و ذکاء میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور شیطانی القاء سہو و نسیان اور قساوتِ قلب کا باعث ہوتا ہے [1]

بہرحال شرح صدر حاصل کرنے اور قساوتِ قلبی سے رہائی پانے کے لیے بارگاہِ خداوندی کی طرف رُخ کرنا چاہیے تاکہ وہ نورِ الٰہی جس کا خدا نے وعدہ کیا ہے انسان کے دل میں روشن ہو۔ دل کے آئینے کو گناہ کے زنگ سے صاف و صیقل کرنا چاہیے اور دل کے گھر کو ہوا و ہوس کی غلاظت سے پاک رکھنا چاہیے تاکہ وہ محبوب کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہو۔ خوفِ خدا سے آنسو بہانا اور اس بے مثال محبوب کے عشق میں گریہ و بکا کرنا، رقتِ قلبی، نرم دلی اور روح کی وسعت کے لیے عجیب و غریب اثر رکھتا ہے اور آنکھ کا جمود اور خشک ہونا سنگدلی کی نشانی ہے۔

---

[1] کافی جلد دوم "باب القسوۃ" حدیث ۲

۲۳۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ○

۲۴۔ اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْۗءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ○

۲۵۔ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

۲۶۔ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۳۔ خدا نے بہترین بات نازل کی ہے، ایسی کتاب جس کی آیات (لطافت و زیبائی اور مضمون کی گہرائی کے لحاظ سے) ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، بار بار (اشتیاق انگیز انداز سے) دہرائی جانے والی، جس کی آیات سن کر وہ لوگ لرزہ براندام ہوجاتے ہیں جو اپنے پروردگار کے سامنے خشوع کرنے والے ہیں۔ پھر ان کا ظاہر و باطن نرم اور ذکرِ خدا کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت اس کے ساتھ کر دیتا ہے اور جسے خدا گمراہ کردے اس کے لیے کوئی راہنما نہیں ہے۔

۲۴۔ کیا وہ شخص جو اپنے چہرے اور ذات سے (خدا کے) دردناک عذاب کو قیامت کے دن ٹال دے (اس شخص کے مانند ہوسکتا ہے جس تک ہرگز جہنم کی آگ پہنچ ہی نہ سکے) اور ظالموں سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔

۲۵۔ جو لوگ ان سے پہلے تھے انھوں نے بھی ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، تو ان پر عذابِ الٰہی ایسی جگہ سے آیا جہاں کا وہ کوئی خیال ہی نہ رکھتے تھے۔

۲۶۔ خدا نے انھیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و خواری کا مزہ چکھایا اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے، اگر وہ جانتے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے عبداللہ بن مسعود سے نقل کیا ہے کہ ایک دن پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب کی ایک جماعت نے جو ملالتِ قلبی پیدا کر چکی تھی۔ عرض کیا: اے رسولِ خدا! کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ کوئی ایسی ہدایت کی بات ہمارے لیے بیان کرتے جس سے ہمارے دلوں سے ملالت و رنجیدگی کا زنگ اُتر جاتا؟ اس موقع پر ان آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور اس میں قرآن کا "احسن الحدیث" کے عنوان سے تعارف کروایا گیا۔[1]

تفسیر

گزشتہ آیات میں ان بندگانِ خدا کے بارے میں گفتگو تھی جو تمام باتیں سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کا انتخاب کرتے ہیں اور ایسے کشادہ سینوں اور شرح صدر کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی جو کلامِ حق قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

اب زیرِ بحث آیات میں اسی مناسبت سے قرآن کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے تاکہ گزشتہ مباحث کی تکمیل کرتے ہوئے توحید و معاد کے حلقوں کے ساتھ نبوت کے دلائل کے حلقے کا بھی اضافہ ہو جائے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا نے بہترین حدیث اور بہت اچھی گفتگو بھیجی ہے (اللہ نزل احسن الحدیث)۔

اس کے بعد قرآن کے تین امتیازات بیان کرتے ہوئے اس آسمانی کتاب کی یوں توصیف کی گئی ہے:

یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات ہم آہنگ اور ہم صدا ہیں اور لطافت و زیبائی اور بیان کی گہرائی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہ ہیں (کتابًا متشابهًا)۔

"متشابهًا" سے یہاں ایسا کلام مراد ہے جس کے مختلف حصے ایک دوسرے کے ساتھ ہم رنگ و ہم آہنگ ہیں، ان کے درمیان کسی قسم کا تضاد اور اختلاف نہیں ہے ایسا نہیں کہ اس کی آیتیں کچھ اچھی اور کچھ بُری ہوں، بلکہ ایک سے ایک بہتر ہے۔

یہ انسانی باتوں کی طرح نہیں ہے کہ جن میں جس قدر بھی غور کیا جائے اور جوں جوں وہ وسیع ہوتی جاتی ہیں ان میں خواہ مخواہ اختلافات

---

[1] یہ شانِ نزول کچھ مختلف الفاظ میں تفسیر کشاف (جلد ۴ ص ۱۲۲) و تفسیر قرطبی، تفسیر آلوسی اور تفسیر ابوالفتح رازی وغیرہ میں زیرِ بحث آیات کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔

حاصل ہوجاتا ہے ۔

یہ دونوں حالتیں جو سلوک الی اللہ کی منزلوں اور مختلف مرحلوں کی نشاندہی کرتی ہیں، پورے طور پر قابلِ ادراک ہیں ، آیات غضب اور پیغمبر کا مقامِ انذار دلوں کو لرزا دیتا ہے اس کے بعد رحمت والی آیتیں انھیں سکون بخشتی ہیں

حق تعالیٰ کی ذات کے بارے میں غور و فکر اور اس ذات پاک کی ابدیت و ازلیت اور لامتناہی ہونے کا مسئلہ انسان کو وحشت زدہ کر دیتا ہے کہ اسے کس طرح پہچانا جاسکتا ہے لیکن انفس و آفاق میں اس ذات پاک کے آثار و شواہد کا مطالعہ اسے سکون و آرام بخشتا ہے ۔[1]

تاریخ اسلام مومنین کے دلوں پر بلکہ غیر مومن افراد کے دلوں پر بھی کہ جن کے دل اہل تھے قرآن کی عجیب و غریب تاثیر کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے، اور یہ تاثیر اور انتہائی زیادہ کشش اس بات کی واضح و روشن دلیل ہے کہ یہ کتاب وحی کی صورت میں نازل ہوئی ہے ۔

ایک حدیث میں حضرت اسماء سے منقول ہے، وہ فرماتی ہیں :

كان اصحاب النبی حقا اذا قرء عليهم القرآن كما نعتهم الله — تدمع اعينهم و تقشعر جلودهم

اصحاب پیغمبر کے سامنے جس وقت قرآن کی تلاوت ہوتی تھی —— جیسا کہ قرآن نے ان کی تعریف توصیف کی ہے —— ان کی آنکھیں اشکبار ہوجاتی تھیں اور وہ لرزہ براندام ہوجاتے تھے ۔[2][3]

امیر المومنین علیؑ نے پرہیزگاروں کے بارے میں یہ حقیقت اعلیٰ ترین طریقے سے بیان فرمائی ہے ۔ آپؑ فرماتے ہیں :۔

اما الليل فصافون اقدامهم تالين لاجزاء القرآن يرتلونها ترتيلا يحزنون به انفسهم و يستثيرون به دواء دائهم، فاذا مروا بآية فيها تشويق ركنوا اليها طمعا و تطلعت نفوسهم اليها شوقا ، وظنوا انها نصب اعينهم، و اذا مروا بآية فيها تخويف اصغوا اليها مسامع قلوبهم وظنوا ان زفير جهنم و شهيقها فی اصول اذانهم

---

[1] "تقشعر" "قشعریرہ" کے مادہ سے ہے، جس کے لیے ارباب لغت اور مفسرین نے مختلف معانی بیان کیے ہیں ۔ یہ معانی ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں ۔ بعض نے اسے بدن کی جلد کے جمع ہوجانے کے معنی میں (وہ حالت جو انسان کو خوف کے وقت عارض ہوجاتی ہے) ۔ بعض نے اسے اس لرزش کے معنی میں سمجھا ہے ۔ جو ایسے موقعوں پر جسم میں پیدا ہوتی ہے اور بعض اسے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجانے کے معنی میں سمجھتے ہیں اور حقیقت میں یہ سب کے سب معانی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں ۔ (مفردات راغب ، لسان العرب ، تفسیر کشاف، تفسیر روح المعانی اور قرطبی کی طرف رجوع کریں) ۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۶۹۳

[3] آیاتِ قرآن کی انتہائی تاثیر کے سلسلے میں متعدد روایات ہم تفسیر نمونہ کی تیسری جلد میں بیان کر چکے ہیں ۔

وہ رات کو صف بستہ ہوتے ہیں، ٹھہر ٹھہر کر غور و فکر کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور اپنی روح کو اس کے ساتھ دل پذیر نغم میں مستغرق کر لیتے ہیں اور اپنے درد کی دوا اس سے طلب کرتے ہیں۔ جس وقت ایسی آیت سامنے آتی ہے جس میں تشویق ہو تو اس کے ساتھ دل بستگی پیدا کرتے ہیں، ان کی روح کی آنکھیں کمالِ شوق سے چمک اٹھتی ہیں اور وہ اسے اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں اور جس وقت وہ کسی ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں انذار و تخویف ہوتی ہے تو اسے دل کے کانوں کے ساتھ سنتے ہیں، گویا نالہ و فریاد کی صدائیں اور جہنم کے مہیب شعلوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی آوازیں ان کے کانوں میں گونج رہی ہوں۔

یہ اوصاف بیان کرنے کے بعد آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "اس کتاب میں خدا کی ہدایت ہے وہ جسے چاہتا ہے اس کے ساتھ ہدایت کرتا ہے" (ذلك هدى الله يهدى به من يشاء)۔

یہ درست ہے کہ قرآن سب کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے لیکن صرف حق طلب، حقیقت کے جویا اور پرہیزگار اس کے نورِ ہدایت سے فائدہ اٹھائیں گے اور جنھوں نے اپنے دل کے دریچے جان بوجھ کر اس کے سامنے بند کر لیے ہیں اور تعصب اور ہٹ دھرمی کی تاریکی ان کی روح پر چھائی ہوئی ہے، وہ نہ صرف یہ کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ عناد اور دشمنی کی وجہ سے ان کی ضلالت و گمراہی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس گفتگو کے بعد فرمایا گیا ہے: اور جس شخص کو خدا گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی ہادی و راہنما نہیں ہوگا (ومن يضلل الله فما له من هاد)۔

وہ گمراہی جس کی بنیادیں خود اس کے اپنے ہاتھ کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں اور اس کی بنیادیں اس کے غلط اعمال کی وجہ سے مضبوط ہوئی ہیں اور اسی بنا پر یہ بات انسانوں کے اصولِ اختیار اور آزادیٔ ارادہ کے ہرگز منافی نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں ظالموں اور مجرموں کا مومنین کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے، جن کی کیفیت پہلے بیان ہو چکی ہے تاکہ اس سے حقائق بہتر طور سے واضح ہو جائیں۔ فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جو اپنے چہرے سے خدا کے دردناک عذاب کو دور کر لیتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جو اس دن انتہائی امن و امان کے ساتھ بسر کرے گا اور ہرگز جہنم کی آگ اس تک نہ پہنچے گی (افمن يتقى بوجهه سوء العذاب يوم القيامة)[1]۔

وہ نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا ضروری ہے، یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے: وہ اپنے چہرے کے ساتھ عذاب کو اپنے سے دور کرے گا۔

---

[1] اس جملے میں ایک محذوف ہے اور یہ تقدیر میں اس طرح ہے:
افمن يتقى بوجهه سوء العذاب يوم القيامة كمن هو آمن لا تمسه النار
کیا وہ شخص جو اپنے چہرے سے دردناک عذاب دور کر لیتا ہے اس شخص کے مانند ہے جو امن میں ہے اور آگ اس تک نہیں پہنچتی۔

یہ تعبیر اس بنا پر ہے کیونکہ "وجہ" (چہرہ) انسان کے اشرف اعضاء میں سے ہے اور انسان کے اہم حواس (آنکھ، کان ناک اور زبان) اس میں موجود ہیں اور اصولی طور پر انسان کی پہچان بھی چہرے کے ذریعے ہی ہوتی ہے اور ان ہی وجوہات کی بنا پر جس وقت اسے کوئی خطرہ ہوتا ہے تو اپنے ہاتھ، بازو اور جسم کے دوسرے اعضاء کو اس کے سامنے ڈھال بنا لیتا ہے تاکہ خطرہ دُور کرے۔

لیکن دوزخی ظالموں کی حالت اس دن کچھ اس طرح کی ہوگی کہ انھیں اپنے چہرے کے ساتھ ہی اپنا دفاع کرنا پڑے گا کیونکہ ان کے ہاتھ پاؤں تو زنجیر میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ جیسا کہ سُورۂ یٰس کی آیہ ۸ میں ہے:۔

ہم نے ان کی گردن میں طوق ڈال رکھے ہیں (اور ان کے ہاتھوں کو ان کے ساتھ جکڑا ہوا ہے) ان کے یہ طوق ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہوں گے، لہٰذا ان کے سر اوپر کی طرف ہوں گے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ تعبیر اس بنا پر ہے کہ انھیں منہ کے بل آگ میں ڈالا جائے گا لہٰذا ان کا پہلا عضو جو آگ میں پہنچے گا وہ ان کا چہرہ ہے، جیسا کہ سُورۂ نمل کی آیہ ۹۰ میں ہے:

ومن جاء بالسیئۃ فکبت وجوھھم فی النار

اور جو لوگ بُرا کام انجام دیں گے وہ منہ کے بل آگ میں ڈالے جائیں گے۔

کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تعبیر صرف جہنم کی آگ کے مقابلے میں ان کا اپنا دفاع نہ کر سکنے کے لیے کنایہ ہے۔

یہ تینوں تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ یہ سب آیت کے مفہوم میں جمع ہوں۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اس دن ظالموں سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو (وقیل للظالمین ذوقوا ما کنتم تکسبون)۔

ہاں! عذاب کے فرشتے ان سے یہ دردناک حقیقت بیان کریں گے کہ یہ تمھارے ہی اعمال ہیں جو تمھارے سامنے آئے ہیں اور تمھیں تکلیف دے رہے ہیں اور یہ بیان خود ان کے لیے ایک اور روحانی اذیت ہوگی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ اپنے اعمال کی سزا اور عذاب بھگتو بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اپنے اعمال کو چکھو اور یہ بات "مجسم اعمال" پر بھی ایک اور شاہد ہے۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ قیامت میں ان کے لیے دردناک عذاب کی طرف ایک اشارہ تھا۔ بعد والی آیت ان کے لیے دنیاوی عذاب کی بات کرتی ہے تاکہ کہیں وہ یہ تصور نہ کرنے لگیں کہ وہ اس دنیاوی زندگی میں تو امان میں ہی رہیں گے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے، انھوں نے بھی ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، تو عذاب الٰہی ایسی جگہ سے ان پر نازل ہوا جہاں کا انھیں گمان بھی نہیں تھا (کذب الذین من قبلھم فاتاھم العذاب من حیث لا یشعرون)۔

اگر انسان کو کسی ایسی جگہ سے ضرب لگے جہاں سے اسے توقع ہو تو وہ زیادہ دردناک نہیں ہوتی لیکن اگر اسے کسی ایسی جگہ سے ضرب لگے جہاں سے اسے ہرگز توقع نہ ہو تو وہ اس کے لیے کہیں زیادہ دردناک ہوتی ہے مگر اس کے نزدیک ترین دوستوں سے اس کی

زندگی کی محبوب ترین چیزوں سے، اس پانی سے جو اس کی زندگی کا سبب ہے، اس بادِ نسیم سے جو اس کی نشاط و خوشی کا موجب ہے، اس سکون و راحت والی زمین سے جو اس کی استراحت اور امن و امان کا مقام سمجھی جاتی ہے۔

ہاں! عذابِ الٰہی کا ان طریقوں سے نزول بہت ہی دردناک ہے اور یہ وہی چیز ہے جو قوم نوح، عاد و ثمود، قوم لوط، قوم فرعون و قارون وغیرہ کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قوم انھی میں سے کسی ایک طریقے سے گرفتارِ عذاب ہوئی کہ جس کے بارے میں اسے ہرگز توقع نہ تھی۔

آخری زیر بحث آیت میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ان کے لیے دنیاوی عذاب صرف جسمانی پہلو ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ نفسیاتی و روحانی عذاب بھی تھا، فرمایا گیا ہے: خدا نے انھیں اس دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و خواری کا مزہ چکھایا (فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا)۔[1]

ہاں! اگر انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے لیکن وہ آبرومندانہ اور سربلندی کے ساتھ جان دے دے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ذلت و خواری کے ساتھ جان دے اور بے آبروئی اور رسوائی کے ساتھ عذاب کے چنگل میں گرفتار ہو جائے۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود آخرت کا عذاب زیادہ سخت زیادہ شدید اور زیادہ دردناک ہے، اگر وہ جانتے (وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ)۔

لفظ "اکبر" (زیادہ بڑا) عذاب کی شدت اور سختی کے لیے کنایہ ہے۔

ایک نکتہ

ان آیات کے ذیل میں کچھ روایات وارد ہوئی ہیں جو آیات کے مفاہیم کے زیادہ وسیع افق ہمارے سامنے مجسم کرتی ہیں۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ کے چچا حضرت عباسؓ سے نقل کرتے ہیں، کہ آپؐ نے فرمایا:

اذا اقشعر جلد العبد من خشية الله تحاتت عنه ذنوبه كما يتحات عن الشجرة اليابسة ورقها

جب کسی بندے کا بدن خوفِ خدا سے لرز اُٹھے تو اس کے گناہ اس طرح سے گرتے ہیں جس طرح سے درختوں کے خشک پتے جھڑتے ہیں۔[2]

---

[1] "خزی" خواری اور ذلت کے معنی میں ہے اور رسوائی و فضیحت کے معنی میں بھی آیا ہے (لسان العرب میں "خزی" کے مادہ کی طرف رجوع کریں)۔

[2] مجمع البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں، یہ روایت ابوالفتوح رازی اور قرطبی نے بھی کچھ فرق کے ساتھ نقل کی ہے۔

۲۷۔ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۚ

۲۸۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

۲۹۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

۳۰۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝

۳۱۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۝ ع

ترجمہ

۲۷۔ ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال پیش کی ہے، شاید وہ متوجہ ہوں۔

۲۸۔ یہ قرآن فصیح (عربی) اور ہر قسم کی کجی اور نادرستی سے خالی ہے، شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔

۲۹۔ خدا نے ایک مثال بیان کی ہے: ایک شخص تو کئی شرکاء کی ملکیت ہے جو ہمیشہ اس کے بارے میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور ایک شخص ایسا ہے جو صرف ایک ہی شخص کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ حمد خدا کے لیے مخصوص ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

۳۰۔ تو مر جائے گا اور وہ بھی ضرور مر جائیں گے۔

۳۱۔ پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے پاس جھگڑو گے۔

تفسیر
قرآن میں کوئی کجی نہیں

ان آیات میں قرآن مجید اور اس کی خصوصیات کے بارے میں اسی طرح سے بحث جاری ہے اور یہ گزشتہ مباحث کا تسلسل ہیں۔

پہلے قرآن کی جامعیت کے سلسلہ میں اس طرح گفتگو ہے:

ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال پیش کی ہے۔ (و لقد ضربنا للناس فی ھٰذا القرآن من کل مثل)۔

گزشتہ ستم گروں اور سرکشوں کا دردناک انجام، گناہ کے ہولناک نتائج، مختلف پند و نصائح، اسرارِ خلقت، نظام آفرینش اور محکم قوانین و احکام کے بارے میں۔ خلاصہ یہ کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے جو کچھ ضروری ہے ہم نے مثالوں کے پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔

شاید وہ متوجہ ہو جائیں اور راہِ خطا سے صراطِ مستقیم کی طرف لوٹ آئیں (لعلھم یتذکرون)۔

لغتِ عرب میں مثل ہر اس بات کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت کو مجسم کر دے یا کسی چیز کی تعریف و توصیف کرے یا ایک چیز کی دوسری چیز سے تشبیہ دے۔ ان مفاہیم کی طرف توجہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ یہ تعبیر قرآن کے تمام حقائق و مطالب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور اس کی جامعیت کو واضح کرتی ہے۔

اس کے بعد قرآن کی ایک دوسری توصیف ذکر کی گئی ہے: یہ قرآن فصیح ہے اور ہر قسم کی کجی و انحراف اور تناقض و تضاد سے خالی ہے (قرآنًا عربیًّا غیر ذی عوج)۔[1]

حقیقت میں یہاں قرآن کے تین اوصاف بیان ہوئے ہیں۔

پہلی تعبیر "قرآنًا" جو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آیات مرتباً پڑھی جاتی ہیں، نماز میں اور نماز کے علاوہ خلوت میں اور اجتماع میں اور اسلام کی پوری تاریخ میں اور اختتامِ جہاں تک اور اس طرح سے یہ ایک ایسا نورِ ہدایت ہے جو ہمیشہ درخشاں رہنے والا ہے۔

---

[1] "قرآنًا عربیًّا" اعراب کے لحاظ سے "القرآن" کے لیے "حال" ہے جو اس سے پہلے ذکر ہوا ہے لیکن چونکہ "قرآنًا" وصفی پہلو نہیں رکھتا لہٰذا بعض اسے "حال" کے لیے تمہید سمجھتے ہیں جو "عربیًّا" ہے اور بعض "مقروءًا" کے معنی میں لیتے ہیں جو وصفی معنی ہے اور بعض اسے ایک مقدر فعل سے منصوب سمجھتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اس خدائی کلام کی فصاحت، شیرینی اور کشش ہے کہ جسے "عربیًا" کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ "عربی" کا ایک معنی "فصیح" ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کسی قسم کی کجی اور ٹیڑھا پن اس میں نہیں ہے۔ اس کی آیات ہم آہنگ، اس کی تعبیریں منہ بولتی اور اس کی عبارتیں ایک دوسرے کی مفسر ہیں۔[1]

بہت سے اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر نے کہا ہے کہ "عوج" (عین کی زیر کے ساتھ) معنوی انحرافات کے معنی میں ہے، جبکہ "عوج" (عین کی فتح کے ساتھ) ظاہری انحراف کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ (البتہ پہلی تعبیر کبھی کبھی ظاہری انحرافات کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے، مثلاً سورۂ طٰہٰ کی آیہ ۱۰۷ :۔

لا ترٰی فیھا عوجًا ولا امتًا

تو اس زمین میں کسی قسم کی کجی اور بلندی نہیں دیکھے گا۔

لہٰذا بعض اربابِ لغت پہلی تعبیر کو زیادہ عام جانتے ہیں۔[2]

بہرحال ان تمام اوصاف کے ہوتے ہوئے قرآن کے نزول کا ہدف و مقصد یہ تھا کہ شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں" (لعلھم یتقون)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں "لعلھم یتذکرون" آیا تھا اور یہاں "لعلھم یتقون" کیونکہ ہمیشہ یاددہانی اور توجہ "تقویٰ" کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہوتا ہے اور پرہیزگاری اسی درخت کا ایک پھل ہے۔

اس کے بعد قرآن ایک مثال پیش کرتا ہے اور موحد و مشرک کے انجام کی ایک فصیح اور خوبصورت مثال کے ذریعے اس طرح تصویر کشی کرتا ہے: خدا نے ایک مثال بیان کی ہے کہ ایک تو ایسا آدمی ہے جو ایسے شرکاء کا غلام ہے جو ہمیشہ اس کے بارے میں جھگڑتے رہتے ہیں (ضرب اللہ مثلًا رجلًا فیہ شرکاء متشاکسون)۔[3]

ایک ایسا غلام ہے جس کے کئی مالک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اسے کوئی کام کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ایک کہتا ہے فلاں کام انجام دو۔ دوسرا کہتا ہے یہ کام مت کرو۔ وہ ان دونوں کے درمیان پریشان ہے اور ان متضاد احکام کے درمیان حیران کھڑا ہے اور اسے سمجھ نہیں آرہی کہ اپنے آپ کو کس کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔

اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ اس کی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک اسے دوسرے کے حوالے کر دیتا ہے اور دوسرا

---

[1] "عوج" چونکہ نکرہ کی صورت میں سیاقِ نفی میں واقع ہوا ہے لہٰذا عموم کا فائدہ دیتا ہے، اس لیے ہر قسم کی کجی اور انحراف کی قرآن سے نفی کرتا ہے۔

[2] "مفردات راغب"، لسان العرب اور مختلف تفاسیر کی طرف رجوع کریں۔

[3] "متشاکسون" "شکاسۃ" کے مادہ سے بداخلاقی، جھگڑے اور خصومت کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "متشاکس" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو تعصب اور بدخلقی کے ساتھ بحث و نزاع اور جھگڑے میں مشغول ہو۔

اسے پہلے کی طرف پلٹا دیتا ہے لہٰذا اس لحاظ سے بھی وہ محروم، بیچارہ، بے نوا اور سرگرداں ہے۔ پھر ایک اور شخص ہے جو ایک ہی شخص کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے (و رجلاً سلماً لرجل)۔

اس کا راستہ اور پروگرام مشخص ہے۔ اس کے اوپر جسے اختیار ہے وہ معلوم ہے۔ نہ شک و تردد میں گرفتار ہے، نہ کوئی تضاد ہے نہ تناقض۔ سکونِ قلب اور آرام روح کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے اور پوری دلجمعی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے وہ ایسے شخص کی سرپرستی میں ہے جو ہر چیز میں، ہر حال میں اور ہر جگہ اس کی حمایت کرتا ہے" کیا یہ دونوں کیساں ہیں" (ھل یستویان مثلاً)۔

"مشرک" اور "موحد" کا یہی حال ہے، مشرکین طرح طرح کے تضادات میں غوطہ زن ہیں۔ ہر روز ایک معبود کے ساتھ دل باندھتے ہیں اور ہر وقت کسی ایک رب کا رُخ کرتے ہیں، نہ کوئی آرام و سکون حاصل ہے نہ کچھ اطمینان ہے اور نہ ہی کوئی واضح راستہ۔

لیکن موحدین کا دل خدا کے عشق کا گرویدہ ہے۔ انھوں نے ساری کائنات میں سے اسی کو انتخاب کیا ہے اور ہر حالت میں اس کے لطف و کرم کے سایے میں پناہ لیتے ہیں جو ہر چیز سے بالا ہے۔ انھوں نے ماسوا اللہ سے آنکھ اٹھالی ہے اور اسی پر نظریں جمادی ہیں۔ ان کا راستہ اور پروگرام واضح ہے اور ان کی سرنوشت اور انجام روشن ہے۔

ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

انا ذالک الرجل السلم لرسول اللہ (ص)

میں ہوں وہ مرد جو ہمیشہ رسول اللہؐ کے لیے سرِ تسلیم خم کیے رہتا تھا[1]

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے:

الرجل السلم للرجل حقا علی و شیعتہ

وہ مرد جو حقیقتاً سرِ تسلیم خم کیے تھا وہ علی اور ان کے شیعہ تھے[2]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: حمد و سپاس خدا کے ساتھ مخصوص ہے (الحمد للہ)۔

وہ خدا جس نے ان واضح و روشن مثالوں کے ذریعے تمھیں راستہ دکھایا ہے اور تمھیں حق کی باطل سے تمیز کے لیے واضح دلائل دیئے ہیں، وہ خدا جو سب کو اخلاص کی طرف دعوت دیتا ہے اور اخلاص کے سایے میں آرام و سکون بخشتا ہے، کون سی نعمت اس سے بالاتر ہے؟ اور کون سا شکر و حمد اس سے زیادہ ضروری ہے؟

"لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے" اور ان واضح دلائل کے باوجود، حبِّ دنیا اور سرکش مادی خواہشات کی خاطر حقیقت کی راہ اختیار نہیں کرتے (بل اکثرھم لا یعلمون)۔

گزشتہ آیات میں توحید و شرک کے بارے میں بحث تھی اس کے بعد اب قیامت کے میدان میں توحید و شرک کے نتائج کے

---

[1]، [2] پہلی حدیث کو "حاکم ابوالقاسم حسکانی" نے شواہد التنزیل میں اور دوسری کو طبرسی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے (مجمع البیان زیرِ بحث آیات کے ذیل میں)۔

بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

بات موت کے مسئلے سے شروع کی گئی ہے جو قیامت کا دروازہ ہے اور سب انسانوں کے لیے موت کے قانون کی عمومیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تو بھی مرجائے گا اور وہ بھی سب کے سب مرجائیں گے" (انک میت و انھم میتون)۔[1]

ہاں موت ایسے مسائل میں سے ہے جن میں سب لوگ یکساں ہیں، اس میں کسی قسم کا استثناء اور فرق موجود نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی راہ ہے جسے سب کو طے کرنا پڑے گا بہ الفاظ دیگر یہ وہ اونٹ ہے جو ہر شخص کے گھر میں بیٹھ چکا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے دشمن آپؐ کی موت کے منتظر رہتے تھے اور وہ اس بات پر خوش تھے کہ آخر کار وہ مرجائیں گے تو قرآن اس آیت میں انھیں جواب دیتا ہے کہ اگر پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مرجائے گا تو کیا تم زندہ رہو گے؟

سورۂ انبیاء کی آیہ ۳۴ میں بھی ہے:

افائن مت فھم الخالدون

کیا اگر تو مرجائے گا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہیں گے؟

اس کے بعد قرآن بحث کو قیامت کی عدالت میں لے گیا ہے اور میدانِ محشر میں، بندوں کے جھگڑے کی تصویر کشی کرتا ہے اور فرماتا ہے: پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے پاس جھگڑنے کے لیے کھڑے ہوگے (ثم انکم یوم القیامۃ عند ربکم تختصمون)۔

"تختصمون" "اختصام" کے مادہ سے دو ایسے افراد یا دو گروہوں کے درمیان نزاع وجدال کے معنی میں ہے، جن میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کی بات کو باطل کرے۔ کبھی تو ایک حق پر ہوتا ہے اور دوسرا باطل پر اور کبھی ممکن ہے کہ دونوں ہی باطل پر ہوں۔ جیسا کہ اہلِ باطل کا ایک دوسرے کے ساتھ مخاصمہ اور جھگڑا۔ اس بارے میں مفسرین میں بحث ہے کہ کیا یہ حکم عمومیت رکھتا ہے یا نہیں؟

بعض نے تو یہ تصور کیا ہے کہ یہ جھگڑا مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ مسلمانوں اور اہل قبلہ کے درمیان بھی جھگڑا ممکن ہے۔ اس موقع پر ابو سعید خدری سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ:

ہم پیغمبر خدا کے زمانے میں کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ ہم مسلمانوں کے درمیان مخاصمت ہوگی۔ ہم کہتے تھے کہ

---

[1] البتہ "انک میت و انھم میتون" کا جملہ حال حاضر میں سب کے مرجانے کی خبر دیتا ہے لیکن اصطلاح کے مطابق "مضارع متحقق الوقوع" ہے جو کبھی حال کی صورت میں اور کبھی ماضی کی صورت میں بیان ہوتا ہے۔

ہمارا پروردگار ایک، ہمارا پیغمبر ایک، ہمارا دین ایک ہے تو اس کے باوجود جھگڑا کس طرح ممکن ہے، یہاں تک کہ صفین کا دن آپہنچا اور دو گروہ جن میں سے ہر ایک ظاہراً مسلمان تھے (اگرچہ ایک حقیقی مسلمان تھا اور دوسرا اسلام کا مدعی تھا)۔ ایک دوسرے کے مقابلے میں تلوار کھینچ کر کھڑے ہو گئے تو ہم نے کہا، ہاں! یہ آیت ہمارے بارے میں بھی ہے۔[1]

لیکن بعد والی آیات بتاتی ہیں کہ یہ مخاصمت ایک طرف سے پیغمبر اکرمؐ اور مومنین اور دوسری طرف سے مشرکین اور مکذبین کے درمیان ہوگی۔

تاریخِ اسلام میں مشہور ہے کہ حضرت عمر نے وفات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کی وفات کا انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ رسول اللہ مر جائیں وہ تو اپنے پروردگار کی طرف گئے ہیں۔ جیسے موسیٰ بن عمران چالیس راتوں تک اپنی قوم سے غائب رہے تھے اور پھر ان کی طرف واپس لوٹ آئے۔ خدا کی قسم رسول اللہ بھی پلٹ کر آئیں گے جیسے موسیٰ پلٹ کر آئے تھے جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا مر چکے ہیں، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں، یہ بات ابوبکر تک پہنچی تو وہ عمر کے پاس آئے اور وہ بعض آیات جو پیغمبر اکرمؐ کی موت پر دلالت کرتی تھیں وہ عمر کے سامنے پڑھیں تو عمر خاموش ہو گئے اور کہا خدا کی قسم یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے یہ آیت سنی ہے۔[2]

---

[1] مجمع البیان جلد ۸ ص ۴۹۷

[2] سیرۃ ابن ہشام، جلد ۴ ص ۲۰۵، ۲۰۶، تلخیص کے ساتھ۔ یہ ماجرا کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۳۲۲، ص ۳۲۴ پر بھی نقل ہوا ہے۔

ان آیات میں بھی وہی بحث جاری ہے اور لوگوں کو دو گروہوں "مکذبین" اور "مصدقین" میں تقسیم کر رہی ہیں۔

پہلا گروہ دو صفات کا حامل ہے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

اس سے زیادہ ستم گر اور کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ باندھے اور سچی اور حق بات جو اس کے پاس آئے اس کی تکذیب کرے۔ (فمن اظلم ممّن کذب علی اللہ وکذّب بالصدق اذ جاءہ)۔

بے ایمان اور مشرک لوگ خدا پر بہت ہی زیادہ جھوٹ باندھا کرتے تھے۔ کبھی فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے کبھی عیسیٰ کو اس کا بیٹا کہتے تھے۔ کبھی بتوں کو اس کی بارگاہ میں شفیع قرار دیتے تھے اور کبھی حلال و حرام کے سلسلے میں جھوٹے احکام گھڑ لیا کرتے تھے اور اس کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔

باقی رہی وہ سچی بات جو ان کے پاس آئی اور انھوں نے اس کی تکذیب کی وہ وہی آسمانی وحی قرآن مجید ہے۔

آیت کے آخر میں ایک مختصر سے جملہ میں اس قسم کے افراد کی سزا اس طرح بیان کی گئی ہے: کیا جہنم کافروں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے؟ (الیس فی جھنم مثوی للکافرین)[1]

جب "جہنم" کا نام لیا جاتا ہے تو باقی دردناک عذاب کا بھی اس میں خلاصہ بیان ہو جاتا ہے۔

دوسرے گروہ کے بارے میں بھی دو اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور جو شخص سچی اور حق بات لے کر آئے اور وہ شخص جو اس کی تصدیق کرے، وہی تو واقعی پرہیزگار ہیں (والذی جاء بالصدق وصدّق بہ اولئک ھم المتقون)۔

اہل بیتؑ کی بعض روایات میں "والذی جاء بالصدق" کی پیغمبر اکرمؐ سے تفسیر بیان ہوئی ہے، ان میں "وصدّق بہ" سے علی علیہ السلام مراد لیے گئے ہیں[2] لیکن اس سے مراد واضح مصداق کا بیان ہے کیونکہ "اولئک ھم المتقون" (وہی تو متقی ہیں) کا جملہ آیت کی عمومیت کی دلیل ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت سے ذاتِ پیغمبر مراد لینا جو وحی کے لانے والے بھی ہیں اور اس کے تصدیق کرنے والے بھی، بیانِ مصداق ہی ہونا چاہیے نہ کہ آیت کے تمام مفہوم کا بیان۔

اسی لیے بعض مفسرین نے "والذی جاء بالصدق" سے تمام پیغمبر مراد لیے ہیں اور "صدّق بہ" سے ان کے سچے پیروکار مراد لیے ہیں جن میں دنیا کے تمام پرہیزگار شامل ہیں۔

اس آیت کی ایک اور عمدہ تفسیر موجود ہے جو سب سے زیادہ وسیع اور جامع تر ہے، اگرچہ مفسرین نے بہت کم اس کی طرف توجہ کی ہے

---

[1] "مثوی" "ثواء" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے ایسا قیام جو دائمی ہو اس بنا پر "مثوی" یہاں ہمیشگی کی اور دائمی جگہ کے معنی میں ہے۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں

لیکن وہ آیات کے ظاہر کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے اور وہ یہ ہے کہ " الذی جاء بالصدق " وحی کا پیغام لانے والوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام ایسے افراد جو ان کے مکتب کے مبلغ تھے اور حق و صداقت کی باتوں کے مروج رہے ہیں اس صف میں شامل ہیں اور اس صورت میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ دونوں جملے ایک ہی گروہ پر منطبق ہوں (جیسا کہ آیت کی تعبیر کا ظاہر ہے، کیونکہ " والذی " صرف ایک مرتبہ ذکر ہوا ہے)

گویا یہ گفتگو ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو صدق اور سچائی کے لانے والے بھی ہیں اور اس پر عمل کرنے والے بھی۔ یہ ان لوگوں کی بات ہے جنھوں نے مکتب وحی اور پروردگار کی حق بات کو سارے عالم میں نشر کیا ہے اور خود اس پر ایمان رکھتے ہیں، چاہے وہ انبیاء و مرسلین ہوں یا ائمہ معصومین یا ان کے مکتب کو بیان کرنے والے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وحی کے بجائے " صدق " کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف وہ بات جس میں جھوٹ اور غلطی کا احتمال نہیں ہے، وہی ہے جو وحی کے ذریعے پروردگار کی طرف سے نازل ہوتی ہے اور تقویٰ و پرہیز گاری صرف مکتبِ انبیاء کی تعلیمات کے سایے میں اور اس کی دل و جان سے تصدیق کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

بعد والی آیات میں ایسے لوگوں کیلئے تین عظیم اجر بیان کیے گئے ہیں، پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ جو کچھ بھی چاہیں گے ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے موجود ہے اور نیکو کاروں کی یہی تو جزا ہے۔ (لھم مایشاءون عند ربھم ذالک جزاء المحسنین)۔

اس آیت کے مفہوم کی وسعت اس قدر ہے کہ تمام روحانی اور مادی نعمتیں اس میں شامل ہیں وہ سب کچھ ہمارے تصور اور وہم و گمان میں سما سکے یا نہ سما سکے۔

بعض نے یہاں ایک سوال پیش کیا ہے کہ کیا اگر وہ انبیاء و اولیاء کے مقامات کا تقاضا کریں جو خود ان سے برتر ہیں تو وہ بھی ان کو دیا جائے گا؟

یہ سوال کرنے والے اس حقیقت سے غافل ہیں کہ بہشتی لوگ چونکہ حقیقت بین آنکھ رکھتے ہیں اس لیے وہ ہرگز ایسی چیز کی فکر میں نہیں پڑیں گے جو حق و عدالت کے برخلاف اور اہلیت و جزا کے قانون کے برخلاف ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ وہ افراد جو ایمان و عمل کے مختلف درجات میں ہیں، ان کی ایک جزا ہو، بہشتی ایک محال چیز کی آرزو کیسے کریں گے؟ اس کے باوجود وہ روحانی طور پر اس طرح ہیں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اسی پر راضی ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی حسد پایا ہی نہیں جاتا۔

ہم جانتے ہیں کہ آخرت کے اجر، یہاں تک کہ تفضلاتِ الٰہی بھی ان اہلیتوں کی بنیاد پر ہیں جو انسان اس دنیا میں حاصل کرتا ہے، جو شخص یہ جانتا ہے کہ اس کا ایمان و عمل اس دنیا میں دوسرے کے ایمان و عمل کے برابر نہیں تھا وہ کبھی بھی ان کے مقام کی آرزو نہیں کرے گا کیونکہ یہ ایک غیر منطقی آرزو ہے۔

" عند ربھم " (ان کے پروردگار کے نزدیک) کی تعبیر ان کے بارے میں انتہائی لطفِ الٰہی کا بیان ہے گویا وہ ہمیشہ کے لیے اس کے مہمان ہیں اور وہ جو کچھ چاہیں گے اس کے پاس موجود پائیں گے۔

"ذالك جزاء المحسنين" (یہ ہے نیکوکاروں کی جزا) اس میں ضمیر کے بجائے اسم ظاہر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان جزاؤں کی علت اصلی ان کی نیکی ہی ہے۔

ان کی دوسری اور تیسری جزا اس صورت میں بیان کی گئی ہے: وہ چاہتے ہیں کہ خدا ان کے ان بدترین اعمال کو جو انھوں نے انجام دیئے ہیں بخش دے اور ان کی تلافی کردے، انھیں ان کے ان بہترین اعمال کا جو انھوں نے انجام دیئے ہیں اجر عطا کرے۔ (لیکفر اللہ عنھم اسوء الذی عملوا ویجزیھم اجرھم باحسن الذی کانوا یعملون)۔[1]

کتنی عمدہ تعبیر ہے؟ ایک طرف تو وہ یہ تقاضا رکھتے ہیں کہ ان کے بدترین اعمال لطف الٰہی کے سایے میں چھپا دیئے جائیں اور توبہ کے پانی سے یہ داغ ان کے دامن سے دھل جائیں اور دوسری طرف سے ان کا یہ تقاضا ہے کہ خدا ان کے بہترین اعمال کو اجر و پاداش کا معیار قرار دے اور ان کے تمام اعمال کو اسی حساب سے قبول کرے۔

خداوند تعالیٰ نے بھی ان کی درخواست کو اسی تعبیر کے ساتھ قبول کرلیا ہے جیسا کہ ان آیات میں بیان کیا گیا ہے یعنی وہ بدترین کو بخش دے گا اور بہترین کو اجر و پاداش کا معیار قرار دے گا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جس وقت بڑی بڑی لغزشیں عفو الٰہی کی مشمول ہوجائیں، تو باقی تو بطریق اولیٰ مشمول ہوجائیں گی۔ عمدہ بات یہ ہے کہ انسان کی سب سے زیادہ پریشانی بڑی بڑی لغزشوں کے بارے میں ہی ہوتی ہے اور اسی وجہ سے مومنین کو زیادہ تر اسی کی فکر ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا گزشتہ آیات میں گفتگو پیغمبروں اور ان کے پیروکاروں کے بارے میں ہی نہیں تھی؟ وہ بڑی بڑی لغزشیں کس طرح کرتے ہیں؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ جب کسی فعل کی کسی گروہ کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ وہ سب کے سب اس فعل کے مرتکب ہوئے تھے بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ ان میں سے کچھ نے اسے انجام دیا ہو۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ بنی عباس نے رسول اللہؐ کی مسند خلافت پر ناحق قبضہ کیا تھا، تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب خلافت تک پہنچے تھے بلکہ کافی ہے کہ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہو۔

زیر بحث آیت میں بھی پیغام وحی لانے والوں اور ان کے مکتب کے پیروکاروں میں سے بعض کی کچھ لغزشیں تھیں کہ جن سے خدا ان کے نیک اعمال کی وجہ سے درگزر کرے گا۔

بہرحال غفران و بخشش کا ذکر اجر و ثواب سے پہلے اس بنا پر ہے کہ پہلے انھیں اپنے آپ کو پاک و صاف کرنا چاہیے اس کے بعد قرب خدا کی بساط پر قدم رکھیں۔ پہلے عذاب الٰہی سے آسودہ خاطر ہولیں کہ جنت کی نعمتیں انھیں نصیب ہوں۔

---

[1] اس بارے میں کہ "لیکفر اللہ عنھم" کس سے متعلق ہے، مفسرین نے بہت سے احتمال ذکر کیے ہیں لیکن معنی کے لحاظ سے جو کچھ زیادہ مناسب نظر آتا ہے یہ ہے کہ "احسنوا" متعلق فعل ہے جو "المحسنین" سے سمجھ میں آتا ہے اور وہ تقدیر میں اس طرح ہے۔

(ذالك جزاء المحسنين احسنوا ليكفر الله عنهم .....)

ہاں انھوں نے نیکیاں کیں تاکہ خدا ان کی لغزشوں کو بخش دے اور انھیں بہترین اجر دے۔

پہلا صدیق کون تھا؟

بہت سے مفسرین اسلام نے، خواہ وہ شیعہ ہوں یا اہل سنت "والذی جاء بالصدق وصدّق به" کی آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ "الذی جاء بالصدق" سے مراد پیغمبر اکرمؐ ہیں اور "صدّق به" سے مراد علی علیہ السلام ہیں۔

اسلام کے بزرگ مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں اور ابو الفتوح رازی نے روح الجنان میں اس چیز کو ائمہ اہل بیت سے نقل کیا ہے۔

اہل سنت کے علماء اور مفسرین کی ایک جماعت نے اسے پیغمبر اسلامؐ سے ابوہریرہ کی وساطت سے یا دوسرے طرق سے روایت کیا ہے۔ مثلاً:

علامہ ابن مغازلی نے مناقب میں، علامہ گنجی نے کفایۃ الطالب میں، مشہور مفسر قرطبی نے اپنی تفسیر میں، علامہ سیوطی نے درالمنثور میں اور اسی طرح سے آلوسی نے روح المعانی میں[1]

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ اس قسم کی تفاسیر روشن ترین اور زیادہ واضح مصادیق بیان کے لیے ہوتی ہیں اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ علیؑ، پیغمبر اسلامؐ کے پیروکاروں اور آپ کی تصدیق کرنے والوں میں سب سے مقدم تھے اور پہلے "صدیق" آپؑ ہی ہیں۔

علماء اسلام میں سے کوئی بھی اس حقیقت کا منکر نہیں ہے کہ علیؑ مردوں میں سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے پیغمبر اکرمؐ کی تصدیق کی ہے۔ بعض کی طرف سے جو تنقید کی گئی ہے وہ صرف اس بات پر ہے کہ آپؑ ایمان لانے کے وقت ۱۰ یا ۱۲ سال کے تھے اور آپؑ کا اسلام اس عمر میں قانونی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

لیکن یہ بات بہت عجیب نظر آتی ہے کیونکہ یہ بات کس طرح سے صحیح ہے جبکہ پیغمبر اسلام نے اسے قبول کر لیا ہے اور انھیں اپنا "وزیر" و "وصی" کہہ کر خطاب کیا اور پیغمبر اسلامؐ کے ارشادات میں انھیں بارہا "اول المؤمنین" یا "اولکم اسلاماً" (مومنین میں سے پہلا یا تم میں سے جو سب سے پہلے اسلام لایا) کے نام کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے کہ جس کے مدارک ہم اہل سنت کے علماء کی کتب سے اسی تفسیر کی آٹھویں جلد سورۂ توبہ کی آیہ ۱۰ کے ذیل میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے احقاق الحق جلد سوم ص ۱۷۷ اور المراجعات ص ۶۴ مراجعہ ۱۲ کی طرف رجوع کریں

لیکن خالد کی داستان جو اصولی طور پر فتح مکہ کے بعد ہونی چاہیے شانِ نزول نہیں ہو سکتی کیونکہ سورۂ زمر ساری کی ساری مکی ہے، اس بنا پر ممکن ہے کہ تطبیق کے طور پر ہو۔

تفسیر

خدا کافی ہے

ان تہدیدوں کے بعد جو خدا نے گزشتہ آیات میں مشرکین کے لیے بیان کی گئی ہیں اور ان وعدوں کے بعد جو اس نے رسول اکرمؐ سے کئے ہیں، پہلی زیر بحث آیت میں کفار کی دھمکیوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا خدا اپنے بندے کی دشمنوں سے نجات اور حفاظت کے لیے کافی نہیں ہے لیکن وہ تجھے اس کے غیر سے ڈراتے ہیں (الیس اللہ بکاف عبدہ و یخوّفونک بالذین من دونہ)۔

وہ خدا جس کی قدرت تمام قدرتوں سے برتر ہے اور جو اپنے بندوں کی حاجات اور مشکلات سے اچھی طرح واقف ہے اور ان کے لیے انتہائی لطف اور مہربانی رکھتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ اپنے ایمان دار بندوں کو حوادث کے طوفان اور دشمنوں کی موجِ عداوت کے مقابلے میں اکیلا چھوڑ دے، جبکہ وہ اپنے بندے کا پشتیبان ہے۔ ؎

اگر تیغِ عالم بجنبد ز جای
نبرد رگی چوں نخواہد خدای!

اگر زمانے کی تلوار اپنی جگہ سے حرکت کرے تو جب تک خدا نہ چاہے وہ رگِ گردن نہیں کاٹ سکتی اور جس وقت وہ چاہے کہ کسی کی مدد کرے تو: ؎

ہزار دشمنم ار می کنند قصد ہلاک
گرم تو دوستی از دشمنان ندارم باک

اگر میرا دشمن ہزار مرتبہ میری ہلاکت کا ارادہ کرے، اگر تو میرا دوست ہے تو پھر مجھے دشمنوں کا کوئی خوف نہیں ہے۔

چہ جائیکہ یہ بُت جو بے قدر و قیمت اور بے خاصیت چیزیں ہیں۔

اگرچہ آیت کی شانِ نزول مذکورہ روایت کے مطابق بتوں کے غضب سے ڈرانے دھمکانے کے بارے میں ہے، لیکن آیت کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ اس میں غیر خدا کی ہر قسم کی تہدید شامل ہے۔ بہرحال یہ آیت راہِ حق پر چلنے والے تمام سچے مومنین کے لیے ایک نوید ہے، خصوصاً ایسے ماحول اور معاشرے میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور انھیں ہر طرف سے دھمکیاں ملتی رہتی ہیں۔

یہ آیت ان کے دلوں کو گرماتی اور ثباتِ قدم بخشتی ہے، نشاط و خوشی سے ان کی روح کو سرشار اور ان کے قدموں کو استوار کرتی ہے

اور دشمنوں کی زیاں بار نفسیاتی دھمکیوں کو بے کار کر دیتی ہے۔ ہاں! جب خدا ہمارے ساتھ ہے تو پھر ہمیں اس کے غیر سے کیا ڈر ہے اور اگر ہم اس سے بے گانہ اور جدا ہو جائیں تو پھر ہر چیز ہمارے لیے وحشت ناک ہے۔

اس آیت کے آخر میں اور بعد والی آیت میں ہدایت و گمراہی کے بارے میں گفتگو ہے اور لوگوں کو دو گروہوں گمراہ اور ہدایت یافتہ میں تقسیم کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ تمام بندے اس کی بارگاہ کے نیازمند اور محتاج ہیں اور عالمِ ہستی میں کوئی چیز اس کے چاہے بغیر نہیں ہوتی، فرمایا گیا ہے: جسے خدا گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت کرنے والا نہیں ہے (ومن یضلل اللہ فما لہ من ھاد)۔

اور جسے خدا ہدایت کرے کوئی شخص اسے گمراہ نہیں کر سکتا (ومن یھد اللہ فما لہ من مضل)۔

یہ بات ظاہر ہے کہ نہ وہ ضلالت و گمراہی بلا وجہ ہے اور نہ ہی یہ ہدایت بغیر کسی حساب کتاب کے ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک خود انسان کی خواہش اور اس کی سعی و کوشش کا ایک تسلسل ہے اگر کوئی شخص گمراہی کی راہ میں قدم رکھتا ہے اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ نورِ حق کو خاموش کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے، دوسروں کو غافل کرنے میں کوئی موقع جانے نہیں دیتا اور سر سے لے کر پاؤں تک گناہ و عصیان میں غرق ہو جاتا ہے تو یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ خدا اسے گمراہ رکھتا ہے، نہ صرف یہ کہ اس سے توفیقِ ہدایت سلب کر لیتا ہے بلکہ اس کی ادراک اور پہچان کی قوت کو بھی بیکار کر دیتا ہے، اس کے دل پر مُہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور یہ نتیجہ ہے ان اعمال کا جنہیں وہ انجام دیتا ہے۔

لیکن جو لوگ خلوصِ نیت کے ساتھ "سیر الی اللہ" کا ارادہ رکھتے ہیں، اس کے اسباب فراہم کرتے ہیں اور ابتدائی قدم اٹھا لیتے ہیں تو ہدایتِ الٰہی کا نور ان کی مدد کے لیے آگے بڑھتا ہے اور حق کے فرشتے ان کی مدد کو آتے ہیں اور شیاطین کے وسوسوں کو ان کے دلوں سے دُور کرتے ہیں، ان کے ارادوں کو قوی اور ان کے قدموں کو استوار کرتے ہیں اور مقاماتِ لغزش پر لطفِ الٰہی ان کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

یہ ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید کی بہت سی آیات شاہد و گواہ ہیں، اور کتنے بے خبر ہیں وہ لوگ جو اس قسم کی آیات کا قرآن کی دوسری آیات سے رابطہ منقطع کر کے انھیں مکتبِ جبر کا گواہ بناتے ہیں، گویا وہ یہ بات نہیں جانتے کہ آیاتِ قرآنی ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔

بلکہ اسی زیرِ بحث آیت کے ذیل میں اس معنی پر ایک واضح شاہد موجود ہے، کیونکہ فرمایا گیا ہے: کیا خدا قادر اور صاحب انتقام نہیں ہے (الیس اللہ بعزیز ذی انتقام)۔

ہم جانتے ہیں کہ خدا کی طرف سے انتقام ان غلط اعمال کے مقابلے میں سزا و عذاب کے معنی میں ہے جو انجام دیئے گئے ہیں۔ یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کا گمراہ کرنا سزا کا پہلو رکھتا ہے اور وہ خود انسانوں کے اعمال کا ردِ عمل ہے نیز طبعی و فطری طور پر اس کی ہدایت بھی اجر و پاداش کا پہلو رکھتی ہے اور خالص و پاک اعمال اور اللہ کی راہ میں مجاہدے کا عکس العمل ہے [1]

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "نقمت" "عقوبت" اور سزا کے معنی میں ہے۔

چند نکات

۱۔ ہدایت اور ضلالت خدا کی طرف سے ہے: لغت میں ہدایت کا معنی دلالت و رہنمائی ہے جو دقیق طور پر اور لطف کے ساتھ ہو۔[1]

اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک " ارائہ طریق " (راستہ دکھانا) اور " ایصال بہ مطلوب " دوسرے لفظوں "ہدایت تشریعی" اور " ہدایت تکوینی"۔[2]

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ بعض اوقات انسان ایسے شخص کو پوری دقت اور لطف و عنایت کے ساتھ راستہ دکھاتا ہے، جو اس کا طالب ہے، لیکن راستہ طے کرنا اور مقصود تک پہنچنا خود اس کے ذمہ ہوتا ہے۔

لیکن کبھی طالبانِ مقصد کا ہاتھ پکڑ کر راستہ دکھانے کے علاوہ اسے مقصد تک بھی پہنچا دیا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں پہلے مرحلے میں صرف قوانین و احکام بیان کر کے راستہ طے کرنے کی شرائط و حالات اور مقصد تک پہنچنے کو بیان کر دیا جاتا ہے، لیکن دوسرے مرحلے میں اس کے علاوہ سفر کے وسائل فراہم کیے جاتے ہیں، رکاوٹوں کو دور کیا جاتا ہے، مشکلات حل کی جاتی ہیں اور اس راستے کے مسافروں کی مقصد تک ہمراہی، حفاظت اور حمایت کی جاتی ہے۔

البتہ اس کا مقتضاد " اضلال" ہے۔

آیات قرآنی پر ایک اجمالی نگاہ ہی اچھی طرح سے واضح کر دیتی ہے کہ قرآن ہدایت و ضلالت کو خدا کا فعل شمار کرتا ہے اور دونوں کی اپنی طرف نسبت دیتا ہے۔ اگر ہم اس سلسلے کی تمام آیات شمار کریں تو بات لمبی ہو جائے گی بس اتنا ہی کافی ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۱۳ میں یہ بیان ہوا ہے:

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم

خدا جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔

نیز سورۂ نحل کی آیہ ۹۳ میں یہ بیان ہوا ہے:

ولکن یضل من یشاء و یھدی من یشاء

لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

ہدایت و ضلالت دونوں کے بارے میں یا ان دونوں میں سے ایک کے متعلق ایسی ہی تعبیر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں نظر آتی ہے۔[3]

---

[1] مفردات مادہ " ھدی"

[2] غور کیجیے کہ یہاں ہدایت تکوینی ایک وسیع معنی میں لی گئی ہے اس میں قوانین کو بیان کرنے اور راستہ دکھانے کے علاوہ ہر طرح کی ہدایت شامل ہے۔

[3] مثال کے طور پر دیکھیے: فاطر ۸، زمر ۲۳، مدثر ۳۱، بقرہ ۲۷۲، انعام ۸۸، یونس ۲۵، رعد ۲۷، اور ابراہیم ۴

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض آیات میں صراحت کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ سے نفی کی ہے اور خدا کی طرف نسبت دی ہے، چنانچہ سورۂ قصص کی آیہ ۵۶ میں ہے:

انك لا تهدی من احببت ولكن الله يهدی من يشاء

تو جسے چاہے ہدایت نہیں کر سکتا لیکن خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۷۲ میں ہے:

ليس عليك هداهم ولكن الله يهدی من يشاء

انھیں ہدایت کرنا تیرے ذمہ نہیں ہے لیکن خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

ان آیات کے سطحی مطالعے اور ان کے عمیق اور گہرے معنی کا ادراک نہ کرنے کے باعث ایک گروہ ان کی تفسیر کرنے میں گمراہ ہو گیا اور راہِ ہدایت سے انحراف کر بیٹھا اور اس نے مکتبِ جبر کو اختیار کر لیا۔ یہاں تک کہ بعض مشہور مفسر بھی اس آفت سے محفوظ نہ رہ سکے اور اس ہولناک گڑھے میں جا گرے، یہاں تک کہ انھوں نے ہدایت و ضلالت کو تمام مراحل میں جبری سمجھ لیا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ چونکہ اس عقیدہ کا مسئلہ عدالتِ الٰہی اور حکمتِ خداوندی سے تضاد واضح تھا لہٰذا اُسے ترجیح دیتے ہوئے اصل عدالت کے ہی منکر ہو گئے تاکہ اپنی غلطی کی اصلاح کر لیں، اصولاً اگر ہم اصولِ جبر کے قائل ہوں تو پھر شرعی ذمہ داری رسولوں کے بھیجنے اور آسمانی کتابوں کے نازل کرنے کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

لیکن وہ لوگ جو مکتبِ اختیار کے طرف دار ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی عقلِ سلیم اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ خدا کسی گروہ کو ضلالت و گمراہی کا راستہ طے کرنے پر مجبور کرے اور پھر اس جبری کام کی وجہ سے اسے سزا بھی دے یا کسی گروہ کو ہدایت پر مجبور کرے اور اس کے بعد بغیر کسی وجہ سے انھیں جزا بھی دے اور ایسے کام کی وجہ سے جسے انھوں نے خود سے انجام نہیں دیا ہے انھیں دوسروں پر امتیاز بھی دے، ان لوگوں نے ان آیات کی تفسیر کے لیے دوسرے راستے اختیار کیے ہیں، جن میں سے زیادہ اہم حسبِ ذیل ہیں

۱۔ ہدایتِ الٰہی سے مراد ہدایتِ تشریعی ہے، جو وحی، آسمانی کتابوں اور پیغمبروں اور ان کے اوصیاء کے ذریعے اور اسی طرح عقل و وجدان کے ادراک سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ لیکن تمام مراحل میں راستہ طے کرنا خود انسان کے اپنے ذمہ ہے۔

البتہ یہ تفسیر ہدایت والی بعض آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہے لیکن دوسری بعض آیات کی یہ تفسیر نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ صراحت کے ساتھ "ہدایت تکوینی" اور "ایصال به مطلوب" کے بارے میں ہیں۔ مثلاً سورۂ قصص کی آیہ ۵۶ میں ہے کہ:

تو جس شخص کو پسند کرے ہدایت نہیں کر سکتا لیکن خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہدایت تشریعی اور راستہ دکھانا پیغمبروں کی اصلی ذمہ داری ہے۔

۲۔ مفسرین کی ایک اور جماعت نے ہدایت و گمراہی کی اس مقام پر جہاں وہ تکوینی پہلو رکھتی ہے، جزا و سزا اور بہشت و دوزخ کے راستے تک پہنچانے کے معنی میں تفسیر کی ہے، انھوں نے یہ کہا ہے کہ خدا نیکوکاروں کو بہشت کے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے اور بدکاروں کو اس سے گمراہ کرتا ہے۔

البتہ یہ معنی بھی صرف بعض آیات کے بارے میں صحیح ہے لیکن دوسری آیات کے بارے میں لفظ ہدایت وضلالت کے مطلق ہونے اور ان میں کسی قسم کی قید وشرط نہ ہونے کی وجہ سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

۳۔ ایک اور جماعت نے یہ کہا ہے کہ ہدایت سے مراد مقصود تک پہنچنے کے اسباب ومقدمات فراہم کرنا ہے اور ضلالت سے مراد ان کو مہیا نہ کرنا یا انھیں حذف کرنا ہے۔ بعض نے اسے "توفیق" اور "سلبِ توفیق" سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ توفیق سے مراد مقصود تک پہنچنے کے لیے مقدمات کا فراہم ہونا اور سلبِ توفیق انھیں اٹھا لینا ہے۔

اس بنا پر خدا کی ہدایت اس طرح نہیں ہے کہ خدا جبری طور پر انسانوں کو مقصد تک پہنچا دے بلکہ اس طرح ہے کہ اس کے وسائل انھیں مہیا کر دے۔ مثلاً اچھے مربی کا ہونا، تربیت کے ماحول کا صحیح ہونا، دوستوں اور ساتھ دینے والوں کا صالح و نیک ہونا اور اسی قسم کی دوسری چیزیں سب کی سب مقدمات ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انسان کو ہدایت کا راستہ طے کرنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ وہ ان سب کو پسِ پشت ڈال کر راہِ ضلالت کو اختیار کر سکتے ہیں۔

لیکن اس تفسیر میں اس سوال کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ یہ توفیقات ایک گروہ کے شاملِ حال کیوں ہوتی ہیں، جبکہ دوسرا گروہ ان سے محروم رہتا ہے۔

اس تفسیر کے طرفداروں کو خدا کے افعال کے حکیمانہ ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس فرق کے دلائل ذکر کرنا پڑیں گے۔ مثلاً یہ کہیں کہ عملِ خیر انجام دینا توفیقِ الٰہی کا سبب بنتا ہے اور اعمالِ شر انجام دینا انسان سے توفیق سلب کر لیتا ہے۔

بہرحال یہ ایک اچھی تفسیر ہے لیکن مطلب پھر بھی اس سے زیادہ گہرا ہے۔

۴۔ دقیق ترین تفسیر جو ہدایت وضلالت کی تمام آیات سے ہم آہنگ ہے اور ان سب کا مفہوم اچھی طرح سے واضح کرتی ہے بغیر اس کے کہ اس میں کوئی معمولی سا بھی خلاف ظاہر پایا جائے یہ ہے کہ ہم کہیں کہ:

ہدایت تشریعی راستہ دکھانے کے معنی میں جنبۂ عمومی رکھتی ہے اور کسی قسم کی قید وشرط اس میں نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۂ دہر کی آیہ ۳ میں بیان ہوا ہے کہ:

انا ھدیناہ السبیل اما شاکرًا واما کفورًا

ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا ہے اب چاہے وہ شکر گزاری کرے یا کفران و ناشکری کرے۔

نیز سورۂ الشوریٰ کی آیہ ۵۲ میں یہ بیان ہوا ہے کہ:

و انک لتھدی الی صراط مستقیم

تو تمام انسانوں کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ نبی کی دعوت خدا کی دعوت کی مظہر ہے کیونکہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے۔

اور منحرفین اور مشرکین کی ایک جماعت کے بارے میں سورۂ نجم کی آیہ ۲۳ میں

ولقد جاءھم من ربھم الھدٰی

خدائی ہدایت پروردگار کی طرف سے ان کے پاس آئی۔

لیکن ہدایت تکوینی جس کا معنی ہے ایصال بہ مطلوب اور بندوں کا ہاتھ پکڑ کر راستے کے تمام پیچ وخم سے گزار کر لے جانا اور ان کی حفاظت کرنا، ساحلِ نجات تک پہنچانے تک، یہ بہت سی دوسری آیات کا موضوعِ بحث ہے۔ یہ ہدایت ہرگز غیر مشروط نہیں ہے یہ ہدایت ایسے گروہ کے ساتھ مخصوص ہے جس کے اوصاف قرآن میں بیان ہوئے ہیں اور گمراہ کرنا جو اس کا الٹ ہے وہ بھی ایک ایسے گروہ کے ساتھ مخصوص ہے کہ جن کے اوصاف بیان ہو چکے ہیں۔

اگرچہ بعض آیات مطلق ہیں، لیکن بہت سی دوسری آیات نے ان کی قید و شرط کو دقت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور جس وقت ان مطلق اور مقید آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر رکھیں تو پھر مطلب پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے اور آیات کے معنی میں کسی قسم کا ابہام اور تردد باقی نہیں رہتا اور وہ نہ صرف یہ کہ انسان کے اختیار اور ارادے کی آزادی کے خلاف نہیں ہے بلکہ پوری طرح اس کی تاکید کرتا ہے۔

ایک وضاحت

قرآن مجید ایک جگہ کہتا ہے:

یضل به کثیرًا و یهدی به کثیرًا و ما یضل به الّا الفاسقین

وہ ان ضرب الامثال کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ اور بہت سوں کو ہدایت کرتا ہے لیکن فاسقوں کے علاوہ اور کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ (بقرہ ـــــ ۲۶)

یہاں ضلالت کا سرچشمہ فسق اور اطاعت و فرمانِ الٰہی سے خروج کو شمار کیا گیا ہے

ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:

و الله لا یهدی القوم الظالمین

خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ (بقرہ ـــــ ۲۵۸)

یہاں ظلم کا ذکر ہے اور اسے ضلالت کے لیے میدان ہموار کرنے والے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ ہے:

و الله لا یهدی القوم الکافرین

اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ (بقرہ ـــــ ۲۶۴)

یہاں کفر کا گمراہی کے لیے زمین ہموار کرنے والے کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔

ایک اور آیت میں بیان ہوا ہے۔

ان الله لا یهدی من هو کاذب کفار

خدا جھوٹے اور کفران کرنے والے کو ہدایت نہیں کرتا۔ (زمر ـــــ ۳)

ایک دوسری جگہ آیا ہے :

ان اللہ لا یھدی من ھو مسرف کذّاب

خدا ہبت زیادہ جھوٹ بولنے والے اور اسراف کرنے والے کو ہدایت نہیں کرتا۔

(مؤمن ——— ۲۸)

یعنی اسراف اور دروغ گوئی گمراہی کے عامل ہیں ۔

البتہ ہم نے جو کچھ یہاں پر بیان کیا ہے یہ اس سلسلے میں قرآن کی آیات کا ایک حصہ ہے، ان آیات میں سے بعض انھیں مفاہیم کے ساتھ مختلف سورتوں میں بار بار آئی ہیں ۔

نتیجۂ کلام یہ ہے کہ قرآن خدائی ضلالت کو ایسے افراد کے ساتھ مخصوص شمار کرتا ہے جو ان اوصاف کے حامل ہیں : کفر ظلم، فسق دروغ، اسراف اور کفران ۔

کیا وہ لوگ جو ان اوصاف کے حامل ہیں وہ ضلالت و گمراہی کے لائق نہیں ہیں ؟

دوسرے لفظوں میں جو شخص ان امور کا مرتکب ہوتا ہے کیا اس کے دل پر تاریکی کے پردے نہیں پڑ جاتے ؟

زیادہ واضح عبارت میں ان اعمال وصفات کے کچھ آثار ہیں جو خواہ مخواہ انسان کو دامن گیر ہو جاتے ہیں، اس کی آنکھ، کان اور عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور اسے ضلالت و گمراہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں ۔

چونکہ سب چیزوں کی خاصیت اور تمام اسباب کی تاثیر حکم خدا سے ہے، اس بنا پر ان تمام مراحل میں گمراہ کرنے کی نسبت خدا کی طرف دی جا سکتی ہے لیکن یہ نسبت بندوں کا میں اختیار اور ارادے کی آزادی ہے ۔

یہ بات تو ہوئی مسئلہ ضلالت و گمراہی کے سلسلے میں، باقی رہا ہدایت کے سلسلے میں تو اس کے لیے بھی قرآن میں کئی شرائط و اوصاف بیان ہوئے ہیں، جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ بھی علت و سبب کے بغیر نہیں ہے اور حکمتِ الٰہی کے برخلاف نہیں ہے ۔

اوصاف کا ایک حصہ جو استحقاقِ ہدایت پیدا کرتا ہے اور لطفِ الٰہی کو کھینچتا ہے ۔ ذیل کی آیات میں آیا ہے : ایک جگہ بیان ہوا ہے ۔

یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام و یخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ و یھدیھم الی صراط مستقیم

خدا قرآن کے ذریعے ان لوگوں کو جو اس کی رضا و خوشنودی کی پیروی کرتے ہیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے اور اپنے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور انھیں راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

(مائدہ ——— ۱۶)

یہاں فرمانِ خدا کی پیروی اور اس کی خوشنودی کے حصول کو ہدایتِ الٰہی کے لیے راہ ہموار کرنے والا شمار کیا گیا ہے ۔

دوسری جگہ بیان ہوا ہے:

ان اللہ یضل من یشاء و یھدی الیہ من اناب

خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو شخص اس کی طرف رجوع اور بازگشت کرے اس کی ہدایت کرتا ہے۔ (رعد ـــــ ۲۷)۔

یہاں توبہ و انابت کو استحقاق ہدایت کا عامل شمار کیا گیا ہے:

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں ہم انھیں اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

(عنکبوت ـــــ ۶۹)

یہاں پر "جہاد" وہ بھی مخلصانہ جہاد، جو خدا کی راہ میں ہو، ہدایت کی اصلی شرط کے طور پر ذکر ہوا ہے۔

ایک دوسری آیت میں یہ بھی بیان ہوا ہے:

والذین اھتدوا زادھم ھدی

جنھوں نے ہدایت کے لیے پہلے قدم اٹھا لیے ہیں، خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے۔

(محمد ـــــ ۱۷)

یہاں راہِ ہدایت کی کچھ مقدار کو طے کر لینا، لطفِ خدا سے اس راستے کے جاری رہنے کی ایک شرط کے عنوان سے ذکر ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب تک بندوں کی طرف سے توبہ و انابت نہ ہو، جب تک وہ اس کے فرمان کے پیرو نہ بنیں، جب تک جہاد اور سعی و کوشش نہ کریں اور جب تک راہِ حق میں پہلا قدم نہ اٹھائیں لطفِ الٰہی ان کے شاملِ حال نہیں ہوتا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں مطلوب تک نہیں پہنچاتا۔

جو ان اوصاف کے حامل ہیں کیا ایسے افراد کے لیے ہدایت کا حصول بے سبب ہے یا کیا یہ ہدایت کے جبری ہونے کی دلیل شمار ہوگی؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کی آیات اس سلسلے میں بہت واضح اور منہ بولتی ہیں۔ البتہ وہ لوگ جو آیاتِ ہدایت و ضلالت کی صحیح طور سے جمع بندی نہ کر سکے یا انھوں نے جمع کرنا نہ چاہا وہ اس قسم کی خطرناک غلطی میں گرفتار ہو گئے ہیں اور بقول:

ع چوں ندیدند حقیقت، رہ افسانہ زدند

(چونکہ حقیقت کو نہ دیکھ پائے لہٰذا افسانے کی راہ اختیار کر لی)

یہ کہنا چاہیے کہ اس "ضلالت" کے لیے زمین انھوں نے خود ہموار کی ہے۔

بہرحال مشیتِ الٰہی کہ ہدایت و ضلالت کی مذکورہ آیات ہرگز بے دلیل اور حکمت و مصلحت سے خالی مشیت کے معنی میں نہیں ہیں، بلکہ ہر موقع و محل پر اس کی خاص شرائط ہیں جو اسے خدا کے حکیم ہونے کے ساتھ ہم آہنگ کرتی ہیں۔

۲۔ لطفِ خدا کا ذکر: انسان حوادث کی تند و تیز ہوا کے سامنے گھاس کے ایک تنکے کے مانند ہے اور ہر وقت کسی بھی طرف پھینکا جا سکتا ہے، ممکن ہے کہ گھاس کا یہ تنکا کسی پتے یا ٹوٹی ہوئی شاخ کے ساتھ جا ملے لیکن تیز ہوا ان دونوں کو ہی اڑا لے جائے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی درخت کے ساتھ جا چپکے تو ممکن ہے کبھی طوفان درخت کو بھی اکھاڑ لے جائے لیکن اگر وہ کسی بہت بڑے پہاڑ کے ساتھ جڑ جائے تو کوئی بھی طوفان اسے اس کی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔

یہ پہاڑ تو خدا پر ایمان کا ہی دوسرا نام ہے اور باقی جو کچھ بیان ہوا وہ اس کے غیر پر بھروسہ کرنے کے طرح ہے اور اسی بنا پر مذکورہ بالا آیات میں قرآن کہتا ہے:

الیس اللہ بکاف عبدہ

کیا خدا اپنے بندے کی حمایت کے لیے کافی نہیں ہے؟

اس آیت کے مضمون و مطالب پر توجہ اور ایمان انسان کو بہت زیادہ شجاعت اور اعتمادِ ذات بخشتا ہے، اس کے دل کو آرام و سکون دیتا ہے تاکہ سخت حوادث کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح ڈٹ جائے، دشمنوں کی کثرت سے نہ ڈرے اور ساتھیوں کی کمی سے نہ گھبرائے اور شدید بحران اس کا روحانی سکون درہم برہم نہ کرے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

المؤمن کالجبل الراسخ لا تحرکہ العواصف

مومن مضبوط پہاڑ کی طرح ہے اسے تند و تیز آندھیاں اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں۔

۳۸۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ط قُلْ أَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ط قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ط عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ ○

۳۹۔ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ج فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ○ لا

۴۰۔ مَنْ يَّأْتِيهِ عَذَابٌ يُّخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ○

ترجمہ

۳۸۔ اور اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً وہ یہی کہیں گے کہ خدا نے، کہہ دے: کیا تم نے کبھی ان معبودوں کے بارے میں سوچا ہے جنھیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو۔ کہ اگر خدا کوئی ضرر میرے لیے چاہے تو کیا وہ اس کے ضرر کو برطرف کر سکتے ہیں یا وہ میرے لیے کسی رحمت کا ارادہ کرے تو کیا ان میں اس کی رحمت کو روک لینے کی طاقت ہے؟ کہہ دے خدا میرے لیے کافی ہے اور تمام توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

۳۹۔ کہہ دے: اے میری قوم! جو کچھ تمھارے بس میں ہے اسے کر گزرو، میں تو اپنی ذمہ داری پوری کروں گا لیکن بہت جلد تمھیں معلوم ہو جائے گا ..... کہ

۴۰۔ دنیا کا ذلیل و خوار کرنے والا عذاب کس کے لیے آتا ہے، اور اس کے بعد (آخرت کا) جاودانی عذاب اس پر وارد ہوتا ہے۔

تفسیر

تمھارے معبود کوئی مشکل حل کر سکتے ہیں؟

گزشتہ آیات میں مشرکین کے انحرافی عقائد اور ان کے بُرے نتائج کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب زیر بحث آیات میں توحید کے دلائل سے متعلق گفتگو کی گئی ہے تاکہ گزشتہ بحث کو دلیل سے مکمل کیا جائے، نیز گزشتہ آیات میں اس سلسلے میں گفتگو تھی کہ خدا کی حمایت ہی کافی ہے، اس مسئلے کو بھی زیر بحث آیات میں دلیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اگر تو ان سے سوال کرے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً وہ یہی کہیں گے کہ خدا نے (ولئن سألتهم من خلق السماوات والارض ليقولن الله)۔

کیونکہ کوئی وجدان اور عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ یہ وسیع و عریض جہان، اتنی عظمت و بزرگی کے ساتھ کسی زمینی موجود کی مخلوق ہو، چہ جائیکہ بے روح اور بے عقل و شعور بتوں کی مخلوق ہو۔ اس طرح سے قرآن انھیں عقل کے فیصلے اور وجدان و فطرت کے حکم کی طرف لے جاتا ہے تاکہ توحید کی پہلی بنیاد کو کہ جو آسمان و زمین کی خالقیت ہے، ان کے دلوں میں محکم کرے۔

بعد والے حصے میں انسان کے سود و زیان اور اس کے نفع و نقصان میں تاثیر کو بیان کرتا ہے تاکہ یہ ثابت کرے کہ بُت اس سلسلے میں کچھ اثر نہیں رکھتے، مزید کہتا ہے: ان سے کہہ دے: خدا کے علاوہ جن معبودوں کو تم پکارتے ہو کیا تم نے کبھی ان کے متعلق سوچا ہے کہ اگر خدا میرے لیے کسی نقصان کا ارادہ کرے، تو کیا وہ اسے برطرف کر سکتے ہیں یا اگر میرے لیے کسی رحمت کا ارادہ کرے تو کیا ان میں اس کی رحمت کو روک لینے کی طاقت ہے (قل افرأيتم ما تدعون من دون الله ان ارادني الله بضر هل هن كاشفات ضره او ارادني برحمة هل هن ممسكات رحمته)۔[1]

اب جبکہ نہ ان کے لیے خالقیت ثابت ہے اور نہ ہی وہ سود و زیان کی کوئی قدرت رکھتے ہیں، تو ان کی پرستش کیا معنی رکھتی ہے؟ مبدء جہان آفرینش اور ہر سود و زیان کے مالک کو چھوڑ کر ان بے خاصیت اور بے شعور موجودات کا دامن کیوں تھاما جائے؟ اور اگر ان کے معبود باشعور ہوتے جیسے جنات اور فرشتے کہ جن کی بعض بُت پرست پرستش کیا کرتے تھے، تو پھر بھی نہ وہ خالق ہیں اور نہ سود و زیان ان کے بس میں ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں ایک کُلی اور آخری نتیجے کے طور پر قرآن کہتا ہے: کہہ دے خدا میرے لیے کافی ہے اور سب توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے (قل حسبي الله عليه يتوكل المتوكلون)۔

یہ بات کہ مشرکین آسمان و زمین کی خالقیت کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے تھے بارہا قرآن کی آیات میں بیان ہوئی ہے۔[2]

---

[1] عام طور پر مفسرین اور ارباب لغت "افرأيتم" کے جملے کی "اخبروني" (مجھے بتاؤ) کے معنی میں تفسیر کرتے ہیں، حالانکہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہاں "رؤیت" کی اس کے اصل معنی یعنی آنکھ یا دل سے دیکھنے کے معنی میں تفسیر کی جائے اس بنا پر "کیا تم نے مشاہدہ کیا" یا "کیا تمھیں معلوم ہوا" کا معنی کیا جا سکتا ہے۔

[2] عنکبوت ۶۱، ۶۳ و لقمان ۲۱، زخرف ۹، ۸۷۔

اور اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب اس پر وارد ہوگا (من یأتیه عذاب یخزیه و یحل علیه عذاب مقیم)۔

اس طرح سے ان کے ساتھ آخری بات کی گئی ہے کہ یا تو عقل و خرد کی منطق کے سامنے سر تسلیم خم کر لو اور وجدان کی آواز پر کان دھرو اور یا دو دردناک عذابوں کے انتظار میں رہو، ایک دنیا کا عذاب جو خواری و رسوائی کا باعث ہے اور دوسرا آخرت کا عذاب جو جاودانی اور دائمی ہے اور یہ وہی عذاب ہیں جنھیں تم نے خود اپنے ہاتھ سے فراہم کیا ہے اور یہ ایسی آگ ہے جس کا ایندھن تم نے خود جمع کیا ہے اور اسے خود تم نے بھڑکایا ہے۔

۴۱۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝

۴۲۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

۴۳۔ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاۗءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝

۴۴۔ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۱۔ ہم نے اس آسمانی کتاب کو لوگوں کے لیے، حق کے ساتھ تم پر نازل کیا ہے۔ جو شخص ہدایت قبول کرے تو یہ خود اسی کے فائدے میں ہے، اور جو شخص گمراہی اختیار کرے تو وہ صرف اسی کے لیے نقصان دہ ہوگی اور تو انھیں ہدایت پر مجبور کرنے کے لیے مامور نہیں ہے۔

۴۲۔ خدا ارواح کو موت کے وقت قبض کر لیتا ہے اور جن کی موت نہیں آتی انھیں نیند کے وقت پکڑ لیتا ہے، پھر ان لوگوں کی ارواح کو جن کی موت کا حکم صادر ہو چکا ہے، انھیں تو رہنے دیتا ہے اور دوسری ارواح کو (جنھیں ابھی زندہ رہنا ہوتا ہے) واپس لوٹا دیتا ہے جو ایک مدت معین تک رہیں گی، اس چیز میں جو غور و فکر کرنے والوں کے لیے

واضح نشانیاں ہیں۔

۴۳۔ کیا انھوں نے اللہ کے سوا اوروں کو شفیع بنالیا ہے کہہ دے کہ چاہے وہ کسی چیز پر اختیار ہی نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی کوئی بات سمجھتے ہوں۔

۴۴۔ کہہ دے کہ تمام شفاعت اللہ ہی کے لیے ہے، کیونکہ آسمانوں اور زمین کی حاکمیت اسی کے لیے ہے اور پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

تفسیر

موت اور نیند کے وقت ارواح قبض ہو جاتی ہیں

دلائلِ توحید کے ذکر اور مشرکین و موحدین کا انجام بیان کرنے کے بعد زیر بحث پہلی آیت میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ حق کو قبول کرنے اور نہ کرنے کا سود و زیان خود تمھارے ہی لیے ہے۔ اگر اللہ کا نبی اس سلسلے میں اصرار کرتا ہے تو یہ اس بنا پر نہیں ہے کہ اسے اس سے کوئی فائدہ ہوگا بلکہ یہ تو صرف فریضۂ الٰہی کی انجام دہی ہے۔ فرمایا گیا ہے: ہم نے اس آسمانی کتاب کو حق کے ساتھ تم لوگوں کے لیے نازل کیا ہے (انا انزلنا علیك الكتاب للناس بالحق)[1]

جو شخص ہدایت قبول کرے گا خود اسی کے فائدے میں ہے اور جو شخص گمراہی اختیار کرے گا تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا (فمن اهتدى فلنفسه ومن ضل فانما يضل عليها)۔

بہر حال "تو حق کو ان کے دلوں میں جبراً داخل کرنے پر مامور نہیں ہے" تیری ذمہ داری تو صرف ابلاغ و انذار ہے (وما انت عليهم بوكيل)۔

جو شخص راہِ حق اختیار کرے گا اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو شخص بے راہ روی اختیار کرے گا اس کا نقصان بھی خود اسی کو ہوگا۔ یہ امر آیاتِ قرآنی میں بارہا بیان ہوا ہے اور یہ اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ خدا کو نہ تو بندوں کے ایمان کی احتیاج ہے اور نہ ہی ان کے کفر سے اسے کوئی وحشت ہے اور نہ ہی اس کے پیغمبر کو اس سے کوئی وحشت ہے اس نے یہ پروگرام اس لیے مرتب نہیں کیا ہے کہ اس سے اسے کوئی فائدہ ہو، بلکہ اس لیے ہے تاکہ اپنے بندوں پر مہربانی اور کرم کرے۔

"وما انت عليهم بوكيل" کی تعبیر (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وکیل یہاں اس شخص کے معنی میں ہے

---

[1] "بالحق" ممکن ہے کہ "کتاب" کے لیے حال ہو یا "انزلنا" میں فاعل کے لیے حال ہو۔ اگرچہ پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے

اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ:

ہم نے قرآن کو اس حالت میں تجھ پر نازل کیا ہے کہ وہ حق کے ہمراہ اور ہمگام ہے۔

جو گمراہوں کے ایمان لانے کی ذمہ داری رکھتا ہو) قرآنی آیات میں اسی عبارت کے ساتھ یا اس کے مشابہ عبارت سے بارہا تکرار ہوئی ہے اور یہ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ لوگوں کے ایمان لانے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اصولاً ایمان جبر کے ساتھ ہوتا ہی نہیں۔ نبی تو صرف اس بات کا ذمہ دار ہے کہ خدا کا فرمان لوگوں تک پہنچانے میں لمحہ بھر بھی کوتاہی اور سستی نہ کرے، چاہے وہ اسے قبول کریں یا اس سے روگرداں ہو جائیں۔

اس کے بعد یہ واضح کرنے کے لیے کہ انسانوں کی ہر چیز، جن میں ان کی موت و حیات بھی ہے، خدا ہی کے ہاتھ میں ہے فرمایا گیا ہے: خدا ارواح کو موت کے وقت قبض کر لیتا ہے۔ (اللہ یتوفی الانفس حین موتھا)[1]۔

اور ان ارواح کو جن کی موت نہیں آئی ہوتی نیند میں پکڑ لیتا ہے (والتی لم تمت فی منامھا)[2]۔

اس طرح سے "نیند" "موت" کی بہن ہے اور اس کی ایک کمزور شکل ہے۔ کیونکہ نیند کے وقت روح کا جسم سے رابطہ بہت ہی کم رہ جاتا ہے اور ان دونوں کے بہت سے رشتے منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کہ ان کی ارواح کو جن کی موت کا حکم صادر کر چکا ہے روک لیتا ہے (اس طرح سے کہ وہ ہرگز نیند سے بیدار نہیں ہوتے) اور جن کی حیات کے برقرار رہنے کا فرمان دے چکا ہے ان کی ارواح انھیں بدنوں کی طرف لوٹا دیتا ہے جو ایک معین مدت تک رہیں گی (فیمسک التی قضی علیھا الموت و یرسل الاخری الی اجل مسمّی)۔

ہاں اس مسئلے میں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں واضح آیات اور نشانیاں ہیں (ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون)۔

اس آیت سے درج ذیل امور کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔

۱۔ انسان روح اور جسم سے مرکب ہے، روح ایک غیر مادی جوہر ہے جس کا جسم کے ساتھ ارتباط اس کے لیے نور اور حیات کا سبب ہے۔

۲۔ موت کے وقت خدا اس رابطے کو منقطع کر دیتا ہے اور روح کو عالمِ ارواح کی طرف لے جاتا ہے اور نیند کے وقت بھی اس روح کو قبض کر لیتا ہے، لیکن اس طرح سے نہیں کہ بالکل ہی رابطہ منقطع ہو جائے۔ اس بنا پر روح بدن کے لیے تین حالتیں رکھتی ہے۔ ارتباط تام (حیات و بیداری کی حالت)، ارتباط ناقص (نیند کی حالت) اور کامل طور پر ارتباط کا منقطع ہونا (موت کی حالت)

۳۔ نیند، موت کی کمزور حالت ہے اور موت نیند کا مکمل نمونہ ہے۔

۴۔ نیند روح کے استقلال اور اصالت کی دلیل ہے۔ خصوصاً جب کہ خواب اور وہ بھی سچے خواب کے ساتھ ہو تو پھر یہ معنی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

---

[1] "توفی" کا معنی قبض کرنا اور پورے طور پر پکڑ لینا ہے اور "انفس" یہاں ارواح کے معنی میں ہے۔ "یتوفی" کے قرینہ سے۔

[2] "منام" مصدری معنی رکھتا ہے اور "نوم" نیند کے معنی میں ہے۔

۵۔ بعض ارواح کا جب نیند کی حالت میں ان کا جسم کے ساتھ رابطہ کمزور ہوجاتا ہے تو کبھی تو یہ ارتباط مکمل انقطاع کی صورت اختیار کرلیتا ہے، اس طرح سے کہ وہ سونے والے پھر کبھی بیدار نہیں ہوتے، لیکن دوسری روحیں نیند اور بیداری کی حالت میں متحرک رہتی ہیں یہاں تک کہ حکمِ الٰہی نہ آپہنچے۔

۶۔ اس بات کی طرف توجہ کہ انسان ساری رات نیند کے وقت موت کے آستانہ پر ہوتا ہے ایک درسِ عبرت ہے کہ اگر وہ اس میں غور وفکر کرے تو اس کی بیداری کے لیے کافی ہے۔

۷۔ یہ تمام امور خدا کی قدرت کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں اور اگر دوسری آیات میں "ملک الموت" (موت کے فرشتوں) کے ہاتھوں قبض روح کی بات آئی ہے تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل کرنے والے اور اس کے اوامر کو جاری کرنے والے ہیں اور ان دونوں مفاہیم کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

بہرحال یہ جو آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ "اس میں ایسے لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں، واضح نشانیاں ہیں" اس سے مراد خدا کی قدرت کی نشانیاں، مبدء ومعاد کا مسئلہ اور خدا کے ارادے کے سامنے انسان کی کمزوری وناتوانی ہے۔

گزشتہ آیت میں انسان کے وجود پر اللہ کی حاکمیت اور موت وحیات اور خواب وبیداری کے نظام کے ذریعے اس کی تدبیر مسلم ہوچکی ہے۔ لہٰذا بعد والی آیت میں مسئلہ شفاعت میں مشرکین کے انحراف کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ ان پر ثابت کیا جائے کہ شفاعت کا مالک وہی ہے جو موت وحیات کا مالک ہے نہ کہ بے شعور بُت۔ فرمایا گیا ہے: انھوں نے خدا کے علاوہ شفیع بنالیے ہیں (ام اتخذوا من دون اللہ شفعاء)[1]۔

ہم جانتے ہیں کہ بتوں کی عبادت کے بارے میں بُت پرستوں کے مشہور بہانوں میں سے ایک یہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے:

ہم تو ان کی اس لیے پرستش کرتے ہیں تاکہ وہ اللہ کے ہاں ہمارے شفیع ہوں۔

جیسا کہ اسی سورہ کے شروع میں بیان ہوا ہے:

مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی (زمر ـــ ۳)

چاہے اس بنا پر کہ وہ بتوں کو فرشتوں اور ارواحِ مقدسہ کی تمثال اور مظاہر سمجھتے تھے اور چاہے اس لیے کہ وہ ان بے جان پتھروں اور لکڑیوں کے لیے کسی پُراسرار قدرت کے قائل تھے۔

بہرحال شفاعت اوّلاً فہم وشعور کے ادراک کی فرع ہے اور ثانیاً قدرت، مالکیت اور حاکمیت کی فرع ہے لہٰذا آیت کے آخر میں ان کے جواب میں فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دے کہ کیا ان سے شفاعت طلب کرتے ہو چاہے وہ کسی بھی چیز کے مالک نہ ہوں، یہاں تک کہ کچھ ادراک وشعور بھی نہ رکھتے ہوں (قل اولو کانوا لا یملکون شیئاً ولا یعقلون)[2]۔

---

[1] "ام" یہاں منقطعہ ہے اور "بل" کے معنی میں ہے اور اگر متصلہ ہو تو اس کے مقابلے میں دوسرا "ام" مقدر ماننا پڑے گا جو خلاف ظاہر ہے۔

[2] "اولو کانوا لا یملکون شیئاً" کا جملہ کچھ مقدر رکھتا ہے اور معنی کے لحاظ سے اس طرح ہے:

ایشفعون لکم ولو کانوا لا یملکون شیئاً

چند نکات

۱۔ نیند کا اسرار آمیز عالم :۔ نیند کی حقیقت کیا ہے؟ اور کیا ہو جاتا ہے کہ انسان سو جاتا ہے؟ اس سلسلہ میں ماہرین نے بہت بحث کی ہے :

بعض اس کو خون کے اہم حصے کے دماغ سے نکل کر بدن کے دوسرے حصوں میں انتقال کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اس طرح سے وہ اس کے لیے طبیعیاتی عامل کے قائل ہیں ۔

بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ جسم کی زیادہ کارکردگی کی وجہ سے ایک خاص زہریلا مواد بدن میں جمع ہو جاتا ہے اور یہی چیز نظام اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے اور انسان پر نیند کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور جب تک وہ زہر تحلیل ہو کر بدن میں جذب نہیں ہو جاتا یہ حالت برقرار رہتی ہے ۔ اس طرح سے وہ اس کے لیے کیمیائی عامل کے قائل ہیں ۔

ایک اور گروہ نیند کے لیے ایک قسم کے اعصابی عامل کا قائل ہے ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اعصاب کی خاص فعال مشین جو انسان کے دماغ کے اندر ہے اور جو اعضاء کی مسلسل حرکات کا مبدء ہے ۔ وہ زیادہ تھکان کے زیر اثر بے کار اور معطل ہو جاتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے ۔

لیکن ان میں سے کوئی نظریہ بھی نیند کے مسئلے کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا ، اگرچہ ان عوامل کی اجمالی طور پر تاثیر کا انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ جو چیز اس بات کا سبب بنی ہے کہ موجودہ ماہرین نیند کی واضح تفسیر بیان کرنے سے عاجز رہ گئے ہیں وہ ان کا مادی تفکر ہے ، وہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کی روح کے استقلال اور اصالت کو قبول کیے بغیر تفسیر کریں ۔ حالانکہ نیند اس سے پہلے کہ وہ ایک جسمانی پیدا ہونے والی چیز ہو ایک روحانی چیز ہے جس کی روح کی صحیح شناخت کے بغیر تفسیر کرنا ناممکن ہے ۔

قرآن مجید نے مذکورہ بالا آیات میں نیند کے مسئلے کی ایک دقیق ترین تفسیر بیان کی ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ نیند ایک قسم کا قبضِ روح اور روح کی جسم سے جدائی ہے لیکن مکمل جدائی نہیں ۔

اس طرح سے جس وقت حکم خدا سے انسان کے بدن سے روح کا پرتو ختم ہو جاتا ہے اور اس جسم کا دیپ اس میں سے ایک ہلکی سی شعاع کے سوا کچھ نہیں رہتا تو ادراک و شعور کی مشینری معطل ہو جاتی ہے اور انسان کی حس و حرکت رک جاتی ہے ۔ اگرچہ کچھ عمل جو اس کی حیات کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں مثلاً دل کا دھڑکنا اور خون کی گردش اور عمل تنفس و تغذیہ برقرار رہتا ہے ۔

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے :

ما من احد ینام الا عرجت نفسه الی السماء، و بقیت روحه فی بدنه، و صار بینهما سبب کشعاع الشمس، فان اذن الله فی قبض الارواح اجابت روح النفس، و ان اذن الله فی رد الروح اجابت النفس الروح، فهو قوله سبحانه "الله یتوفی الانفس حین موتها.....

جو شخص سو جاتا ہے، اس کا نفس آسمان کی طرف صعود کر جاتا ہے اور روح اس کے بدن میں رہ جاتی ہے اور ان دونوں کے درمیان سورج کی شعاعوں کی طرح ربط قائم رہتا ہے۔ جس وقت خدا انسان کی روح کے قبض کرنے کا حکم صادر فرماتا ہے تو روح نفس کی دعوت قبول کر لیتی ہے اور اس کی طرف پرواز کر جاتی ہے لیکن جب خدا روح کو واپسی کی اجازت دیتا ہے تو پھر نفس روح کی دعوت قبول کر لیتا ہے اور بدن کی طرف لوٹ آتا ہے اور یہی معنی ہے خداوند سبحان کے ارشاد کا جو فرماتا ہے: اللہ یتوفی الانفس حین موتھا)۔[1]،[2]

یہاں ضمنی طور سے خواب کے بارے میں ایک اور اہم مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کیونکہ بہت سے ایسے خواب ہیں جو بعینہٖ یا تھوڑے سے تغیر کے ساتھ خارج میں واقع ہو جاتے ہیں۔

مادی تفسیریں اس قسم کے خوابوں کی توجیہ کرنے سے عاجز ہیں، جبکہ روحانی تفسیریں اس مسئلے کو اچھی طرح سے واضح کر سکتی ہیں، کیونکہ انسان کی روح بدن سے جدا ہونے اور عالم ارواح سے ارتباط کے وقت بہت سے گزشتہ اور آئندہ سے مربوط حقائق جان لیتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو سچے خوابوں کی بنیاد ہے۔ (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۹ سورۂ یوسف کی آیہ ۴ کے ذیل میں رجوع فرمائیں جہاں اس سلسلے میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے)

۲۔ **"نیند" روایاتِ اسلامی کی رُو سے:** جو روایات مفسرین نے زیرِ بحث آیات کے ذیل میں ذکر کی ہیں ان سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں "نیند" روح کی عالمِ ارواح کی طرف حرکت کو کہا گیا ہے اور "بیداری" روح کی بدن کی طرف واپسی اور ایک قسم کی حیاتِ مجدد ہے۔

ایک حدیث میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ اپنے اصحاب کو اس طرح تعلیم دیتے تھے:

لا ینام المسلم وھو جنب، لا ینام الا علی طھور، فان لم یجد الماء فلیتیمم بالصعید، فان روح المؤمن ترفع الی اللہ تعالی فیقبلھا، ویبارک علیھا، فان کان اجلھا قد حضر جعلھا فی کنوز رحمتہ، وان لم یکن اجلھا قد حضر بعث بھا مع امنائہ من ملائکتہ، فیردونھا فی جسدہ

مسلمان کو چاہیے کہ وہ حالتِ جنابت میں نہ سوئے، وضو کی طہارت کے بغیر بستر پر نہ جائے، اور اگر پانی نہ ہو

---

[1] مجمع البیان زیرِ بحث آیہ کے ذیل میں اور تفسیر صافی

[2] اس بات کی طرف توجہ رہے کہ اس روایت میں "روح" سے مراد روح حیوانی اور بدن کی اصلی مشینری کا کام کرنا ہے اور "نفس" روحِ انسانی کے معنی میں ہے۔

تو تیمم کرلے کیونکہ مومن کی روح خداوند تعالیٰ کی طرف اوپر کو جاتی ہے وہ اسے قبول کرتا اور برکت دیتا ہے، اگر اس کی اجل آخر کو پہنچ گئی ہو تو اسے اپنی رحمت کے خزانوں میں قرار دیتا ہے اور اگر اجل آخر کو نہ پہنچی ہو تو اپنے امین فرشتوں کے ساتھ اس کے بدن کی طرف پلٹا دیتا ہے [1]

ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے اس طرح منقول ہے:

اذا قمت باللیل من منامك فقل، الحمد لله الذی رد علی روحی لاحمده و اعبده

جس وقت رات کو نیند سے بیدار ہو تو اس طرح کہہ: الحمد لله الذی رد علی روحی لاحمده و اعبده۔ (یعنی حمد خاص خدا کے لیے ہے جس نے میری روح کو میری طرف لوٹایا تاکہ میں اس کی حمد و ثنا اور اس کی عبادت کروں) [2]

اس سلسلے میں اور بھی بہت سی احادیث بیان ہوئی ہیں۔

---

[1] خصال صدوق (نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۸۸ کے مطابق)

[2] اصول کافی (نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۸۸ کے مطابق)

۴۵۔ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○

۴۶۔ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○

۴۷۔ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ○

۴۸۔ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○

ترجمہ

۴۵۔ جس وقت خدا کو وحدت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے متنفر ہو جاتے ہیں لیکن جب دوسرے معبودوں کا ذکر ہوتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

۴۶۔ کہہ دے: خداوندا! تو ہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور پنہاں و آشکار بھیدوں کا جاننے والا ہے، تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان باتوں کے لیے جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے، فیصلہ کرے گا

۴۷۔ اگر ستم گران تمام چیزوں کے مالک ہو جائیں جو روئے زمین پر ہیں اور اتنا ہی ان کے پاس اور بھی ہو تو وہ روزِ قیامت کے عذاب سے رہائی حاصل کرنے کے لیے ان سب کو قربان کرنے پر تیار ہو جائیں گے

اور خدا کی طرف سے ان کے لیے ایسے امور ظاہر ہوں گے جن کا وہ گمان بھی نہیں کرتے تھے۔

۴۸۔ اس دن وہ بُرے اعمال جنھیں وہ انجام دیا کرتے تھے ان کے لیے ظاہر ہو جائیں گے اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی انھیں آکر گھیر لے گی۔

تفسیر

وہ لوگ جو خدا کے نام سے گھبراتے ہیں

ان آیات میں پھر توحید اور شرک کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ پہلی زیرِ بحث آیت میں مشرکین اور معاد کے منکرین کا توحید کے مقابلے میں ایک انتہائی قبیح اور بُرا چہرہ دکھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس وقت خدائے یگانہ و یکتا کا نام لیا جائے تو ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے متنفر ہو جاتے ہیں لیکن جب دوسرے معبودوں کے بارے میں کوئی گفتگو ہوتی ہے تو سرور میں ڈوب جاتے ہیں (واذا ذکر اللہ وحدہ اشمأزت قلوب الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون)۔[1]

کبھی انسان برائیوں کا اس طرح سے عادی ہو جاتا ہے اور پاکیزگیوں اور نیکیوں سے ایسا بیگانہ ہو جاتا ہے کہ حق کا نام سننے سے ناراحت اور متنفر ہوتا ہے اور باطل کے ذکر سے مسرور اور خوش ہوتا ہے جو خدا عالمِ ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اس کے سامنے سرِ تعظیم نہیں جھکاتا، لیکن پتھر اور لکڑی کے ٹکڑے کے سامنے جو اس کا اپنا بنایا ہوا ہے یا انسانوں اور اپنے ہی جیسے دوسرے موجودات کے آگے زانوئے ادب جھکا دیتا ہے اور ان کی تعظیم و تکریم کرتا ہے۔

اسی معنی کے مشابہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۴۶ میں بھی ہے:

واذا ذکرت ربک فی القرآن وحدہ ولوا علیٰ ادبارھم نفورًا

جس وقت تو اپنے پروردگار کا قرآن میں وحدانیت کے ساتھ ذکر کرتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

خدا کے عظیم پیغمبر نوحؑ اس قسم کے کج فکروں کی بارگاہِ خداوندی میں شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اٰذانھم واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارًا

خداوندا! جب بھی میں نے انھیں دعوت دی کہ وہ تیری بارگاہ میں آئیں تاکہ تو انھیں بخش دے تو انھوں نے

---

[1] "اشمأزت" "اشمئزاز" کے مادہ سے گرفتگی اور کسی چیز سے تنفر کے معنی میں ہے وھو منصوب بحال او مفعول مطلق کے عنوان سے۔

اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے سر اور چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ لیا تاکہ وہ میری آواز نہ سن سکیں اور انھوں نے گمراہی کی راہ میں اصرار کیا اور بہت شدت کے ساتھ تکبر و استکبار کیا۔

(نوح ——— ۷)

ہاں: ہٹ دھرم تعصب کرنے والوں اور مغرور جاہلوں کا یہی حال ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس گروہ کی بدبختی کا سرچشمہ دو چیزیں تھیں، اصولِ توحید کا انکار اور آخرت پر ایمان نہ رکھنا۔

ان کے برعکس وہ مومن ہیں جو خداوند یگانہ کا نام سن کر اس کے مقدس نام کی طرف اس طرح کھنچتے اور جذب ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ہر چیز اس کی راہ میں نثار کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ محبوب کا نام ان کے کام و دہن کو شیریں، ان کے مشامِ جاں کو معطر اور ان کے سارے دل کو روشن کر دیتا ہے، نہ صرف اس کا نام بلکہ ہر وہ چیز جو اس سے ارتباط اور تعلق رکھتی ہے ان کے لیے سرور آفرین ہے۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ صفت زمانہ پیغمبرؐ کے مشرکین کے ساتھ مخصوص تھی بلکہ ہر زمانے میں ایسے تاریک دل منحرفین ہوتے ہیں جو خدا کے دشمنوں کے نام اور الحادی مکاتبِ فکر اور ظالموں کی کامیابی کا ذکر سننے سے خوش ہوتے ہیں لیکن نیک اور پاک لوگوں، ان کے پروگراموں اور کامیابیوں کا نام ان کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس لیے بعض روایات میں اس آیت سے ایسے لوگ مراد لیے گئے ہیں جو اہلِ بیتِ پیغمبرؐ کے فضائل سننے سے یا ان کے مکتب کی پیروی سے نارحت اور پریشان ہو جاتے ہیں[1]

جب گفتگو یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ یہ ہٹ دھرم گروہ اور مغرور جاہل خداوند یگانہ کا نام تک بھی سننے سے متنفر و بیزار ہیں تو اللہ اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان سے منہ پھیر لے اور اپنے پروردگار کی بارگاہ کی طرف رُخ کرے، اس سے ایسے لب و لہجے کے ساتھ گفتگو کر جو اس کے عشق سے سرشار اور گہرے ایمان کا ترجمان ہے اور اس کی بارگاہ میں اس گروہ کی شکایت کر تاکہ اپنے دل کو بھی جو غم زدہ ہے آرام و سکون دے سکے اور اس طریقہ سے سوئے ہوئے غافل انسانوں کی ارواح کو بھی ہلا سکے۔ فرمایا گیا ہے: کہہ دے خداوندا! اے وہ کہ جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور پنہاں و آشکار بھیدوں سے آگاہ ہے، تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان باتوں کے لیے جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے فیصلہ کرے گا (قل اللّٰھم فاطر السماوات والارض عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیہ یختلفون)[2]

ہاں قیامت کا دن، جو تمام اختلافات اٹھ جانے کا دن ہے اور پوشیدہ حقائق ظاہر ہو جانے کا دن ہے، اس دن حاکمِ مطلق اور فرمانروا تو ہی ہے، تو ہی سب چیزوں کا خالق ہے اور ان کے اسرار سے بھی آگاہ ہے وہاں تیرے فیصلے سے اختلافات ختم ہو جائیں گے اور یہ ہٹ دھرم گمراہ اپنی غلطی کو سمجھ لیں گے اور وہاں فکر و نظر کی تلافی ہو جائے گی، لیکن انھیں کیا فائدہ؟

---

[1] اصولِ کافی اور روضہ کافی (نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۰ کے مطابق)

[2] (فاطر السماوات) منصوب ہے منادائی مضاف کے عنوان سے۔

درحقیقت ان آیات میں مشرکین اور ظالموں سے مربوط چار باتیں بیان ہوئی ہیں :

پہلی یہ کہ اس دن عذابِ الٰہی کا ہول و وحشت اس قدر زیادہ ہوگا کہ اگر ان کے پاس روئے زمین کی ثروت و اموال کا دگنا بھی ہو تو وہ عذاب سے رہائی پانے کے لیے تمام کا تمام دینے پر تیار ہوجائیں گے لیکن وہاں کچھ نہ بن پائے گا ۔

دوسری یہ کہ خدا کی سزاؤں کی وہ اقسام جو کبھی بھی ان کے ذہن میں نہیں آئی تھیں ان کے سامنے ظاہر ہوجائیں گی ۔

تیسری یہ کہ ان کے برے اعمال ان کے سامنے آحاضر ہوں گے اور مجسم ہوجائیں گے ۔

چوتھی یہ کہ جس بات کو معاد کے سلسلے میں مذاق سمجھتے تھے اسے حقیقتِ عینی کی صورت میں دیکھ لیں گے اور نجات کے تمام دروازے ان کے لیے بند ہوجائیں گے ۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن کہتا ہے کہ " ان کے برے اعمال آشکار ہوجائیں گے " یہ آیت تجسم اعمال کے مسئلہ پر ایک دلیل ہوگی کیونکہ یہ لازم و ضروری نہیں ہے کہ لفظ مجازات اور کیفر کو مقدر مانا جائے ۔

۴۹۔ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ۭ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

۵۰۔ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

۵۱۔ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ○

۵۲۔ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۴۹۔ جب انسان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو ہمیں (اپنی مشکل کے حل کے لیے) پکارتا ہے، پھر جب ہم اسے کوئی نعمت دے دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ: یہ نعمت تو مجھے میرے علم کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے بلکہ یہ تو ان کی آزمائش کا ذریعہ ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

۵۰۔ یہی بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے تھے، لیکن جو کچھ انھوں نے کمایا تھا وہ ان کے کچھ کام نہ آیا۔

۵۱۔ پس ان کے بُرے اعمال ان کے آگے آئے اور (اہلِ مکہ) کے ان ظالموں کا گروہ بھی اپنے کیے ہوئے بُرے اعمال میں بہت جلد گرفتار ہو جائے گا اور وہ ہرگز عذابِ الٰہی کے چنگل سے نہیں نکل سکیں گے۔

۵۲۔ کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ خدا جس شخص کے لیے چاہے روزی وسیع یا تنگ کر دیتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں آیات اور نشانیاں ہیں۔

تفسیر

سختیوں میں یادِ خدا لیکن.....

یہاں پھر موضوعِ سخن بے ایمان اور ظالم لوگ ہیں اور ان کے قبیح چہروں میں سے ایک اور چہرہ دکھایا جارہا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جب انسان کو کوئی ضرر یا نقصان پہنچتا ہے (اور کوئی درد و رنج و فقر پہنچتا ہے) تو اپنی مشکل کے حل کے لیے مجھے پکارتا ہے (فاذا مس الانسان ضر دعانا)۔

وہی انسان جو گزشتہ آیات کے مطابق خدائے یگانہ کا نام سننے پر اظہارِ تنفر کرتا تھا، ہاں! وہی انسان حوادث میں گرفتاری کے وقت لطفِ الٰہی کے سایے میں پناہ لیتا ہے۔

لیکن وہ بھی وقتی طور پر۔ جس وقت ہم اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا کر دیتے ہیں اور اس کا درد و رنج دور کر دیتے ہیں تو وہ ہمارے لطف و عطا کو بھلا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ نعمت تو میں نے خود حاصل کی ہے اور یہ میری لیاقت (اور کام جاننے) کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے (ثم اذا خولناہ نعمۃ منا قال انما اوتیتہ علی علم)۔[1]

اس گفتگو کا نمونہ سورۂ قصص کی آیہ ۷۸ میں قارون کی زبانی موجود ہے، جس نے بنی اسرائیل کے ان علماء کے سامنے جنھوں نے اسے یہ پند و نصیحت کی تھی کہ ان خداداد نعمتوں سے اس کی رضامندی حاصل کرے، یہ کہا تھا:

انما اوتیتہ علی علم عندی

یہ وہ نعمات ہیں جنھیں میں نے اپنے علم و دانش کی وجہ سے حاصل کیا ہے۔

یہ بے خبر غافل کچھ بھی تو نہیں سوچتے کہ وہ علم و دانش بھی تو خدا ہی کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ کیا انھوں نے یہ علم و دانش جو ان کی تدبیرِ معاش اور فراواں آمدنی کا سبب ہے خود اپنے آپ کو دیا ہے یا کیا یہ ازل سے ان کی ذات کا جزء تھا؟

بعض مفسرین نے اس جملے کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: یہ نعمات خدا نے ہمیں اس بنا پر دی ہیں چونکہ وہ ہماری لیاقت و استعداد کو جانتا تھا۔

اگرچہ یہ احتمال زیرِ بحث آیت میں تو ممکن ہے لیکن سورۂ قصص کی آیت میں قارون کے بارے میں "عندی" (میرے پاس) کے لفظ کی طرف توجہ کرتے ہوئے ممکن نہیں ہے اور یہ امر زیرِ بحث آیت کے لیے پہلی تفسیر کی ترجیح کے لیے ایک قرینہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] "خول" "تخویل" کے مادہ سے اعطاء و بخشش اور تفضل کے معنی میں ہے اور اسی سورۂ زمر کی آیہ ۸ کے ذیل میں ہم نے اس لفظ کی مزید تشریح کی ہے۔ "اوتیتہ" کی ضمیر باوجود اس کے کہ وہ نعمت کی طرف لوٹتی ہے، مذکر کی صورت میں آئی ہے، کیونکہ اس سے مراد "شیء من النعمۃ" یا "قسم من النعمۃ" ہے۔

اس کے بعد قرآن ان خود غرض اور کم ظرف لوگوں کے جواب میں، جو نعمت حاصل ہوتے ہی بہت جلد خود کو بھول جاتے ہیں اس طرح کہتا ہے: بلکہ یہ نعمت تو ان کی آزمائش کا ایک ذریعہ ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے (بل ھی فتنۃ و لکن اکثرھم لا یعلمون)۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ سخت حوادث ظاہر ہونے اور اس کے بعد بڑی بڑی نعمتیں پا لینے سے جو کچھ ان کے اندر ہے اسے ظاہر کر دیں۔

کیا وہ مصیبت کے وقت مایوس اور نعمت کے وقت مغرور ہو جاتے ہیں؟

کیا ان انقلابات میں بھی خدا کو یاد کرتے ہیں یا دنیا میں غرق ہو جاتے ہیں؟

کیا وہ اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں یا اپنی کمزوریوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے خدا کو پہلے سے بھی زیادہ یاد کرتے ہیں؟

لیکن افسوس! زیادہ تر لوگ فراموش کار ہی ہیں اور وہ ان حقائق سے آگاہ نہیں ہیں۔

اس حقیقت کو قرآنی آیات میں بارہا دہرایا گیا ہے کہ خداوند حکیم کبھی تو انسان کو مشکلات کی سختیوں میں مبتلا کرتا ہے اور کبھی عیش و آرام اور آسائش و نعمت میں تاکہ ان طریقوں سے اسے آزمائے، اس کے وجود کی قدر و قیمت کو بلند کر دے اور اسے اس حقیقت سے آشنا کر دے کہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔

اصولی طور پر فضا ساز شدائد فطرت کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں، جیسے نعمتیں معرفت کا مقدمہ بنتی ہیں (اس سلسلہ میں جلد ۱۶ سورۂ عنکبوت کی آیہ ۶۵ کے ذیل میں بھی ہم نے گفتگو کی ہے)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ انسان آیا ہے اور فراموش کار اور مغرور کے طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایسے انسانوں کی طرف اشارہ ہے جو خدائی مکاتب کے زیر تربیت نہیں آتے اور جن کا کوئی مربی اور راہنما نہیں تھا۔ ان کی خواہشات آزاد تھیں اور وہ ہوا و ہوس میں غوطہ زن تھے اور خود رو گھاس کے مانند تھے۔ ہاں! یہی وہ لوگ ہیں کہ جس وقت وہ درد و رنج میں گرفتار ہوتے ہیں تو خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں اور جب حوادث کا طوفان رُک جاتا ہے اور انھیں نعمتیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر خدا کو بھول جاتے ہیں (اس سلسلے میں مزید تشریح "انسان قرآنِ کریم میں" کے عنوان کے تحت جلد ۶ سورۂ یونس کی آیہ ۱۲ کے ذیل میں مطالعہ کریں)

بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: یہ بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (وہ بھی یہی دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ہماری نعمتیں ہمارے علم و لیاقت کی پیداوار ہیں) لیکن جو کچھ انھوں نے حاصل کیا تھا وہ ان کے کچھ کام نہ آیا (قد قالھا الذین من قبلھم فما اغنیٰ عنھم ما کانوا یکسبون)[1]۔

ہاں قارون جیسے مغرور افراد اپنے اموال کو اپنی لیاقت و قابلیت کی پیداوار سمجھتے تھے اور ان پر جو خدا کی نعمتیں تھیں انھیں وہ

---

[1] "قد قالھا" کی ضمیر "کلمہ" یا "مقالہ" کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ امر سابقہ جملے سے سمجھا جا سکتا ہے اور اس سے مراد "ما اوتیتہ علیٰ علم" کا جملہ ہے۔

بھلا چکے تھے۔ انھوں نے مبدء اصلی سے غافل ہوکر صرف ظاہری اسباب پر نظریں جمالی تھیں، لیکن تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جس وقت خدا نے انھیں اور ان کے خزانوں کو زمین میں دھنسا دیا تو کوئی بھی ان کی مدد کرنے والا نہیں تھا اور ان کا مال و دولت ان کی حالت کے لیے کوئی فائدہ نہ دے سکا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

فخسفنا به و بداره الارض فما كان له من فئة ينصرونه من دون الله (قصص، ۸۱)

نصرف قارون بلکہ عاد و ثمود اور قوم سبا جیسی اقوام بھی اسی انجام میں گرفتار ہوئیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ان کے برے اعمال انھیں دامن گیر ہوگئے (فاصابهم سيئات ما كسبوا)۔

ان میں سے سب عذابِ الٰہی کی کسی ایک قسم طوفان، سیلاب، زلزلہ یا صیحہ آسمانی میں گرفتار ہوگئے اور تباہ و برباد ہوگئے۔

مزید فرمایا گیا ہے: یہ انجام انھیں میں منحصر نہیں تھا بلکہ مکہ کے یہ ظالمین و مشرکین بھی بہت جلد اپنے برے اعمال میں گرفتار ہوں گے اور ہرگز عذابِ الٰہی کے چنگل سے بھاگ کر نہیں نکل سکتے (والذين ظلموا من هؤلاء سيصيبهم سيئات ما كسبوا وما هم بمعجزين)۔

بلکہ یہ بات تو ان سے بھی اوپر جاتی ہے اور ہر دور خدا سے بے خبر اور مغرور ستم گر اس میں شامل ہیں۔

"سيصيبهم سيئات ما كسبوا" سے مراد دنیاوی عذاب ہے یا اخروی، اس بارے میں دونوں احتمال ذکر کیے گئے ہیں لیکن "فاصابهم سيئات ما كسبوا" (ان سے پہلے لوگ بھی اپنے برے اعمال میں گرفتار ہوئے تھے، کے قرینہ سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے)۔

جو کہتے تھے کہ ہماری نعمتیں خود ہماری آگاہی اور توانائی کی وجہ سے ہیں، قرآن ان سے کہتا ہے کہ گزرے ہوئے لوگوں کی تاریخ پڑھو اور دیکھو کہ یہی بات دوسرے لوگوں نے بھی کہی تھی اور وہ کیسے کیسے مصائب اور عذاب میں گرفتار ہوئے، یہ ایک تاریخی جواب ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں ایک عقلی جواب دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کیا وہ نہیں جانتے کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی کشادہ یا تنگ کر دیتا ہے (اولم يعلموا ان الله يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر)۔

کتنے بہت سے ایسے اہل اور لائق افراد ہیں جو زندگی میں محروم اور گوشہ نشین ہیں اور کتنے بہت سے ایسے کمزور و ناتواں افراد ہیں جو ہر لحاظ سے نعمتوں سے بہرہ مند ہیں، اگر ساری کی ساری مادی کامیابیاں خود افراد کی اپنی سعی و کوشش اور لیاقت و قابلیت کی بنا پر انھیں حاصل ہوتیں تو پھر ہمیں یہ منظر نظر نہ آتے۔

یہی چیز خود اس بات کا ثبوت ہے کہ عالم اسباب کی پشت پر ایک اور طاقتور ہاتھ بھی ہے جو اسے بچے تلے نظام کے مطابق چلا رہا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کو زندگی میں سعی و کوشش کرنا چاہیے یہ بھی درست ہے کہ جہاد و کوشش بہت سی مشکلات کے حل کی کلید ہے،

۵۳۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○

۵۴۔ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ○

۵۵۔ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○

ترجمہ

۵۳۔ کہہ دے: اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے اوپر ظلم و اسراف کیا ہے! خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو جانا، کیونکہ خدا سارے گناہوں کو بخش دے گا۔ بیشک وہ غفور و رحیم ہے۔

۵۴۔ اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں رجوع کرو اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر لو، اس سے پہلے کہ عذاب تمھاری طرف آئے اور پھر کسی کی طرف سے تمھاری مدد نہ ہو۔

۵۵۔ اور ان بہترین احکام کی جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں پیروی کرو، اس سے پہلے کہ (خدائی) عذاب اچانک تمھاری طرف آ جائے جبکہ تمھیں اس کی کوئی خبر بھی نہ ہو۔

تفسیر

خدا تمام گناہوں کو بخش دے گا

گزشتہ آیات میں مشرکین اور ظالمین کے بارے میں بار بار تہدیدیں آئی ہیں، ان کے بعد اب ان آیات میں تمام گنہ گاروں کو امید دلائی جا رہی ہے اور ان کے لیے بازگشت کا راستہ کھولا جا رہا ہے، کیونکہ ان تمام امور کا ہدف اصلی تربیت و ہدایت ہے نہ کہ انتقام جوئی اور خشونت و سختی۔ انتہائی لطف اور محبت بھرے انداز میں، سب کے لیے اپنی آغوش رحمت کھولے ہوئے اور ان کے لیے عفو و مہربانی کا

فرمان صادر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ان سے کہہ دے ! اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنے اوپر اسراف اور ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو جانا ، کیونکہ خدا تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے (قل یاعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا انہ ھو الغفور الرحیم)۔

اس آیت کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت قرآن کی آیات میں گنہ گاروں کے لیے سب سے زیادہ امید بخش ہے اور اس کی وسعت اس حد تک ہے کہ ایک روایت کے مطابق امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا کہ سارے قرآن میں کوئی آیت اس سے زیادہ وسیع نہیں ہے۔ آپ کے الفاظ یوں ہیں :۔

مافی القرآن أیۃ اوسع من یاعبادی الذین اسرفوا..... [1]

اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ :

۱۔ " یاعبادی " (اے میرے بندو !) کی تعبیر پروردگار کی جانب سے ایک لطف و عنایت کا آغاز ہے۔

۲۔ " اسراف " کی تعبیر "ظلم و گناہ و جرم" کے بجائے ایک اور لطف ہے۔

۳۔ "علی انفسھم " کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کے سارے گناہ خود اسی کی طرف لوٹتے ہیں، یہ پروردگار کی محبت کی ایک اور نشانی ہے، جیسا کہ ایک شفیق باپ اپنے بیٹے سے کہتا ہے : " یہ سارا ظلم اپنے اوپر نہ کر "

۴۔ " لا تقنطوا " (ناامید نہ ہوں) کی تعبیر کہ " قنوط " اصل میں اچھائی اور خیر سے مایوس ہونے کے معنی میں ہے۔ تنہا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ گنہ گاروں کو " لطف الٰہی " سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

۵۔ " من رحمۃ اللہ " کی تعبیر " لا تقنطوا " کے بعد اس خیر و محبت پر اور بھی زیادہ تاکید ہے۔

۶۔ جب ہم " ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا " کے جملے پر پہنچتے ہیں، جس کی ابتداء حرفِ تاکید کے ساتھ ہو رہی ہے اور لفظ " الذنوب " (الف ولام کے ساتھ جمع) جو بغیر کسی استثناء کے تمام گناہوں کو اپنے دامن میں لے لیتا ہے تو گفتگو اوج و بلندی پر پہنچ جاتی ہے اور دریائے رحمت موجزن ہو جاتا ہے۔

۷۔ جس وقت " جمیعًا " کا یعنی ایک اور تاکید کا اضافہ ہو جاتا ہے تو امید آخری مرحلے تک پہنچ جاتی ہے۔

۸۔ خدا کی " غفور " و " رحیم " کے ساتھ توصیف جو پروردگار کی صفات میں سے دو امید بخش اوصاف ہیں، آیت کے آخر میں یاس و ناامیدی کی کم سے کم گنجائش بھی باقی نہیں رہنے دیتی۔

ہاں ! اسی دلیل کی بنیاد پر یہ آیت قرآن کی آیات میں سب سے زیادہ وسعت رکھنے والی آیت ہے جو ہر قسم کے گناہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور اسی وجہ سے یہ قرآن مجید کی آیات میں سب سے زیادہ امید بخش آیت شمار ہوتی ہے۔

واقعًا ایسی ذات سے جس کا دریائے لطف بیکراں ہے، اور جس کے فیض کی شعاعیں غیر محدود ہیں، اس سے اس کے علاوہ اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

---

[1] مجمع البیان، تفسیر قرطبی اور تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

وہ ذات جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے اور جس نے اپنے بندوں کو رحمت کیلئے ہی پیدا کیا ہے نہ کہ خشم و عذاب کے لیے، اس سے اس کے علاوہ اور کوئی امید نہیں۔

کیا رحیم و مہربان خدا ہے اور کیسا مہر و محبت والا پروردگار!

یہاں دو مسائل نے مفسرین کی فکر کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان کا حل خود اسی آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں پوشیدہ ہے۔

پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ کیا آیت کی عمومیت تمام گناہوں کو حتیٰ کہ شرک اور دوسرے تمام گناہانِ کبیرہ پر بھی محیط ہے اگر ایسا ہے تو پھر سورۂ نساء کی آیہ ۴۸ میں شرک کو قابلِ بخشش گناہوں سے الگ کیوں کیا گیا ہے؟ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء

خدا شرک کو نہیں بخشتا لیکن اس کے سوا دوسرے گناہوں میں سے جسے چاہے بخش دیتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مغفرت کا یہ وعدہ جو زیرِ بحث آیت میں آیا ہے کیا یہ مطلق ہے یا توبہ اور اسی قسم کی کسی چیز کے ساتھ مشروط ہے؟

البتہ یہ دونوں سوالات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور ان کا جواب بعد والی آیات میں اچھی طرح سے مل سکتا ہے کیونکہ بعد والی آیات میں تین حکم دیئے گئے ہیں جو تمام باتوں کو واضح کر دیتے ہیں۔

"وانیبوا الیٰ ربکم" (اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو)

"واسلموا لہ" (اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو)

"واتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم" (ان بہترین احکام و فرامین کی پیروی کرو جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں)

یہ تینوں احکام تو یہ کہتے ہیں کہ غفران و رحمت کے دروازے تو تمام بندوں پر بغیر کسی استثناء کے کھلے ہوئے ہیں لیکن وہ اس بات کے ساتھ مشروط ہیں کہ وہ گناہ کے ارتکاب کے بعد ہوش میں آئیں، اپنا راستہ بدل لیں، درگاہِ خداوندی کی طرف رجوع کریں، اس کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں اور عمل کے ساتھ اس توبہ و انابت میں اپنی صداقت کی نشاندہی کریں۔ اس طرح سے نہ شرک اس سے مستثنیٰ ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا گناہ اور اس عفو عمومی اور رحمت واسعہ کا کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہونا بھی ناقابلِ انکار ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سورہ نساء کی آیہ ۴۸ میں مشرکین کے لیے بخشش اور عفو کے بارے میں استثناء کیا گیا ہے تو وہ ان مشرکین کے بارے میں ہے جو حالتِ شرک میں دنیا سے جائیں نہ کہ وہ جو بیدار ہو جائیں اور راہِ حق پر چل پڑیں، کیونکہ صدرِ اسلام کے مسلمانوں کی اکثریت اسی قسم کی تھی۔

اگر ہم بہت سے مجرمین کی حالت پر نظر کریں تو گناہ کرنے کے بعد اس طرح پریشان اور پشیمان ہوتے ہیں کہ انھیں یقین ہی نہیں آتا کہ ان کے لیے بازگشت کی کوئی راہ بھی کھلی ہو گی اور وہ اپنے آپ کو ایسا آلودہ سمجھتے ہیں کہ وہ گویا کسی بھی پانی کے ساتھ پاک ہونے کے قابل نہیں ہیں، وہ پوچھتے ہیں کہ کیا واقعاً ہمارے گناہ بھی قابلِ بخشش ہیں؟

وہ سوچتے ہیں کیا خدا کی طرف ہمارے لیے بھی کوئی راستہ کھلا ہوا ہے؟ کیا ہماری واپسی کی بھی کوئی گنجائش ہے؟

اگر ہم اس کیفیت پر نظر رکھیں تو آیت کے مفہوم کو اچھی طرح سے سمجھ لیں گے، کیونکہ وہ ہر قسم کی توبہ کے لیے تو آمادہ ہیں لیکن اپنے گناہ کو قابلِ بخشش نہیں سمجھتے، خصوصاً اگر انھوں نے بارہا توبہ کی ہو اور توڑ ڈالی ہو۔

یہ آیت ان سب کو خوشخبری دے رہی ہے کہ تم سب کے لیے راستہ کھلا ہے۔

اسی لیے تاریخِ اسلام کے مشہور مجرم اور سید الشہداء حمزہ کے قاتل "وحشی" نے جب مسلمان ہونا چاہا تو وہ اس بات سے ڈر رہا تھا کہ اس کی توبہ قبول نہ ہوگی کیونکہ واقعاً اس کا گناہ بہت بڑا تھا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس نے رحمتِ الٰہی کے دروازے اس وحشی اور دوسرے توبہ کرنے والے وحشیوں پر کھول دیے۔

اگرچہ یہ سورہ مکی سورتوں میں سے ہے اور جس دن یہ آیت نازل ہوئی اس وقت تک نہ جنگِ اُحد ہوئی تھی، نہ حضرت حمزہ کی شہادت رونما ہوئی تھی اور نہ ہی وحشی کی توبہ کا مسئلہ تھا۔ لہٰذا یہ ماجرا اس آیت کے لیے شانِ نزول نہیں بن سکتا، بلکہ ایک قانون کلی کی ایک مصداق پر تطبیق ہو سکتا ہے۔ لیکن بہرحال یہ واقعہ آیت کے مفہوم کی وسعت کو مشخص کر سکتا ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہے کہ روح المعانی میں آلوسی جیسے مفسرین کا اس چیز پر اصرار کہ اس آیت میں غفران و بخشش کا وعدہ کسی چیز سے مشروط نہیں ہے ایک غلط بات ہے اگرچہ اس نے اس کے لیے سترہ دلیلیں ذکر کی ہیں کیونکہ یہ بعد والی آیات کے ساتھ واضح تضاد رکھتی ہے اور اس کی سترہ دلیلیں جن میں سے بہت سی قابلِ اعتنا ہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتیں کہ خدا کی رحمت وسیع اور کشادہ ہے جس میں تمام گنہ گار شامل ہیں اور یہ چیز بعد والی آیات کے قرینے سے، اس وعدۂ الٰہی کے مشروط ہونے کے منافی نہیں۔

اس آیت کے سلسلے میں کچھ اور مطالب بھی ہیں جو انشاء اللہ "چند نکات" کے تحت آئیں گے۔

بعد والی آیت میں تمام مجرموں اور گنہ گاروں کو رحمتِ الٰہی کے اس بے کراں دریا میں ورود کی راہ دکھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آؤ (وانیبوا الی ربکم)۔

اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لو، اس کا فرمان دل و جان کے ساتھ سنو اور اسے قبول کرو۔ اس سے پہلے کہ عذابِ الٰہی تمھیں دامن گیر ہو جائے اور پھر کوئی تمھاری مدد نہ کر سکے (واسلموا لہ من قبل ان یأتیکم العذاب ثم لا تنصرون)۔

ان دو مراحل (مرحلہ انابت اور اسلام) کو طے کر لینے کے بعد تیسرے مرحلے کے بارے میں جو مرحلۂ عمل ہے، گفتگو کرتے ہوئے مزید فرمایا گیا ہے: ان بہترین احکام کی جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں پیروی کرو، اس سے پہلے کہ عذابِ الٰہی اچانک تمھارے پاس آ جائے اور تمھیں اس کی خبر بھی نہ ہو (واتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم من قبل ان یأتیکم العذاب بغتۃ وانتم لا تشعرون)۔

اس طرح سے رحمتِ خدا تک پہنچنے کی راہ تین قدموں سے زیادہ نہیں ہے۔

پہلا قدم توبہ اور گناہ پر پشیمانی اور خدا کی طرف رُخ۔

دوسرا قدم ایمان اور خدا کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم۔

کمن ولدته امه

وہ اس شخص کی طرح ہے جو ابھی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔

اس طرح سے قرآن لطفِ الٰہی کے دروازوں کو ہر انسان کے لیے ہر حالت میں اور ذمہ داریوں کے ہر قسم کے بوجھ کی صورت میں کھلا رکھتا ہے، اور اس کی واضح دلیل زیرِ بحث آیات ہیں۔ ان میں طرح طرح سے مجرموں اور گنہ گاروں کو خدا کی طرف دعوت دی گئی ہے اور انھیں یہ اعتماد دیتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو گزشتہ زندگی سے بالکل جدا کر سکتے ہیں۔

ایک روایت میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے:

التائب من الذنب کمن لا ذنب له

جو شخص گناہ سے توبہ کرلے وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے اصلاً کوئی گناہ نہ کیا ہو[1]

یہی مفہوم کچھ اضافے کے ساتھ امام باقرؑ سے نقل ہوا ہے، آپؑ نے فرمایا:

التائب من الذنب کمن لا ذنب له، والمقیم علی الذنب وهو مستغفر منه کالمستهزء

جو شخص گناہ سے توبہ کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو اور جو شخص استغفار کے ساتھ ساتھ گناہ بھی جاری رکھے ہوئے ہو تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو مذاق کرتا ہو[2]

لیکن ظاہر ہے کہ رحمتِ الٰہی کی طرف یہ واپسی بلا شرط نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ حکیم ہے اور وہ کوئی کام بے حساب نہیں کرتا۔ اگر اس نے اپنی رحمت کی آغوش کو سب کے لیے کھول رکھا ہے اور انھیں ہمیشہ اپنی طرف بلاتا رہتا ہے تو اس کے لیے بندوں میں اہلیت کا ہونا بھی ضروری ہے ایک طرف تو انھیں اپنے تمام وجود کے ساتھ بازگشت کا خواہاں ہونا چاہیے اور اندرونی انقلاب اور بنیادی تبدیلی پیدا کرنی چاہیے۔ دوسری طرف بازگشت کے بعد اپنے ایمان اور اعتقاد کی ان بنیادوں کو نئے سرے سے اٹھانا چاہیے جو طوفانِ گناہ کے باعث منہدم ہو چکی ہیں۔

تیسری طرف اعمالِ صالح کے ذریعے اپنی روحانی ناتوانی اور اخلاقی کمزوری کی تلافی کرنا چاہیے البتہ سابق گناہ جتنے زیادہ سنگین تھے اسی حساب سے زیادہ صالح اعمال بجالانے چاہییں اور یہ بالکل وہی چیز ہے جسے قرآن نے مذکورہ بالا تین آیات میں "انابت" "اسلام" اور "اتباعِ احسن" کے عنوان سے بیان کیا ہے۔

۲۔ **سنگین بوجھ والے افراد:** بعض مفسرین نے ان آیات کی کچھ شانِ نزول بیان کی ہیں جو سب کی سب احتمالاً تطبیق کی حیثیت رکھتی ہیں نہ کہ شانِ نزول کی۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۱۲۷ (مادہ توبہ)

[2] اصول کافی جلد ۲ باب توبہ حدیث ۱۰ ص ۴۱۶

ان میں سے ایک "وحشی" کی داستان ہے جو میدانِ اُحد میں بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا تھا اور پیغمبر اکرمؐ کے چچا حضرت حمزہؓ جیسے شجاع اور بہادر کمانڈر کو بزدلانہ طریقے سے شہید کر دیا جنھوں نے ہر جگہ اپنی جان کو پیغمبر اکرمؐ کے لیے سپر بنا رکھا تھا۔ جب اسلام کو عروج حاصل ہوا اور مسلمان ہر جگہ کامیاب ہوئے تو اس وحشی نے بھی اسلام قبول کرنا چاہا لیکن وہ ڈر رہا تھا کہ اس کا اسلام قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس ضمن میں مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور وہ اسلام لے آیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اس سے پوچھا:

تو نے میرے چچا کو کس طرح قتل کیا تھا؟

اس نے تفصیل کے ساتھ واقعہ بیان کیا۔ پیغمبر اکرمؐ بہت زیادہ روئے، اس کی توبہ تو قبول کر لی، لیکن اس سے فرمایا:

غیب وجهك عنی فانی لا استطیع النظر الیك فلحق بالشام فمات فی الخمر

میری آنکھوں کے سامنے کبھی نہ آنا کیونکہ میں تجھے نہیں دیکھ سکتا۔ وحشی سرزمینِ شام کی طرف چلا گیا اور آخرکار خمر نامی علاقے میں جا کر مر گیا۔

بعض لوگوں نے سوال کیا کہ کیا یہ آیت صرف اس وحشی کے بارے میں ہے یا سب مسلمانوں کے لیے ہے؟ فرمایا سب کے لیے ہے۔[1]

دوسری ایک شخص نباش (جو قبروں کو کھود کر کفن چوری کر کے لے جاتا ہے) کی داستان ہے، جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:۔

ایک جوان روتا ہوا پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آیا۔ وہ بہت ہی پریشان تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں خدا کے غضب سے ڈر رہا ہوں۔

فرمایا: کیا تو نے شرک کیا ہے؟

کہا: نہیں!

فرمایا: کیا تو نے خونِ ناحق بہایا ہے؟

عرض کیا: نہیں!

فرمایا: خدا تیرے گناہوں کو بخش دے گا چاہے وہ جتنے بھی زیادہ ہوں۔

عرض کیا: میرا گناہ آسمان و زمین اور عرش و کرسی سے بھی بڑا ہے!

فرمایا: کیا تیرا گناہ خدا سے بھی بڑا ہے؟

عرض کیا: نہیں! خدا تو ہر چیز سے بڑا ہے۔

فرمایا: جا! (توبہ کر) کہ خدا تیرے عظیم گناہِ عظیم کو بخش دیتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اچھا بتا تو سہی تو نے کون سا گناہ کیا ہے؟

عرض کیا: اے رسولِ خدا! مجھے شرم آتی ہے کہ اسے آپ کے سامنے بیان کروں۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۶۳۲ (مادہ "وحش")، تفسیر فخر رازی جلد ۲۷ ص ۴ اور تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۲

فرمایا: آخر بتا تو سہی کہ تو نے کیا کیا ہے؟

عرض کیا: میں سات سال سے قبریں کھود کر مُردوں کے کفن اتارتا رہا ہوں، یہاں تک کہ ایک دن قبر کھودتے ہوئے مجھے (قبر میں) انصار کی ایک لڑکی نظر آئی، جب میں نے اسے برہنہ کر لیا تو میرا نفس ہیجان میں آگیا .....

(اس کے بعد اس نے اپنی دست درازی کا قصہ بیان کیا)

جس وقت اس کی گفتگو یہاں تک پہنچی تو پیغمبر اکرمؐ کو سخت غصہ آیا اور رنجیدہ ہوئے اور فرمایا اس فاسق کو باہر نکال دو اور اس کی طرف رُخ کر کے فرمایا: تو دوزخ سے کتنا نزدیک ہے۔

وہ جوان باہر نکلا تو شدت کے ساتھ رو رہا تھا۔ بیابان کی طرف نکل گیا اور کہتا جاتا تھا: اے محمدؐ کے خدا! اگر تو میری توبہ قبول کرلے تو اس کی اپنے پیغمبر کو اطلاع کر دے۔ ورنہ آسمان سے آگ بھیج کر مجھے جلا دے اور مجھے آخرت کے عذاب سے نجات دے۔ یہ موقع تھا جبکہ قاصد وحی خدا پیغمبر گرامیؐ پر نازل ہوا اور آیہ قل یاعبادی الذین اسرفوا ..... آنحضرتؐ کے حضور میں پڑھی۔[1]

جبرئیل کی طرف سے اس آیت کی تلاوت، یہاں ممکن ہے پہلی بار کی صورت میں نہ ہو کہ شانِ نزول کا پہلو پیدا کرے بلکہ ایک ایسی آیت کا تکرار ہو جو پہلے نازل ہو چکی ہے اور یہ اس گنہ گار شخص کی توبہ قبول کرنے کے اعلان اور زیادہ تاکید و توجہ کے لیے ہو۔

ہم پھر عرض کیے دیتے ہیں کہ اس قسم کے اشخاص جو گناہ کا سنگین بوجھ اپنے کندھوں پر لیے ہوئے ہوتے ہیں وہ اپنے اعمالِ صالح کے ذریعے تلافی کرنے کے لیے بہت بھاری ذمہ داری رکھتے ہیں۔

جناب فخر رازی نے زیرِ بحث آیات کے لیے ایک اور شانِ نزول بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیات اہلِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، وہ کہتے تھے کہ محمدؐ کا خیال یہ ہے کہ جو شخص بت کی پوجا کرے یا جس کا ہاتھ کسی کے خون میں رنگا ہوا ہو وہ کبھی بھی نہیں بخشا جائے گا، اس کے باوجود وہ ہم سے یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام لے آؤ، ہم کس طرح اسلام لے آئیں جبکہ ہم نے بُت پرستی بھی کی ہے اور بے گناہوں کا خون بھی بہایا ہے (تو یہ آیات نازل ہوئیں اور توبہ کا دروازہ ان کے سامنے کھول دیا گیا)۔[2]

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد نہم صفحہ ۴۱۲ (زیرِ بحث آیات کے ذیل میں)

[2] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۷ ص ۴ (زیرِ بحث آیات کے ذیل میں)

۵۶۔ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ ۙ○

۵۷۔ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۙ○

۵۸۔ اَوْ تَقُوْلَ حِیْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِیْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ○

۵۹۔ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰیٰتِیْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ○

ترجمہ

۵۶۔ (یہ احکام اس بنا پر ہیں کہ) مبادا کوئی شخص قیامت کے دن کہے: افسوس ہے مجھ پر ان کوتاہیوں کی بنا پر جو میں نے فرمانِ خدا کی اطاعت میں کی ہیں اور (اس کی آیات کا) میں نے مذاق اور تمسخر اڑایا ہے۔

۵۷۔ اور مبادا وہ کہے کہ اگر خدا میری ہدایت کرتا تو میں پرہیزگاروں میں سے ہوتا۔

۵۸۔ یا جس وقت وہ عذاب کو دیکھے تو کہے کہ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ میں دوبارہ (دنیا کی طرف) پلٹ جاؤں، تاکہ نیکوکاروں میں سے ہوجاؤں؟

۵۹۔ ہاں! میری آیات تیرے پاس آئی تھیں، لیکن تو نے ان کی تکذیب کی اور تکبر کیا اور تو کافروں میں سے تھا۔

تفسیر

اس دن پشیمانی فضول ہے

گزشتہ آیات میں توبہ اور گزشتہ اعمال کی تلافی اور اصلاح کے لیے ایک تاکیدی حکم آیا تھا۔ زیر بحث آیات اس کے بعد

آئی ہیں، پہلے فرمایا گیا ہے: یہ حکم اس لیے دیئے گئے ہیں کہ مبادا کوئی قیامت کے دن کہے کہ افسوس ہے میرے ایمان کوتاہیوں کی وجہ سے جو میں نے فرمانِ خدا کی اطاعت میں کی ہیں اور اس کی آیات اور رسولوں کا میں نے مذاق اڑایا تھا (ان تقول نفس یاحسرتا علی ما فرطت فی جنب اللہ و ان کنت لمن الساخرین)[1]۔

"یاحسرتا" اصل میں "یاحسرتی" تھا (حسرت کی یاء متکلم کی طرف اضافت ہوئی ہے) اور "حسرت" ان چیزوں پر غم کے معنی میں ہے جو ہاتھ سے نکل گئی ہوں اور پشیمانی باقی رہ گئی ہو۔

"راغب" مفردات میں کہتا ہے کہ یہ لفظ "حسر" (بروزن "حبس") کے مادہ سے برہنہ کرنے اور لباس اتارنے کے معنی میں ہے اور چونکہ گزشتہ پر ندامت اور غم کے موقع پر گویا جہالت کے پردے برطرف ہو گئے ہیں، اس لیے یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔

ہاں! جس وقت انسان عرصۂ محشر میں وارد ہوگا اور کوتاہیوں، چشم پوشیوں، غلط کاریوں اور اہم باتوں کو مذاق سمجھنے کے نتائج کو اپنی آنکھ کے سامنے دیکھے گا تو وہ "واحسرتا" کہہ کر فریاد بلند کرے گا۔ ایک بھاری غم گہری ندامت کے ساتھ اس کے دل پر سایہ فگن ہوگا اور وہ اپنی اس اندرونی حالت کو زبان پر جاری کرتے ہوئے مذکورہ جملوں کی صورت میں بیان کرے گا۔

اس بارے میں کہ یہاں "جنب اللہ" کے کیا معنی ہیں؟ مفسرین نے بہت سے احتمال ذکر کیے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ "جنب" لغت میں پہلو کے معنی میں ہے۔ بعدازاں ہر اس چیز پر اس کا اطلاق ہونے لگا جو کسی دوسری چیز کے ساتھ قرار پائی ہے۔ جیسا کہ "یمین" و "یسار" بدن کے دائیں اور بائیں طرف کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد ہر اس چیز کو جو اس طرف قرار پائی ہے "یمین" و "یسار" کہا جانے لگا۔ یہاں بھی "جنب اللہ" ان تمام امور کے معنی میں ہے جو پروردگار کی جانب اور اس کے لیے قرار پاتے ہیں۔ اس کا فرمان، اس کی اطاعت، اس کا قرب اور کتبِ آسمانی جو اس کی طرف سے نازل ہوئیں، یہ سب اس کے معنی میں جمع ہیں۔

اس طرح سے گنہگاران تمام کوتاہیوں پر جو انھوں نے خدا کے بارے میں کی تھیں، ندامت، افسوس اور حسرت کا اظہار کریں گے اور اس کی آیات اور رسولوں کے بارے میں تمسخر و استہزاء انھیں خاص طور پر یاد آئے گا کیونکہ ان کی کوتاہیوں کا اصلی عامل ان عظیم حقائق سے جہالت، غرور اور تعصب کے باعث بے اعتنائی کرنا اور مذاق خیال کرنا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور مبادا وہ یہ کہے کہ اگر خدا مجھے ہدایت کرتا تو میں پرہیزگاروں میں سے ہوتا (او تقول لو ان اللہ ھدانی لکنت من المتقین)۔

یہ بات گویا وہ اس وقت کہے گا جب اسے میزانِ حساب کے پاس لائیں گے۔ وہ ایک گروہ کو دیکھے گا جو نیکیوں سے بھرے دامن کے

---

[1] اس آیت کی ابتدا میں کچھ محذوف ہے جو اسے گزشتہ آیات کے ساتھ جوڑتا ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے "لئلا تقول نفس" یا "حذرا ان تقول نفس..." دوسری صورت میں یہ جملہ "انیبوا واسلموا واتبعوا" کا "مفعول لہ" ہوگا اور "وان کنت لمن الساخرین" میں "ان" مخففہ ہے مثقلہ سے اور اصل میں "انی کنت لمن الساخرین" تھا۔

حسرت وندامت اٹھانا اور غم واندوہ میں ہی غرق رہنا چاہیے۔

باقی رہا تیسری بات کے بارے میں جو دنیا کی طرف بازگشت کا تقاضا ہے تو قرآن کی آیات میں متعدد مواقع پر اس کا جواب دیا جاچکا ہے لہٰذا اب تکرار کی ضرورت نہیں، مثلاً سورہ انعام کی آیہ ۲۸:

ولو ردّوا لعادوا لما نهوا عنه وانهم لكاذبون

اگر وہ لوٹ بھی جائیں تو بھی انھیں گزشتہ اعمال کو دہرائیں گے اور وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

اسی طرح سورہ مومنون کی آیہ.. ابھی اس ضمن میں موجود ہے۔

اس سے قطع نظر جو جواب ان کی دوسری بات کا دیا گیا ہے وہی ان کے پہلے سوال کے جواب کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے، کیونکہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اتمام حجت کے سوا کچھ اور ہے؟ جبکہ خدا ان پر اتمام حجت کرچکا ہے اور اس سلسلے میں کوئی کمی نہیں کی ہے کہ دوبارہ اسے بیان کرے۔ جو بیداری مجرمین میں عذاب دیکھ کر پیدا ہوگی، وہ ایک قسم کی اضطراری بیداری ہوگی، اور واپسی کی صورت میں عام حالت میں اس کے آثار باقی نہیں رہیں گے۔ یہ ٹھیک اسی بات کے مانند ہے جو قرآن مشرکین کے دریا کی موجوں میں گرفتار ہوجانے کے موقع کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ وہ اس وقت تو خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارتے ہیں لیکن جب وہ ساحلِ نجات پر پہنچ جاتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

فاذا ركبوا في الفلك دعوا الله مخلصين له الدين فلما نجّاهم الى البر اذا هم يشركون

(عنکبوت ——— ۶۵)

چند نکات

۱۔ "جنب اللہ" میں کوتاہی: ہم بیان کرچکے ہیں کہ زیرِ بحث آیات میں "جنب اللہ" ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر اُس مطلب پر محیط ہے جو خدا کے ساتھ مربوط ہے اور اس طرح سے اس حصے میں کوتاہی اس کے فرمان کی اطاعت، کتب آسمانی کی پیروی اور انبیاء واولیاء کی اقتداء کے ضمن میں تمام قسم کی کوتاہیوں پر محیط ہے۔

اسی بنا پر متعدد روایات میں آئمہ اہلِ بیتؑ سے منقول ہے کہ "جنب اللہ" سے مراد آئمہ اہل بیتؑ ہیں۔ اس سلسلے میں ایک روایت جو اصولِ کافی میں امام موسیٰ بن جعفرؑ سے "یا حسرتا علی ما فرطت فی جنب اللہ" کی تفسیر کے بارے میں بیان ہوئی ہے، اس میں ہے:۔

جنب الله امير المؤمنين (ع) وكذلك من كان بعده من الاوصياء بالمكان الرفيع الى ان ينتهي الامر الى آخرهم

"جنب اللہ" امیرالمؤمنین اور اسی طرح آپ کے بعد کے اوصیاء ہیں جو بلند مقام رکھتے ہیں یہاں تک کہ یہ سلسلہ ان کے آخری تک جا پہنچے (کہ وہ حضرت مہدی ارواحنافداہ ہیں)۔[1]

علاوہ ازیں تفسیر علی بن ابراہیم میں امام صادقؑ سے بیان ہوا ہے:

نحن جنب الله

جنب اللہ ہم ہیں۔[2]

یہی معنی دوسری روایات میں دوسرے ائمہ سے بھی نقل ہوئے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے بارہا بیان کیا ہے، یہ تفاسیر واضح مصادیق کا بیان ہیں، کیونکہ یہ بات تو مسلم ہے کہ ائمہ کے مکتب کی پیروی پیغمبر اکرمؐ کی پیروی اور خدا کے حکم کی اطاعت ہے، کیونکہ وہ خود اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں کہتے۔

ایک اور حدیث میں قیامت کے دن حسرت و ندامت رکھنے والوں کا واضح مصداق "بے عمل عالموں" کو بتایا گیا ہے۔

کتاب "محاسن" میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

ان اشد الناس حسرة يوم القيامة الذين وصفوا العدل ثم خالفوه، و هو قول الله عز وجل ان تقول نفس يا حسرتا على ما فرطت في جنب الله

قیامت کے دن سب لوگوں سے زیادہ افسوس کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو حق و عدالت کے راستے کی لوگوں کے سامنے تعریف و توصیف کرتے تھے، اور پھر خود ہی اس کی مخالفت پر تیار ہو جاتے تھے اور یہ وہی چیز ہے جسے خداوند تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے۔ ان تقول نفس یا حسرتا علی ما فرطت فی جنب اللہ[3]

۲۔ **موت کے آستانے پر یا قیامت**: کیا یہ تینوں باتیں جو مجرمین عذابِ الٰہی کو دیکھ کر کریں گے ان کی عمر کے آخر میں عذاب استیصال کے ساتھ مربوط ہیں؟ یا عرصۂ قیامت میں ورود کے وقت سے مربوط ہیں؟

اس سلسلے میں دوسرا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے کی آیات عذاب استیصال کے ساتھ مربوط ہیں اور اس کے بعد والی قیامت کے ساتھ مربوط ہے۔ اس بات کی شاہد سورۂ انعام کی آیہ ۲۱ ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے:۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۵

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۵

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۶

قد خسر الذین کذبوا بلقاء اللہ حتّٰی اذا جاءتھم الساعۃ بغتۃ قالوا یاحسرتنا علٰی ما فرطنا فیھا

وہ لوگ جنھوں نے لقائے پروردگار کا انکار کر دیا تھا وہ نقصان اور خسارے میں گرفتار ہو گئے، ان کی حالت اسی طرح سے جاری رہے گی، یہاں تک کہ اچانک قیامت آجائے گی۔ اس وقت وہ کہیں گے "ہائے افسوس ہم نے اس بارے میں کوتاہی کی تھی۔

مذکورہ بالا روایات بھی اس معنی پر ایک گواہ ہیں۔

۶۰۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ○

۶۱۔ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

۶۲۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۫ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ○

۶۳۔ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ ع

۶۴۔ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ○

ترجمہ

۶۰۔ اور جنھوں نے خدا پر جھوٹ باندھا تھا، قیامت کے دن تو دیکھے گا کہ ان کے منہ کالے ہیں، کیا جہنم میں متکبرین کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟

۶۱۔ اور خدا ان لوگوں کو جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا تھا کامیابی کے ساتھ نجات دے گا۔ انھیں کوئی بھی برائی لاحق نہ ہوگی اور نہ وہ ہرگز غمگین ہوں گے۔

۶۲۔ خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز کا محافظ اور نگران ہے۔

۶۳۔ آسمان اور زمین کی چابیاں اسی کی ملکیت ہیں اور جن لوگوں نے خدا کی آیات کا انکار کیا وہی تو خسارے میں ہیں۔

۶۴۔ کہہ دے: اے جاہلو! کیا تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کا حکم دیتے ہو؟

تفسیر

ہر چیز کا خالق و محافظ خدا ہے

گزشتہ آیات میں ان متکبر اور جھوٹے مشرکین کے بارے میں گفتگو تھی جو قیامت کے دن اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے اور اس جہان کی طرف واپسی کا تقاضا کریں گے۔ ایسا تقاضا جو لاحاصل اور ناقابلِ قبول ہے۔ اب زیرِ بحث آیات میں اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جنھوں نے خدا پر جھوٹ باندھا تھا، قیامت کے دن تو دیکھے گا کہ ان کے منہ کالے ہیں (و یوم القیامۃ تری الذین کذبوا علی اللہ وجوھھم مسودۃ)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کیا جہنم میں متکبرین کے لیے کوئی جگہ نہیں؟ (الیس فی جھنم مثوی للمتکبرین)۔

اگرچہ "کذبوا علی اللہ" (خدا پر انھوں نے جھوٹ باندھا) کا مفہوم وسیع اور کشادہ ہے، لیکن زیرِ بحث آیت میں خدا کی طرف شرک کی نسبت دینے اور خدا کے لیے فرشتوں میں سے یا حضرت عیسیٰؑ یا کسی اور کے فرزند ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح لفظ "متکبر" اگرچہ ان تمام لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں لیکن یہاں زیادہ تر وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے انبیاء کی دعوت کے مقابلے میں دینِ حق سے استکبار کیا اور ان کی دعوت قبول کرنے سے روگردانی کی۔

قیامت میں جھوٹ بولنے والوں کی روسیاہی، ان کی ذلت و خواری اور رسوائی کی نشانی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عرصۂ قیامت انسان کے پوشیدہ اسرار ظاہر ہونے اور ان کے اعمال و افکار مجسّم ہونے کا میدان ہے۔ جو لوگ اس دنیا میں سیاہ اور تاریک دل رکھتے تھے، اور ان کے اعمال ان کے افکار کی طرح تیرہ و تار تھے، وہاں ان کی یہ اندرونی حالت باہر آجائے گی اور ان کے چہرے تاریک و سیاہ ہو جائیں گے۔

دوسرے لفظوں میں قیامت میں ظاہر و باطن ایک ہو جائے گا اور چہرے دلوں کا رنگ اختیار کر لیں گے، جن کے دل تاریک و سیاہ ہوں گے ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے اور جن کے دل نورانی ہیں ان کے چہرے بھی ایسے ہی ہوں گے۔

جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۰۶، ۱۰۷ میں آیا ہے:

یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ فاما الذین اسودت وجوھھم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون ○ واما الذین ابیضت وجوھھم ففی رحمۃ اللہ ھم فیھا خالدون ○

اس دن کچھ چہرے سفید اور کچھ چہرے سیاہ ہو جائیں گے، جن کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے ان سے کہا جائے گا: کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے، اب تم اپنے کفر کی وجہ سے عذاب چکھو! اور جن کے چہرے سفید اور نورانی ہوں گے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا کی رحمت میں رہیں گے۔

معتبر احادیث جو ان سے نقل ہوئی ہیں وہ سب کی سب پیغمبر اکرمؐ کی طرف بازگشت کرتی ہیں، اور یہ ایسا نکتہ ہے جو تمام علماء اسلام کے لیے قابلِ غور ہے۔ اس بنا پر ان لوگوں کو بھی جو ان کی امامت قبول نہیں کرتے کم از کم ان کی احادیث کو احادیثِ رسولؐ کے عنوان سے تو قبول کرنا چاہیے۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث امام صادقؑ سے کافی میں نقل ہوئی ہے اس میں بیان ہوا ہے:

ہم میں سے ہر ایک امام کی حدیث دوسرے امام کی حدیث ہے اور ہماری حدیث رسول اللہ کی حدیث ہے۔

(کافی جلد اول باب روایت الکتب والحدیث حدیث ۱۴)

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ آیاتِ قرآنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ کفر کا اصلی سرچشمہ کبر و غرور ہی ہے۔ جیسا کہ شیطان کے بارے میں آیا ہے:

ابٰی واستکبر وکان من الکافرین

اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ (بقرہ ـــــ ۳۴)

اسی بنا پر متکبرین کی جگہ جہنم کی جلا ڈالنے والی آگ کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتی۔

یہاں تک کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

ان فی جھنم لواد للمتکبرین یقال لہ سقر، شکی الی اللہ عز وجل شدۃ حرہ، وسئلہ ان یتنفس فاذن لہ فتنفس فاحرق جھنم

جہنم میں ایک علاقہ ایسا ہے جو متکبرین کے لیے مخصوص ہے اسے سقر کہا جاتا ہے، ایک دفعہ اس نے اپنی حرارت کی شدت کی خدا سے شکایت کی اور یہ تقاضا کیا کہ وہ ایک سانس لے لے، اسے اجازت دے دی گئی تو اس نے ایک ایسا سانس لیا جس نے جہنم کو جلا کر رکھ دیا۔[1]

بعد والی آیت میں اس گروہ کے مدمقابل یعنی پرہیزگاروں کے اور قیامت میں ان کی سعادت کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے، فرمایا گیا ہے: خدا ان لوگوں کو جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا نجات دے گا اور انھیں کامیاب کرے گا (وینجی اللہ الذین اتقوا بمفازتھم)۔[2]

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم۔ نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۶ کے مطابق یہی معنی تفسیر صافی میں بھی زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے۔

[2] "مفازۃ" مصدر میمی ہے اور فلاح اور کامیابی کے معنی میں ہے اور "بمفازتھم" میں "با" یا ملابست کے لیے ہے یا بیبیت کے لیے پہلی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا۔

خدا انھیں کامیابی کے ساتھ نجات دے گا۔

دوسری صورت میں آیت کا معنی یہ ہے:

خدا انھیں ان کی کامیابی کی وجہ سے (ایمان اور عمل صالح کی طرف کنایہ ہے) نجات اور رہائی بخشے گا۔

اس کے بعد اس فلاح و کامیابی کی ان دو مختصر اور پر معنی جملوں کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے: کوئی برائی ان تک نہ پہنچے گی اور کوئی غم انھیں نہیں ہوگا (لا یمسھم السوء و لا ھم یحزنون)۔

وہ ایسے عالم میں زندگی بسر کریں گے جہاں سوائے نیکی و پاکیزگی اور وجد و سرور کے کوئی چیز نہ ہوگی۔ حقیقت میں اس مختصر سی تعبیر نے خدا کی تمام نعمتوں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔

بعد والی آیت ایک بار پھر مسئلہ توحید کی جانب اور شرک کے خلاف مقابلے کی طرف لوٹتی ہے اور مشرکین کے ساتھ جو گفتگو ہو رہی تھی، اسی کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ فرمایا گیا ہے: خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی تمام چیزوں کا محافظ اور ان پر ناظر و نگران ہے (اللہ خالق کل شیء و ھو علی کل شیء وکیل)۔

پہلا جملہ "توحید خالقیت" کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا جملہ "توحید ربوبیت" کی طرف اشارہ ہے۔

توحید خالقیت کا مسئلہ تو ایسی چیز ہے کہ مشرکین تک بھی عام طور پر اس کے معترف تھے۔ جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۳۸ میں بیان ہوا ہے۔

اگر تو مشرکین سے پوچھے کہ آسمان و زمین کس نے پیدا کیے تو وہ کہیں گے: اللہ نے۔

لیکن انھوں نے توحید ربوبیت میں انحراف کیا تھا، وہ اپنے کاموں کا محافظ، نگہبان اور مدبر بتوں کو ہی سمجھتے تھے اور مشکلات میں انھی سے پناہ لیتے تھے۔ قرآن درحقیقت مذکورہ بیان کے ذریعے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ امور عالم کی تدبیر اور اس کی حفاظت و نگہداری اسی ہستی کے ہاتھ میں ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ اس بنا پر ہر حالت میں اسی کی پناہ لینی چاہیے۔

ابن منظور نے لسان العرب میں "وکیل" کے متعدد معانی بیان کیے ہیں، مثلاً "کفیل" "حافظ" اور "وہ ہستی جو کسی چیز کے امور کی تدبیر کرے"۔

اس طرح سے ثابت ہو جاتا ہے کہ بت نہ تو کوئی فائدہ ہی پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نقصان، نہ تو وہ کوئی گرہ کھول سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی گرہ لگا سکتے ہیں، ایک ایسا ضعیف و کمزور وجود ہیں کہ جن سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

مکتب جبر کے بعض پیروکار "اللہ خالق کل شیء" سے اپنے انحرافی عقیدہ پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال بھی آیت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اس بنا پر ان کا خالق بھی خدا ہی ہے اگرچہ ان کے ظہور کا مقام ہمارے بدن کے اعضاء ہیں۔

ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اس مطلب کو نہ سمجھ سکے کہ خدا کی خالقیت، ہمارے افعال کے بارے میں ہمارے اختیار اور ارادے کی آزادی سے کوئی تضاد نہیں رکھتی، کیونکہ یہ دونوں نسبتیں طول میں ہیں عرض میں نہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ ہمارے اعمال خدا کی طرف بھی نسبت رکھتے ہیں اور ہماری طرف بھی۔ ایک طرف تو عالم ہستی کی کوئی چیز بھی خدا کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے اور اس لحاظ سے ہمارے اعمال بھی اسی کی مخلوق ہیں، لیکن اسی نے چونکہ ہمیں قدرت، طاقت، عقل و فہم، ارادہ و اختیار، آلاتِ کار اور آزادیٔ عمل عطا کی ہے تو اس لحاظ سے ہمارے عمل کو اس کی طرف نسبت دی جا سکتی ہے۔

اس کی مشیت یہ ہے کہ ہم آزاد رہیں اور اعمالِ اختیاری بجالائیں اور اس نے تمام وسائل ہمارے اختیار میں دے دیئے ہیں۔
لیکن اس کے باوجود ہم اپنے عمل میں آزاد و مختار ہیں اور اس لحاظ سے ہمارے افعال ہماری طرف منسوب ہیں اور ہم ان کے بارے میں مسئول اور ذمہ دار ہیں۔
اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم ہی اپنے اعمال کے خالق ہیں اور خدا کا ان میں کوئی دخل نہیں ہے تو وہ مشرک ہے کیونکہ وہ دو خالقوں کا معتقد ہوگیا، بڑا خالق اور چھوٹا خالق، اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہمارے افعال کا خالق خدا ہے اور ہمارا اس میں کوئی دخل نہیں ہے تو وہ منحرف ہے، کیونکہ اس نے خدا کی حکمت و عدالت کا انکار کیا ہے کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اعمال تو اس کے ہوں اور ان کے بارے میں جواب دہ ہم ہوں؟ اس صورت میں سزا و جزا، حساب و معاد اور ذمہ داری و مسئولیت کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔
اس بنا پر صحیح اسلامی عقیدہ جو قرآن کی آیات کو یکجا جمع کرنے سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے یہ ہے کہ ہمارے تمام اعمال اس کی طرف بھی نسبت رکھتے ہیں اور ہماری طرف بھی نسبت رکھتے ہیں اور یہ دونوں نسبتیں آپس میں کسی قسم کی کوئی تضاد نہیں رکھتیں کیونکہ یہ دو طولی نسبتیں ہیں نہ کہ عرضی و متوازی (غور کیجئے گا)۔

بعد والی آیت خدا کی توحید مالکیت کے ذکر کے ساتھ گزشتہ آیت کی توحیدی بحث کی تکمیل کرتی ہے اور کہتی ہے: آسمانوں اور زمین کی چابیاں اسی کے لیے ہیں (لہ مقالید السماوات والارض)۔
"مقالید" اکثر اربابِ لغت کے قول کے مطابق "مقلید" کی جمع ہے (اگرچہ زمخشری نے یہ کہا ہے کہ ہر کلمہ اپنی جنس سے کوئی مفرد نہیں رکھتا) اور "مقلید" و "اقلید" دونوں چابی کے معنی میں ہیں اور لسان العرب اور بعض دوسروں کے مطابق اس کی اصل فارسی کے لفظ "کلید" سے لی گئی ہے اور عربی میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر (مقالید السماوات والارض) کا معنی آسمانوں اور زمین کی چابیاں ہی ہے[1]
یہ تعبیر عام طور پر کسی چیز کی مالکیت اور اس پر تسلط کے لیے کنایہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں: اس کام کی چابی فلاں کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا زیرِ بحث آیت خدا کی توحیدِ مالکیت کی طرف بھی اشارہ ہوسکتی ہے اور عالمِ ہستی پر اس کی توحید تدبیر و ربوبیت و حاکمیت کی طرف بھی۔
اسی بنا پر قرآن اس جملے کے بعد بلا فاصلہ اس طرح نتیجہ نکالتا ہے، جنھوں نے آیاتِ خدا سے کفر کیا ہے وہ زیاں کار ہیں (والذین کفروا بآیات اللہ اولئک ھم الخاسرون)۔
کیونکہ انھوں نے تمام خیرات و برکات کے منبع اصلی اور سرچشمہ حقیقی کو چھوڑ دیا ہے اور بے راہ رو ہو کر سرگرداں ہوگئے ہیں، جس ذات کے ہاتھ میں آسمان و زمین کی تمام چابیاں ہیں اس سے روگردانی کر کے ناتواں موجودات کے پیچھے لگ گئے ہیں، جن سے مطلق طور پر

---

[1] بعض فارسی لغت نویسوں کے قول کے مطابق "کلید" کا معرب "اقلید" و "اکلیل" ہے اور "مقلاد" وہ آلہ ہے جس کے ساتھ قفل کھولا اور بند کیا جاتا ہے (حاشیہ برہان قاطع)۔

کوئی بھی کام نہیں ہوسکتا۔

ایک حدیث میں امیرالمؤمنین علیؑ سے منقول ہوا ہے کہ میں نے رسولِ خداؐ سے "مقالید" کی تفسیر پوچھی، تو آپؐ نے فرمایا:

یا علی لقد سئلت عن عظیم المقالید، ھو ان تقول عشرًا اذا اصبحت، وعشرًا اذا امسیت، لا الٰہ الّا اللہ واللہ اکبر وسبحان اللہ والحمد للہ واستغفر واللہ ولا قوۃ الا باللہ (ھو) الاول والاٰخر والظاھر والباطن لہ الملک ولہ الحمد (یحیی ویمیت) بیدہ الخیر وھو علی کل شیء قدیر

تو نے عظیم چابیوں کے بارے میں سوال کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تو ہر صبح اور ہر شام ان جملوں کی تکرار کرے

لا الٰہ الّا اللہ واللہ اکبر وسبحان اللہ والحمد للہ .....

آخر حدیث تک۔

پھر آپؐ نے مزید فرمایا:

جو شخص ہر صبح و شام دس مرتبہ ان کلمات کی تکرار کرے گا، خدا اسے چھ اجر عطا کرے گا، جن میں سے ایک یہ ہے کہ خدا اسے شیطان اور اس کے لشکر سے محفوظ رکھے گا تاکہ اس کا اس پر تسلط نہ ہو[1]

یہ بات کہے بغیر ہی واضح ہے کہ ان کلمات کا کہنا زبان کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں ان سب اجور کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ ان کے مطالب و معانی پر ایمان اور ان پر عمل بھی ضروری ہے۔

یہ حدیث ممکن ہے خدا کے اسمائے حسنیٰ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہو، جو عالمِ ہستی پر اس کی مالکیت و حاکمیت کا مبدء ہیں۔ (غور کیجیے گا)

توحید کی شاخوں کے بارے میں گزشتہ آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اس سے مجموعی طور پر بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے، کہ "توحید در عبادت" ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ یہاں تک کہ ایک فہمیدہ اور عقل مند انسان اپنے آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ بتوں کے سامنے سجدہ کرے۔ اس لیے اس کے بعد ایک قاطع اور سخت لب و لہجے میں فرمایا گیا ہے۔ کہہ دے: اے جاہلو! کیا تم مجھے یہ حکم دیتے ہو کہ میں غیر خدا کی عبادت کروں (قل افغیر اللہ تأمرونّی اعبد ایھا الجاھلون)۔

یہ گفتگو خاص طور پر اس بات کی طرف توجہ کرنے سے ایک بہت عمیق مفہوم پیدا کرتی ہے کہ کفار و مشرکین بعض اوقات پیغمبر اسلامؐ کو یہ دعوت دیتے تھے کہ آپؐ ان کے خداؤں کا احترام اور پرستش کریں یا کم از کم بتوں کی عیب جوئی اور ان پر تنقید کرنے سے پرہیز کریں۔ گویا یہ آیت صراحت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ مسئلہ توحید اور نفیِ شرک کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس پر کوئی معاملہ، سودے بازی یا سمجھوتہ کیا جاسکے، شرک تو چاہے جس صورت میں بھی ہو اسے نابود کر دینا چاہیے اور اسے صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہیے۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸، ص ۱۹، ۵ اور تفسیر ابوالفتوح الرازی جلد ۹ ص ۳۱۷ زیر بحث آیات کے ذیل میں (تلخیص کے ساتھ)۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بت پرست عام طور پر جاہل ہوتے ہیں نہ صرف یہ کہ وہ پروردگار کے بارے میں جاہل ہیں بلکہ انھوں نے تو خود اپنی انسانیت کے بلند و بالا مقام کو بھی نہیں پہچانا اور اسے پامال کر دیا ہے۔

اس آیت میں امر اور حکم کی تعبیر بھی معنی خیز ہے۔ یہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ وہ کسی دلیل و منطق کے بغیر ایک آمرانہ لہجے میں پیغمبر اسلامؐ کو بت پرستی کی دعوت دیتے تھے۔ اس قسم کی باتیں جاہل و نادان افراد سے کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

کیا یہ جہالت و نادانی کی بات نہیں ہے کہ انسان عالم ہستی میں خدا کی ان تمام آیات اور نشانیوں کو چھوڑ دے جو اس کے علم و حکمت اور قدرت و تدبیر پر گواہ ہیں اور بے قدر و قیمت چیزوں سے چمٹ جائے جو نہ تو کوئی اثر رکھتی ہیں اور نہ ہی کسی خاصیت کی حامل ہیں۔

۶۵۔ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○

۶۶۔ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ○

۶۷۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○

ترجمہ

۶۵۔ تمام گزشتہ انبیاء کی طرف بھی اور تیری طرف بھی یہی وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو تیرے سارے اعمال نابود ہوجائیں گے اور تو زیان کاروں میں سے ہوجائے گا۔

۶۶۔ بلکہ صرف خدا ہی کی عبادت کر اور شکر گزاروں میں سے ہو جا۔

۶۷۔ انھوں نے خدا کو اس کے شایانِ شان طریقے سے نہیں پہچانا حالانکہ قیامت کے دن ساری زمین اسی کے قبضہ قدرت میں ہوگی اور آسمان اس کے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہونگے، اس کی ذات ان کے شرک سے منزہ اور پاک اور بلند و بالا ہے۔

تفسیر

تو مشرک ہو جائے تو سب اعمال برباد!

ان آیات میں اسی طرح شرک و توحید سے مربوط مسائل ہی بیان ہو رہے ہیں جن کے متعلق گزشتہ آیات میں بھی گفتگو تھی۔

پہلی آیت میں شرک کے نقصان کو دو ٹوک انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تجھ سے پہلے کے تمام انبیاء کی طرف بھی اور تیری طرف بھی یہی وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو یقیناً تیرے تمام اعمال حبط و نابود ہوجائیں گے اور تو زیان کاروں میں سے ہوجائے گا۔ (ولقد اوحی الیك والی الذین من قبلك لئن اشركت لیحبطن عملك ولتكونن

معنی سلب قدرت و اختیار نہیں ہے بلکہ ان کی سطح معرفت کا بلند ہونا اور مبدء وحی کے ساتھ دوامی اور مستقیم ارتباط، اس بات سے مانع ہے کہ وہ ایک لمحہ بھر کے لیے بھی شرک کا تصور کریں۔ کیا کوئی عقل مند اور حاذق طبیب، جو انتہائی خطرناک و مہلک اور زہریلے مادے کی تاثیر سے بخوبی آگاہ ہو، اس سے یہ بات ممکن ہے کہ وہ اپنی فکر و عقل کے اعتدال کی صورت میں خود کو اس سے آلودہ کرے؟

مقصد یہ ہے کہ شرک کے خطرے کی اہمیت سب کے گوش گزار ہو جائے تاکہ لوگ جان لیں کہ جب خدا اپنے بزرگ پیغمبروں کے ساتھ اس طرح سے گفتگو کر رہا ہے تو دوسروں کا معاملہ تو واضح ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ عربوں کی اس مشہور ضرب المثل کی طرح ہے:

ایاک اعنی واسمعی یا جارۃ

مراد تو میری تو ہے اور اے پڑوسن تو بھی سنتی رہنا۔

یہی معنی ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے بھی منقول ہیں، جب کہ مامون نے آپ سے چند آیات کے بارے میں سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا:

اس قسم کی آیات سے مراد امت ہے اگرچہ مخاطب رسولؐ خدا ہیں[1]

بعد والی آیت میں مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: بلکہ صرف خدا ہی کی عبادت کر اور شکر گزاروں میں سے ہو جا (بل اللہ فاعبد وکن من الشاکرین)۔[2]

لفظ "اللہ" کو "حصر" کے لیے مقدم رکھا گیا ہے، یعنی صرف اللہ کی ذات پاک ہی کو منحصر طور پر تیرا معبود ہونا چاہیے اور اس کے بعد شکر گزاری کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ ان نعمتوں کا شکر ادا کرنا جن میں انسان غرق ہے، اللہ کی معرفت اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے لیے ہمیشہ ایک سیڑھی کا کام دیتا ہے۔ نعمت کے جواب میں شکر کرنا ہر انسان کے لیے فطری امر ہے اور شکر گزاری کے لیے ہر چیز سے پہلے منعم کی ہستی کی معرفت لازم ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں شکر کا راستہ توحید کے راستے سے جا ملتا ہے اور وہ بت جو کسی نعمت کا مبدء نہیں ہیں الگ ہو جاتے ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں نفی شرک کے لیے ایک اور بات کی گئی ہے اور ان کے انحراف کی اصلی جڑ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "انھوں نے خدا کو اس کے شایانِ شان طریقے سے نہیں پہچانا" اور اسی بنا پر اس کے مقدس نام کو اتنا نیچے لے آئے ہیں کہ اسے بتوں کے ہم پلہ بنا دیا (وما قدروا اللہ حق قدرہ)۔

ہاں! شرک کا سرچشمہ خدا کے بارے میں صحیح معرفت نہ ہونا ہے، جو شخص یہ جانتا ہو کہ:

اولاً وہ ہر لحاظ سے بے پایاں اور غیر محدود وجود ہے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۷

[2] "فاعبد" میں "فا" ممکن ہے زائدہ ہو جو اس قسم کے موقعوں پر تاکید کے لیے آتی ہے بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ شرط محذوف کی جزا ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا "ان کنت عابداً فاعبد اللہ" پھر شرط حذف ہو گئی اور مفعول اس کی جگہ پر مقدم ہو گیا۔

ثانیاً تمام موجودات کی خلقت و پیدائش اسی کی طرف سے ہے، یہاں تک کہ اپنی بقا کے لیے بھی اسی کے فیض وجود کے محتاج ہیں۔

ثالثاً عالم ہستی کی تدبیر اور تمام مشکلات کا حل اور تمام ارزاق اسی کے دستِ قدرت میں ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کی شفاعت بھی ہوگی تو اسی کے اذن و فرمان سے ہوگی تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان اس کے علاوہ کسی اور کی طرف رُخ کرے۔

اصلاً ان صفات کے ساتھ کسی وجود کے لیے دوگانگی محال ہے، کیونکہ تمام جہات سے دو غیر محدود وجودوں کا ہونا محال ہے اور عقلاً ممکن نہیں ہے۔ (غور کیجیے گا)

اس کے بعد اس کی عظمت و قدرت کے بیان کے لیے دو عمدہ کنایوں سے استفادہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: قیامت کے دن تمام زمین اسی کے قبضے میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے (والارض جمیعًا قبضته یوم القیامة والسماوات مطویات بیمینه)۔

"قبضہ" اس چیز کے معنی میں ہے جو مٹھی میں لی جاتی ہے اور عام طور پر یہ کسی چیز پہ قدرتِ مطلقہ اور تسلطِ کامل کے لیے کنایہ ہے۔ جیسا کہ روزمرہ کے جملوں میں ہم کہتے ہیں کہ فلاں شہر میرے قبضہ میں ہے یا فلاں ملک میرے قبضہ اور مٹھی میں ہے۔

"مطویات" "طی" کے مادہ سے "لپیٹنے" کے معنی میں ہے جو کبھی عمر کے گزرنے یا کسی چیز سے عبور کرنے کے لیے کنایہ ہوتا ہے۔

سورۂ انبیاء کی آیہ ۱۰۴ میں آسمانوں کے بارے میں یہی تعبیر زیادہ واضح صورت میں بیان ہوئی ہے۔

یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب

اس دن ہم آسمانوں کو طوماروں کی طرح لپیٹ دیں گے۔

جو شخص طومار کو لپیٹ کر دائیں ہاتھ میں لیے ہوئے ہو وہ اس پر کامل ترین تسلط رکھتا ہے خصوصاً "یمین" (دایاں ہاتھ) اس بنا پر کہا گیا ہے کیونکہ اکثر لوگ اہم کام دائیں ہاتھ سے ہی انجام دیتے ہیں اور اس میں زیادہ قوت کا احساس کرتے ہیں۔

مختصر بات یہ ہے کہ یہ سب تشبیہات اور تعبیرات دوسرے جہان میں عالم ہستی پر پروردگار کے مطلق تسلط کے لیے کنایہ ہیں، تاکہ سب لوگ جان لیں کہ عالم قیامت میں کلید نجات اور حل مشکلات خدا کے دستِ قدرت میں ہے تاکہ شفاعت وغیرہ کے بہانے سے بتوں اور دوسرے معبودوں کی طرف نہ جائیں۔

کیا اس دنیا میں زمین و آسمان اسی صورت میں اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر قرآن آخرت کی بات کیوں کر رہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس دن خدا کی قدرت ہر زمانے کی نسبت زیادہ آشکار ہوگی اور اصلی ظہور کے مرحلے میں پہنچی ہوئی ہوگی اور سب کے سب واضح و آشکار طور پر جان لیں گے کہ ہر چیز اسی کی ہے اور اسی کے اختیار اور قبضے میں ہے۔

علاوہ ازیں ممکن ہے بعض لوگ نجات کے بہانے سے قیامت میں غیر خدا کے پاس چلے جائیں، جیسا کہ عیسائی مسیحؑ کی پرستش کے لیے نجات کا مسئلہ اٹھاتے ہیں۔ اس بنا پر مناسب یہی ہے کہ قیامت میں خدا کی قدرت کے بارے میں گفتگو کی جائے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ساری تعبیریں کنایہ کا پہلو رکھتی ہیں اور ہمارے الفاظ کی کوتاہ دامنی کی وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ روزمرہ کی زندگی میں ان بلند معانی کو انھیں معمولی الفاظ کے قالب میں ڈھالیں اور اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص ان سے پروردگار کے تجسم کا احتمال سمجھے سوائے اس کے کہ جو بہت ہی سادہ لوح کوتاہ بین اور کوتاہ فکر ہو، تو اس صورت میں کیا کیا جا سکتا ہے؟ وہ الفاظ جو پروردگار کی عظمت کا مقام بیان کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں ہمارے پاس نہیں ہیں لہٰذا ہمیں انھیں الفاظ کے کنائی معانی سے استفادہ کرتے ہوئے۔ جو وسیع اور کشادہ دامن رکھتے ہیں۔ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

بہرحال ان بیانات کے بعد آیت کے آخر میں ایک مختصر اور واضح نتیجہ اخذ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: اس کی ذات ان کے شرک سے منزہ اور پاک ہے اور بلند و بالا ہے (سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون)۔

اگر انسان اپنے افکار کے چھوٹے سے پیمانوں کے ساتھ اس کی پاک ذات کے بارے میں فیصلہ نہ کرتا تو ہرگز شرک و بت پرستی نہ کرتا۔

چند نکات

۱۔ مسئلہ حبط اعمال: کیا واقعاً یہ بات ممکن ہے کہ انسان کے نیک اور اچھے اعمال اس کے برے اعمال کی بنا پر حبط و نابود ہو جائیں؟ کیا یہ مسئلہ ایک طرف تو خدا کی عدالت کے اور ان آیات کے ظاہری مفہوم کے منافی نہیں ہے جو یہ کہتی ہیں کہ انسان اگر ذرہ برابر اچھا یا برا کام انجام دے تو اسے دیکھے گا

یہاں بحث کا دامن بہت وسیع ہے۔ دلائل عقلی کے لحاظ سے بھی اور دلائل نقلی کے لحاظ سے بھی۔ جس کا ایک حصہ جلد دوم میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی دیگر متعلقہ آیات کے ذیل میں پیش کریں گے۔

وہ بات جس کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے اور جو زیر بحث آیات میں در پیش ہے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے گناہوں کے مقابلے میں "حبط اعمال" میں شک کرے تو کم از کم وہ شرک کی حبط اعمال میں تاثیر کے متعلق شک نہیں کرے گا، کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات جن میں سے بعض کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ایمان کے ساتھ دنیا سے جانا اعمال کی قبولیت کی شرط ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں ہوگا۔

مشرک کا دل ایک شورہ زار کے مانند ہے کہ اگر تمام پھولوں کے بیج اس میں چھڑک دیے جائیں اور حیات بخش بارش اس کے اوپر برستی رہے تو اس میں ایک پھول بھی اگانے کی استعداد نہ ہوگی اور خس و خاشاک کے سوا اس سے کوئی بھی چیز نہ اُگے گی۔

۲۔ کیا مؤمنوں نے خدا کو پہچان لیا ہے؟: ان آیات میں بیان ہوا ہے کہ مشرکین نے خدا کو اس کے شایان شان طریقہ سے نہیں پہچانا کیونکہ اگر وہ پہچان لیتے تو پھر شرک کی راہ پر نہ چلتے، اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ مومنین موحد نے اسے حقیقی طور پر پہچان لیا ہے۔

تو اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ بات پیغمبر اکرمؐ کی اس مشہور حدیث کے ساتھ کیسے ہم آہنگ ہے، جس میں آپؐ فرماتے ہیں:

ما عرفناك حق معرفتك، وما عبدناك حق عبادتك

ہم نے تجھے ایسا نہیں پہچانا جیسا کہ تیری معرفت کا حق ہے، اور ہم نے تیری ایسے عبادت نہیں کی جیسے کہ تیری عبادت کا حق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت کے کئی مرحلے اور درجے ہوتے ہیں ان میں سے ایک مرحلہ ایسا ہے جو معرفت سے بالاتر ہے اور وہ خدا کی ذات کی کنہ اور حقیقت کو معلوم کرنا ہے اور یہ بات کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے اور اس کی ذات پاک کے سوا کوئی بھی اس کی ذات پاک کی کنہ اور حقیقت سے باخبر نہیں ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کی مذکورہ مشہور حدیث اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن کچھ مراحل ایسے ہیں جو اس سے بہت نیچے ہیں جو انسانوں کی استعداد میں ہیں اور وہ اس کی صفات کی اجمالی شناخت اور اس کے افعال کی تفصیلی شناخت کا مرحلہ ہے اور یہ مرحلہ انسان کے لیے ممکن ہے اور اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا حکم اسی مرحلہ سے متعلق ہے۔ زیر بحث آیت بھی اسی مرحلے کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جس میں مشرکین عاجز رہ جاتے ہیں۔

۶۸۔ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَمَن فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَن شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنظُرُونَ ○

ترجمہ

۶۸۔ اور صور پھونکا جائے گا تو وہ سب کے سب مرجائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سوائے ان کے جنھیں خدا چاہے گا، پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو وہ سب کے سب اچانک (زندہ ہوکر) اٹھ کھڑے ہوں گے اور (حساب وجزا کے) انتظار میں ہوں گے۔

تفسیر

صُور پھونکا جانا اور سب کی موت وحیات

گزشتہ آیتوں میں قیامت کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیت میں اسی مسئلے کو بہت سی خصوصیات کے ساتھ بیان کیا جارہا ہے۔ پہلے دنیا کے اختتام کی بات کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور صور پھونکا جائے گا تو وہ سب کے سب مرجائیں گے۔ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے ان کے جنھیں خدا چاہے گا (و نفخ فی الصور فصعق من فی السماوات ومن فی الارض الا من شاء اللہ)۔

پھر صور پھونکا جائے گا تو اچانک سب کے سب اٹھ کھڑے ہوں گے اور وہ اپنے حساب وجزا اور انجام کے انتظار میں ہوں گے (ثم نفخ فیہ اخری فاذا ھم قیام ینظرون)۔

اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی انتہا اور قیامت کے آغاز میں دو حادثے ناگہانی اور اچانک رونما ہوں گے۔ پہلے حادثے میں سب زندہ موجودات فوراً مرجائیں گے اور دوسرے حادثے میں جو کچھ وقفے کے بعد صورت پذیر ہوگا، تمام انسان اچانک زندہ ہوکر کھڑے ہوجائیں گے اور حساب وکتاب کا انتظار کریں گے۔

قرآن مجید ان دونوں حادثوں کو "نفخ صور" سے تعبیر کرتا ہے جو ناگہانی اور اچانک حوادث کے بارے میں ایک خوبصورت اور زیبا کنایہ ہے۔ کیونکہ "نفخ" کا معنی ہے "پھونکنا" اور "صور" کا معنی ہے "بگل" یا اندر سے خالی سینگ جو عام طور پر قافلے یا لشکر کو چلانے یا ٹھہرانے کے لیے بجاتے ہیں۔ البتہ ان دونوں کی آوازوں میں آپس میں فرق ہوتا ہے۔ ٹھہرنے کا بگل قافلے کو ایک جگہ ٹھہرا دیتا ہے

ان آیات سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے آخر میں ایک عظیم صیحہ آسمانوں اور زمین پر تمام رہنے والوں کو مار دے گی اور اس کو "موت کی چیخ" کہتے ہیں۔

قیامت کے آغاز میں ایک عظیم صیحہ اور چیخ کے ساتھ سب کے سب زندہ ہو جائیں گے اور قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور یہ حیات کی صیحہ اور چیخ ہو گی۔

لیکن یہ دونوں آوازیں دقیقاً کس طرح کی ہوں گی؟ پہلی چیخ کا کیا اثر ہو گا اور دوسری چیخ میں کیا تاثیر ہے؟ یہ بات خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا لہٰذا بعض روایات میں صور کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے کہ جو اسرافیل پھونکے گا۔ مثلاً

وللصور رأس واحد و طرفان، و بين طرف رأس كل منهما الى الأخر مثل ما بين السماء الى الارض

اسرافیل کے بگل کا ایک سر اور دو شاخیں ہوں گی، اور ان دونوں شاخوں کے درمیان آسمان اور زمین کے درمیان جتنا فاصلہ ہو گا۔

پھر اسی روایت کے ذیل میں ہے:

جس وقت وہ اس میں زمین کی طرف پھونکے گا تو زمین میں کوئی زندہ موجود باقی نہ رہے گا اور جس وقت وہ اس میں آسمان کی طرف والے حصے میں پھونکے گا تو سارے کے سارے آسمان والے مر جائیں گے پھر خدا اسرافیل کے لیے موت کا حکم دے گا اور کہے گا کہ مر جا تو وہ بھی مر جائے گا۔[1]

بہرحال اکثر مفسرین نے "نفخ صور" کے معنی "بگل میں پھونکنے" کے ہی کیے ہیں۔ جس کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے بارے میں لطیف کنایہ ہے لیکن کچھ مفسرین نے "صور" کو "صورت" کی جمع سمجھا ہے اور اس بنا پر اس نفخ صور کو صورت میں پھونکنے کے معنی میں جانا ہے، جیسے روح کو بدن میں پھونکتے ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق ایک مرتبہ انسانی صورتوں میں پھونکا جائے گا تو سب کے سب مر جائیں گے اور ایک مرتبہ اور پھونکا جائے گا تو سب کے سب زندہ ہو جائیں گے۔[2]

یہ تفسیر علاوہ اس کے کہ متون روایات سے ہم آہنگ نہیں ہے خود آیت کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ "ثم نفخ فيه اخرى" میں ضمیر مفرد مذکر اس کی طرف لوٹتی ہے، حالانکہ اگر جمع کے معنی میں ہوتا تو پھر اس کی طرف مفرد مؤنث کی ضمیر لوٹتی اور "نفخ فيها" کہا جاتا۔

اس سے قطع نظر صورت میں پھونکنا مُردوں کو زندہ کرنے کے موقع پر تو مناسب ہے (جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات میں آیا ہے) لیکن یہ تعبیر قبض روح کے لیے استعمال نہیں ہوتی۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۰۲ کے مطابق

[2] توجہ کیجیے کہ "صور" بروزن "نور" و "صور" بروزن "زحل" دونوں "صورت" کی جمع ہیں۔

چند نکات

۱۔ صور کتنی مرتبہ پھونکا جائے گا؟ کیا نفخ صور دو مرتبہ ہوگا یا اس سے زیادہ؟ علماء اسلام کے درمیان مشہور دو ہی مرتبہ ہے۔ زیر بحث آیت کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے۔ دوسری آیات قرآن بھی مجموعی طور پر دو "نفخوں" کی ہی خبر دیتی ہیں لیکن بعض نے اس کی تعداد تین نفخہ یا چار نفخہ تک بھی سمجھی ہے۔

اس طرح سے نفخۂ اولیٰ کو نفخہ "فزع" بھی کہتے ہیں۔

یہ تعبیر سورۂ نمل کی آیہ ۸۷ سے لی گئی ہے۔

و یوم ینفخ فی الصور ففزع من فی السماوات و من فی الارض

جس وقت صور پھونکا جائے گا اس وقت آسمانوں میں رہنے والے اور زمین میں بسنے والے سب دہشت زدہ ہو جائیں گے۔

وہ دوسرے اور تیسرے نفخہ کو "موت و حیات" کا نفخہ سمجھتے ہیں۔ جس کی طرف زیر بحث آیات اور قرآن کی دوسری آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ ایک کو نفخہ "صعق" کہتے ہیں۔ ("صعق" بے ہوش ہونے کے معنی میں آیا ہے اور مرنے کے معنی میں بھی) اور دوسرے کو نفخہ "قیام" کہتے ہیں۔

جنھوں نے چوتھے نفخہ کا احتمال ذکر کیا ہے، ظاہراً انھوں نے سورۂ یٰس کی آیہ ۵۲ سے یہ مفہوم اخذ کیا ہے، جہاں نفخۂ حیات کے بعد کے بارے میں ہے۔

ان کانت الا صیحۃ واحدۃ فاذا ھم جمیع لدینا محضرون

صرف ایک چیخ ہوگی اور اس کے بعد وہ سب کے سب ہمارے پاس حاضر ہو جائیں گے۔

ان کے نزدیک یہ نفخہ "جمع و حضور" ہے۔

لیکن حق بات یہی ہے کہ دو نفخوں سے زیادہ نہیں ہوں گے اور فزع اور عمومی وحشت کا مسئلہ حقیقت میں سارے جہان والوں کے مرنے کے لیے ایک مقدمہ ہے جو پہلے نفخہ یا پہلے صیحہ سے حاصل ہوگا۔ جیسا کہ نفخۂ جمع اسی نفخۂ حیات کا انجام ہے۔ اس طرح سے دو سے زیادہ نفخہ نہیں ہوں گے۔ "نفخہ موت" اور "نفخہ حیات"۔

اس گفتگو کا دوسرا شاہد سورۂ نازعات کی آیہ ۶، ۷ ہیں جہاں قرآن کہتا ہے۔

یوم ترجف الراجفۃ تتبعھا الرادفۃ

جس دن ہولناک زلزلہ ہر جگہ کو لرزا کے رکھ دے گا تو اس کے بعد بھی وہ زلزلہ آجائے گا جو بندوں کو زندہ اور اکٹھا کر کے رکھ دے گا۔

۲۔ صورِ اسرافیل کیا ہے؟ اس کی صوتی امواج ساری دنیا کو کس طرح گھیر لیں گی؟ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صوتی امواج

سُست رفتار ہوتی ہیں اور ایک سیکنڈ میں دو سو چالیس میٹر سے آگے نہیں جاتیں جبکہ روشنی کی رفتار اس سے ۱۰ لاکھ گنا سے بھی زیادہ ہے اور ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر تک پہنچ جاتی ہے ۔

ہمیں کہنا پڑے گا کہ ہم اس موضوع کے بارے میں قیامت کے بہت سے دوسرے مسائل کی طرح صرف اجمالی علم رکھتے ہیں، اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کی جزئیات ہمارے لیے واضح نہیں ہیں ۔

اسلامی کتب میں صور کے بارے میں آنے والی روایات میں غور کرنے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بعض کے خیالات کے برخلاف "صور" ایک معمولی قسم کا بگل نہیں ہوگا ۔

ایک روایت میں امام علی بن حسینؑ سے منقول ہے :

ان الصور قرن عظیم له رأس واحد و طرفان، و بین الطرف الاسفل الذی یلی الارض الی الطرف الاعلی الذی یلی السماء مثل تخوم الارضین الی فوق السماء السابعة، فیه اثقاب بعدد ارواح الخلائق

"صور" ایک بہت بڑا سینگ ہے جس کا ایک سر اور دو اطراف ہیں، اور اس کی نچلی سمت جو زمین کی طرف ہے اور اوپر والی سمت جو آسمان کی طرف ہے کا درمیانی فاصلہ زمین کے نچلے حصے سے لے کر ساتویں آسمان کے اوپر تک ہے اور اس میں مخلوقات کی ارواح کی تعداد کے برابر سوراخ ہیں [1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے :

الصور قرن من نور فیه اثقاب علی عدد ارواح العباد

صور ایک نورانی سینگ ہے جس میں بندوں کی ارواح کی تعداد کے برابر سوراخ ہیں [2]

یہاں نور کا ذکر مذکورہ دوسرے سوال کا بھی جواب دیتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ یہ عظیم صیحہ ہماری عام صوتی امواج کی طرح کی نہیں ہے، یہ ایک ایسی چیخ ہے جو بہت برتر و بالاتر ہے اور نور کی امواج سے بھی بہت زیادہ سریع تر امواج رکھتی ہے جو زمین و آسمان کی وسعت کو تھوڑی سی دیر میں طے کرلے گی پہلی مرتبہ کی چیخ موت آفرین ہوگی اور دوسری زندہ کرنے والی اور حیات بخش ۔

یہ مسئلہ کہ ایک آواز اس طرح سے موت آفریں کیسے ہو سکتی ہے اگر گزشتہ زمانے میں کسی کے لیے باعث تعجب تھی تو اب ہمارے لیے اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کیونکہ ہم نے اکثر سنا ہے کہ بموں کے پھٹنے کی آوازیں کانوں کو بہرہ، جسم کو ریزہ ریزہ اور گھروں تک کو تباہ کر دیتی ہیں اور انسانوں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دور دراز مقام پر پھینک دیتی ہیں ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ہوائی جہاز کی تیز رفتاری ۔ دیوار صوتی کو توڑنے کے لیے ایسی وحشت ناک آواز اور تباہ کن لہریں پیدا کرتی ہے کہ عمارتوں کے شیشوں کو ایک وسیع شعاع سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے ۔

---

[1] لئالی الاخبار، ص ۴۵۲

[2] علم الیقین ص ۹۲۰

سبا

قارون، عاد و ثمود کے ساتھ ذکر ہوا ۳۹۴

عاد

حضرت ہودؑ کے خلاف قیام کیا ہولناک آندھی سے تباہ ہوئی۔ ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۹۳

فرعون و قارون کی قوم

قوم فرعون نے حضرت موسیٰ کے خلاف قیام کیا غرق نیل ہوئی۔ ۱۹۹، ۲۰۰، ۳۹۴

لوطؑ کی قوم

ہم نے لوطؑ کے خاندان کو نجات دی سوائے ایک بڑھیا کے۔ قوم کو برباد کر دیا۔ ۱۳۷ تا ۱۳۹

قوم نے حضرت لوطؑ کے خلاف قیام کیا۔ پتھروں کی بارش سے ہلاک ہوئی ۱۹۹ تا ۲۰۰

موسیٰ و ہارون کی قوم

ہم نے بنی اسرائیل کو جابر اور خونخوار فرعونیوں سے نجات دی۔ ۱۲۷، ۱۲۸

نوحؑ کی قوم

قوم نوحؑ نے سرکشی کی، غرق طوفان ہوئی۔ ۸۶ تا ۹۰

نوح علیہ السلام کی تکذیب کی طوفان اور تباہ کن بارش سے نابود ہوئی ۱۹۹، ۲۰۰

یونسؑ کی قوم

قوم یونس عذاب الٰہی کو دیکھتے ہی بیدار ہو گئی۔ عذاب سے محفوظ رہی۔ ۱۴۱

شخصیات

آدم علیہ السلام

مجھے فرشتوں کے بارے میں علم نہیں۔ جب وہ آدم علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ۲۷۲

ابراہیم علیہ السلام

ابراہیم، نوح کے پیروکاروں میں سے تھا۔ ۹۲

وہ قلب سلیم کے ساتھ اپنے رب کی بارگاہ میں ستاروں کی طرف دیکھتا اور اپنے آپ کو بیمار بتاتا۔ ۹۷ تا ۱۰۰

جناب ابراہیمؑ اور قلب سلیم ۱۰۱، ۱۰۲

ابراہیم کا مشرکین سے مکالمہ، ہلاکت کا منصوبہ، سلامتی، اور اولاد کی دعا۔ ۱۰۳ تا ۱۰۶

ہجرت ابراہیمؑ ۱۰۷ تا ۱۰۸

ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ کو یاد کرو۔ ۲۵۳

بیٹے کی بشارت، بیٹے سے خواب کا ذکر۔ بیٹے کی آمادگی، پیشانی کے بل لٹانا، آواز دی تم نے خواب سچ کر دکھایا۔ عظیم بدلہ قرار دیا۔ ۱۰۹ تا ۱۱۶

کیا ابراہیمؑ فرزند کو قربان کرنے پر مامور تھے۔ ۱۱۸

حضرت ابراہیمؑ کا خواب کس طرح حجت ہوسکتا ہے، روح ابراہیم پر شیطانی وسوسے اثر انداز نہ ہوئے۔ ۱۱۹

جمرہ اولیٰ و ثانی و عقبہ پر شیطان کو سات سات پتھر مارنا۔ ۱۲۰

(ابراہیمؑ) با ایمان بندوں میں سے، ہم نے اسحٰقؑ کی بشارت دی اور دونوں کو برکت دی۔ ۱۲۳

ابلیس علیہ اللعن

ابراہیمؑ کو ورغلایا، حضرت ہاجرہؑ کو بہکایا ناکام ہوا۔ اسماعیلؑ کو بہکایا، صبر و رضا کا پیکر پایا۔ ۱۱۹، ۱۲۰

ابلیس نے سجدہ نہ کیا ۲۷۶

ابلیس کی ہزار سال کی عبادت کو گھڑی بھر کے تکبر کے برباد کر دیا (امیر المومنینؑ) ۲۷۹

ابلیس نفخۂ اول و دوئم کے درمیان مر جائے گا (امام صادقؑ) ۲۸۲

ابلیس کے لیے خدا نے جو کچھ انجام دیا اس سے عبرت حاصل کرو۔ (امیر المومنینؑ) ۲۸۰

ابو سعید خدری

جنگِ صفین میں مسلمانوں کے درمیان نزاع پر ابو سعید کا یقین (حدیث) ۳۵۸

ابو طالبؑ بن عبد المطلبؑ

ابوجہل اور قریش سردار رسولِ پاک کی شکایت آپ کے پاس لائے۔ (شانِ نزول سورۂ ص) ۱۸۳

خدا کی قسم میں ہرگز تمہاری نصرت سے دست بردار نہیں ہوگا۔ ۱۹۰

ابو ہریرہ

بہت سے مفسرین نے احادیث (ابو ہریرہ سے) تصدیقِ رسول کا پہلا شرف علیؑ کے لیے بیان کیا۔ ۳۶۳

اسحٰق علیہ السلام (نبی)

ہم نے اسحٰقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی۔ ۱۱۶

کچھ لوگ حضرت اسحٰقؑ کو ذبیح جانتے ہیں۔ ۱۱۶

(ابراہیمؑ، اسحٰقؑ و یعقوبؑ کو یاد کرو۔ ۲۵۳

اسماءؓ

جب اصحابِ پیغمبرؐ کے سامنے قرآن

کی تلاوت ہوئی، آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، لرزہ براندام ہو جاتے ۳۴۵
راوی کے جواب میں فرمایا کہ یہ تو ایک شیطانی عمل ہے۔ ۳۴۹

اسماعیل علیہ السلام (نبی)

اسماعیل ذبیح تھے۔
شیطان نے بہکایا صبر و رضا کا پیکر پایا۔ ۱۲۰
اسماعیل، الیسع، ذالکفل کو یاد کرو۔ یہ نیک لوگوں میں سے تھے۔ ۲۵۳

الیاس علیہ السلام (نبی)

بے شک الیاسؑ ہمارے رسولوں میں سے تھے۔ ۱۳۰ تا ۱۳۲
جناب الیاس کون تھے۔ تفصیل ۱۳۴، ۱۳۵

الیسعؑ

اسماعیل، الیسع اور ذالکفل کو یاد کرو یہ نیک لوگ تھے۔ ۲۵۳

ایوب علیہ السلام

یاد کرو جب ایوبؑ نے پکارا کہ مجھے شیطان نے اذیت دی ہے ۲۴۴ تا ۲۴۷
داستان ایوبؑ کے اہم درس ۲۴۸
ایوبؑ قرآن و توریت میں۔ ۲۵۰

جعفر بن محمد امام صادقؑ

جمعہ کو صافات تلاوت کرنے والے ہر بلا سے محفوظ ہیں۔ ۲۸
جو نیت صادق رکھتا ہے وہ صاحب قلب سلیم ہے۔ ۹۵
توریہ جھوٹ نہیں ہے ۱۰۰
اسماعیلؑ ذبیح ہیں ۱۱۷
جب تم ان آیات قرآن کی تلاوت کرتے ہو تو گویا لوطؑ کی تباہ بستی کے قریب سے گزرتے ہو۔ ۱۳۹
قرعہ سے بڑھ کر عادلانہ فیصلہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔ ۱۵۱، ۱۵۲
حضرت داؤدؑ کے قصہ میں آپ کے ارشادات۔ ۲۱۸
ایوبؑ کفران نعمت سے نہیں شکر نعمت سے گرفتار بلا ہوئے۔ ۲۴۴، ۲۴۵
پیغمبران خدا سب سے زیادہ سخت امتحانات سے گزرتے ہیں ایک مقام، جنت میں ایسا ہے کہ انسان وہاں سخت ترین ابتلا سے گزر کر پہنچتا ہے۔ ۲۴۹
خدا نے مکتب اہل بیت کے پیروکاروں کو یاد کیا ہے۔ ۲۶۹
ابلیس نفخہ اول و دوم کے درمیان مر جائے گا۔ ۲۸۲
متکلف کی تین نشانیاں ہیں ۲۸۸، ۲۸۹

عالم و طالب علم پر آپؐ کی حدیث سخت حوادث (میں گرفتار صاحب) افراد کے لیے میزان نصب ہوگا۔ (حدیث رسولؐ) ۳۲۵

جس نے ستم گر حکومت کی اطاعت کی اس نے اس کی عبادت کی۔ ۳۳۱

حدیث سُننے اور بلا کمی بیشی دوسروں تک پہنچانے والوں کے لیے یہ آیات ہیں۔ ۳۳۶

موسیٰ! مال کی زیادتی، گناہ فراموشی اور میری یاد کو ترک کرنا دلوں کو سخت کر دیتا ہے۔ ۴۴۳

جو امام نہ ہو خود کو امام سمجھے، حدیث ہمارے حوالے سے بیان کرے جو ہماری نہ ہو۔ یہ خدا پر واضح جھوٹ ہے۔ ۴۱۲

ہمارے ہر امام کی حدیث ہماری ہے، اور ہماری حدیث، حدیث رسولؐ پاک ہے۔ ۴۱۳

جب قائم قیام کریں گے زمین پروردگار کے نور سے روشن ہو جائے گی۔ ۴۲۳

حسین بن علیؑ شہید کربلا

آپ نے دعا "عرفہ" میں اپنی خلقت و آفرینش کا ذکر فرمایا ہے۔ ۲۵۴

داؤد علیہ السلام

پہاڑ اور پرندے مسخر کر دیے جو صبح و شام اس کے لیے تسبیح کرتے تھے۔ ۲۰۴ تا ۲۰۸

حکومت کو استحکام بخشا، علم و عدالت شجاعت، عبادت، حکمت اہم صفات عطا کیں۔ ۲۰۸، ۲۰۹

داؤدؑ کو پیش آمدہ واقعہ کی حقیقت ۲۱۴

اسلامی روایات اور قصہ داؤد ۲۱۸ تا ۲۲۰

داؤد! تمھیں زمین پر خلیفہ بنایا پس برحق فیصلہ کرو۔ ۲۲۲ تا ۲۲۷

قصہ داؤد میں مفسرین کی توجیہات ۲۳۰ تا ۲۳۱

ہم نے داؤد کو سلیمان جیسا بیٹا عطا کیا۔ ۲۲۹

ذوالکفل علیہ السلام

اسمٰعیل، الیسع اور ذوالکفل کو یاد کرو یہ نیک لوگ تھے۔ ۲۵۳

سلیمان علیہ السلام

ہم نے داؤدؑ کو نیک اور خدا رسیدہ بیٹا سلیمان عطا کیا ۲۲۹

سلیمانؑ کا سخت امتحان اور وسیع حکومت۔ ۲۰۷ تا ۲۱۲

داستان سلیمان سے حاصل ہونے والا درس۔ ۲۳۵ تا ۲۴۰

حضرت سلیمان قرآن اور توریت میں۔ ۲۴۲

شیاطین

شیاطین فرشتوں کی باتیں نہیں سُن پاتے، کوشش کرتے ہیں، تو شہاب ثاقب کی زد میں آتے ہیں۔ ۳۸

شیطان دشمن خدا مستکبرین کا پیشوا ہے جس نے تکبر و خود خواہی کی بنیاد رکھی۔ (جناب امیرؑ) ۲۸۴، ۲۸۵

عبد اللہ ابن عباسؓ

الیاسین سے مراد آلِ یٰسین ہیں و آلِ محمدؐ ہیں۔ ۱۳۶

زدوجہ ایوبؑ کے واقعہ کی تفصیلات ۲۴۷، ۲۴۸

عبد اللہ بن عبد المطلب

رسولِ پاک کے والد کا کچھ ذکر۔

عبد اللہ ابنِ مسعود

ایمان کے لیے سینہ کی کشادگی (حدیثِ رسولِ پاک) کے راوی ۳۴۱

علی ابن ابی طالبؑ (امیر المومنین)

گروہ صفت بستہ ہمیشہ تسبیح کرتے ہیں۔ ۳۵

وہ جس نے اسمٰعیلؑ کے لیے فدیہ قرار دیا۔ ۱۱۷

حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں نو گھنٹے رہے۔ ۱۶۹، ۱۵۰۰

خدا نے عقلوں کو اپنی صفات اور حیثیت سے آگاہ کیا اور نہ ہی معرفت و شناخت سے باز رکھا۔ ۱۵۸

بلند اوہام اور اندیشوں کے ہاتھ اس کے دامن کبریائی تک نہیں پہنچ سکتے ۱۵۹

ہر مجلس کے اختتام پر کہو سُبحان ربک رب العزت عما یصفون۔ ۱۰۶

حضرت داؤدؑ کے قصہ میں آپ کے ارشادات۔ ۲۱۸

تمہیں ہوا و ہوس اور لمبی آرزوئیں گمراہ کر دیں گی۔ ۲۲۴، ۲۲۵

جب سختیاں بلندی پر پہنچ جائیں تو فرج و کشائش نزدیک ہو جاتی ہے ۲۴۹

پرہیز گاروں کی رُوح مصیبت میں بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ جیسی راحت و آرام میں۔ ۲۵۰

ابلیس کی ہزارہا سال کی عبادت کو گھڑی بھر کے تکبر نے برباد کر دیا ۲۶۹

ابلیس کے لیے خدا نے جو انجام دیا اس سے عبرت حاصل کرو۔ ۲۸۰

شیطن دشمن خدا مستکبرین کا پیشوا ہے، جس نے تکبر و خود خواہی کی بنیاد رکھی۔ ۲۸۴

جو پاؤں کے آٹھ جوڑوں کو نازل کیا سے مُراد اُن کی خلقت ہے۔ ۳۱۰
کمیلؓ کو قاریٔ اَمَّنْ هو قانت اناء اللیل کے جنتی ہونے کی خبر دی۔ جنگِ نہروان میں اس مقتول کو اشارہ سے بتایا۔ ۳۲۰، ۳۲۱
حکمت آمیز باتیں مؤمن کی گم شدہ چیز ہے۔ منافق کے پاس سے بھی حاصل کرے۔ ۳۳۶
آنسو خشک نہیں ہوتے مگر دلوں کے سخت ہو جانے سے اور دل گناہوں کی زیادتی سے سخت ہو جاتے ہیں۔ ۳۴۲
"القا" دو قسم کے ہیں۔ القاءِ شیطانی اور فرشتے کا القا۔ ۳۴۴
رات کو صفت لہجہ تلاوت کرتے، رُوح مستغرق ہو جاتی۔ ۳۴۹
میں وہ مرد ہوں جو رسولِ پاک کے لیے سرِ تسلیم خم تھا۔ ۳۵۶
مسلمان حالت جنابت میں نہ سوئے سونے سے قبل وضو یا تیمم کرے۔ نیند کے وقت رُوح عالم بالا کی طرف جاتی ہے۔ ۳۸۵
میں نے ارادوں کے ٹوٹنے اور مشکلات کی گرہیں کھلنے سے خدا کو پہچانا۔ ۳۹۵
قرآن میں "لا تقنطوا من رحمت اللہ" سے بڑھ کر کوئی وسیع آیت نہیں۔ ۳۹۷
مقالید سے متعلق رسُول پاک کی طویل حدیث۔ ۴۱۶
جہاد، بہشت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ۔ ۴۳۸

علی ابن الحسین

کوئی موجود اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں ہو سکتا۔ ۱۵۹، ۱۶۰
صُور ایک بہت بڑا سینگ ہے، جس کے دو اطراف ہیں۔ ۴۲۸
وقوع قیامت کے بارے میں گریہ فرماتے۔ لوگوں کے محاسبے کے بارے میں پریشان ہوتے۔ ۴۳۰
جس کے دل میں ذرہ بھر تکبّر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ۴۳۸

علی ابن مُوسیٰ رضاؑ

حشر میں ولایت علی کا سوال ہوگا۔ ۵۳
اگر کوئی جانور دنبے سے بہتر ہوتا تو اللہ اُسے اسماعیل کا فدیہ قرار دیتا۔ ۱۱۷
حضرت داؤد کے قصے میں آپؑ کے ارشادات۔ ۲۱۸ تا ۲۲۰
ایسی آیات سے مراد اُمت ہے اگرچہ مخاطب رسولِ خدا ہیں۔ ۴۲۰

کیا تجھ تک شکایت کرنے والوں کی داستان پہنچی ہے۔	۲۱۱
میں تمہارے بارے میں ہوا و ہوس اور طول امل سے ڈرتا ہوں۔	۲۲۴، ۲۲۵
خیر اور بھلائی قیامت تک کے لیے گھوڑے کی پیشانی سے باندھ دی گئی ہے۔	۲۳۱
اللہ نے سلیمانؑ کو عظیم حکومت دی۔ لیکن خشوع و خضوع اتنا کہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھتے	۲۴۱
میں تو ایک ڈرانے والا ہوں۔	۲۷۰ تا ۲۷۴
فرشتے کفارات و درجات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔	۲۷۳
میں تم سے اجر طلب نہیں کرتا، متکلفین میں سے نہیں ہوں۔	۲۸۷
متکلف کی تین نشانیاں۔ (حدیث)	۳۸۸
خدا قبول نہیں کرتا سوائے اس چیز جو اس کے لیے خالص ہو۔	۳۹۷
صرف دو زندگیاں مفید ہیں۔ عالم جس کی تعلیم جاری ہے۔ طالب علم جو عالم کی بات کی توجہ سے سنے	۳۱۹
مجھے حکم ہے کہ اس کی عبادت کروں اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھوں۔	۳۲۲، ۳۲۶
کیا تو اُسے نجات دے سکتا ہے جو آگ کے اندر ہے؟	۳۳۳
ایمان کا رکشادہ دل، ہمیشہ کے گھر پر متوجہ، غرور کے گھر سے علیحدگی، پر انحصار۔	۳۴۱
تو بھی مر جائے گا اور وہ سب بھی مر جائیں گے۔	۳۵۷
جو کچھ تمہارے بس میں ہے کر گزرو جلد معلوم ہو جائے گا آخرت کا عذاب کس کے لیے ہے۔	۳۷۴
تو ان کو ہدایت پر مجبور کرنے کے لیے مامور نہیں ہے۔	۳۷۸
کہہ دو، اللہ زمین و آسمان کا خالق پنہاں و آشکار کا عالم، اختلاف رکھنے والوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔	۳۳۸
جو شخص توبہ کرلے۔ ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔	۴۰۱
جہنم میں ایک علاقہ متکبرین کے لیے ہے جسے "سقر" کہتے ہیں۔	۴۱۳
اللہ تمام بندوں کا حساب کرے گا مگر مشرک بے حساب جہنم میں داخل ہونگے	۴۱۹
طُور ایک نورانی سینک ہے جس میں بندوں کی روحوں کی تعداد کے برابر سوراخ ہیں۔	۴۲۸

محمد بن علیؑ باقر علیہ السلام

حق، نبوت، کتاب آسمانی اور ایمان نوح کی اولاد میں باقی رکھا۔	۹۱
ذبیح اللہ اسماعیل ہیں۔	۱۱۷

ایک جواب میں فرمایا سبحان ربك رب العزت عما یصفون۔ ۱۷۶

شب جمعہ سورۂ ص کی تلاوت پر ایسی برکت دی جائے گی جو رسولوں اور فرشتوں کو بھی نہیں دی گئی۔ ۱۸۲

سورہ ص کی شان نزول پر کلینیؒ نے آپ کی حدیث بیان کی ہے۔ ۱۸۳

ہوائے نفس، بخل اور انسان کا اپنے آپ سے خوش ہونا ہلاکت کا باعث ہیں۔ ۲۲۵

امن ھو قانت آناء اللیل سے مراد نماز شب ہے۔ ۲۱۷

جو شخص سو جاتا ہے اس کا نفس آسمان کی طرف سعود کر جاتا ہے: ۲۸۴

توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ ۴۰۱

قیامت کے دن افسوس کرنے والے، حق و عدالت کی توصیف کرنے والے، پھر انکار کرنے والے ہوں گے ۴۰۸

موسیٰ بن جعفر کاظمؑ

علی بن یقطین سے، حضرت سلیمان کے واقعات پر آپ کے ارشادات ۲۲۷، ۲۲۸

خدا نے اہل عقل و فہم کو بشارت دی باتوں کو غور سے سنتے اور اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔ ۳۲۶

جنب اللہ کی تشریح پر آپ کی حدیث ۴۰۷

موسیٰ بن عمران (نبی)

موسیٰ و ہارون پر احسان کیا، انہیں اور ان کی قوم کو نجات بخشی، مدد کی، کتاب دی، ہدایت کی، ذکر کو باقی رکھا، ان پر سلام ہو۔ ہم یوں ہی جزا دیتے ہیں۔ وہ مؤمن بندے تھے۔ ۱۲۶، ۱۲۹

اے موسیٰ دنیا میں اپنی آرزوؤں کو طول نہ دے، دل الطاف ناپذیر ہو جائے گا۔ ۳۴۳

نوحؑ (نبی)

نوح نے پکارا۔ دعا قبول کی اُسے اور اس کے اہل و عیال کو نجات دی نوح پر سلام ہو ۸۶ تا ۹۰

حضرت نوحؑ کی دعائیں۔ ۸۷

وحشی

حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی کا مسلمان ہونا۔ ۳۹۹

ھاجرہؑ

تمہیں معلوم ہے ابراہیمؑ نے کیا ارادہ کیا ہے (شیطان) ۱۱۹

اگر خدا کا حکم ہے تو اے اسمٰعیلؑ کو! اطاعت کرنی چاہیئے۔ ۱۲۰

ہارون علیہ السلام

موسیٰ و ہارون پر احسان کیا۔ (دیکھیے حضرت موسیٰؑ) — ۱۲۶ تا ۱۲۹

یعقوبؑ

ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور اس کے بعد یعقوب کے پیدا ہونے کی بشارت — ۱۱۶

ہمارے بندوں ابراہیم و اسحٰق و یعقوب کو یاد کرو۔ ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے۔ — ۲۵۳

یونسؑ

یونس ہمارے رسولوں میں سے تھا۔ بوجھل کشتی میں سوار ہوا۔ دریا میں پھینکنا، مچھلی نے نگل لیا۔ رہائی بخشی وہ بیمار تھا۔ — ۱۴۰ تا ۱۴۸

علماء و دانشور

آلوسی مفسر ۴۲، ۵۷، ۳۵۴
ابن حجر ہیثمی ۵۷
ابن منظور (صاحب لسان العرب) ۴۱۴
ابوالفتوح رازی ۳۶۳
ابوالقاسم حسکانی ۵۳، ۳۵۶
ابونعیم اصفہانی ۳۱، ۵۷
راغب (مفردات) ۵۱، ۵۸، ۶۶، ۷۸
زمخشری ۳۳۴، ۴۱۵، ۴۳۲
سبط ابن جوزی ۵۷
صدر المتالہین شیرازی ۱۹۴
صدوق (شیخ) ۳۶، ۲۱۸، ۴۱۲
طباطبائی علامہ ۳۳
طبرسی (مفسر) ۴۲، ۱۴۵، ۳۶۳
الرزاق حنبلی ۵۷
قطب (سید) ۴۲
کلینی (شیخ) ۱۸۳
مجلسی (علامہ) ۲۲۲، ۴۳۲، ۴۳۳
مرتضےٰ (سید) ۲۳۲
مفید (شیخ) ۴۳۳

کتبِ آسمانی

تورٰۃ

تورات میں حضرت اسحٰق کو ذبیح اللہ قرار دیا ہے۔ — ۱۱۸

ہم نے موسیٰ کو کتاب "مستبین" یعنی واضح و روشن کتاب دی یوناہ (توریت) — ۱۲۸

حضرت یونس کے حالات۔ (یوناہ بن متی) — ۱۴۹

	۱۴۷، ۱۵۲، ۲۸۳
تفسیر روح البیان	۷۸، ۱۲۵، ۱۴۶، ۲۷۷، ۴۳۲۔
تفسیر المعانی	۴۲، ۴۵، ۴۶، ۵۷، ۶۸، ۷۵، ۷۸، ۱۱۴، ۱۲۵، ۲۲۰، ۲۹۸، ۳۱۰، ۳۴۸، ۳۵۲، ۳۹۹، ۴۳۰۔
تفسیر صافی	۹۱، ۹۵، ۲۴۵، ۳۸۴، ۲۹۷، ۴۳۰، ۴۳۳۔
تفسیر علی بن ابراہیم	۹۱، ۱۸۹، ۲۴۵، ۴۱۳، ۴۲۷۔
تفسیر فخر الدین رازی	۷۵، ۱۳۵، ۱۴۴، ۱۷۵، ۲۴۰، ۲۴۵، ۲۵۵، ۳۰۱، ۴۰۳، ۴۰۳۔
تفسیر فی ظلال	۴۲، ۳۵، ۲۵
تفسیر قرطبی	۱۱۴، ۱۵۰، ۱۶۴، ۲۴۵، ۲۵۷، ۳۴۶، ۳۴۸، ۳۶۳، ۳۷۹، ۴۲۶، ۴۴۱۔
تفسیر کشاف	۲۳۴، ۳۴۶، ۳۴۸، ۴۲۲۔
تفسیر نور الثقلین	۹۱، ۱۱۷، ۱۲۱، ۱۳۹، ۱۴۶، ۱۵۰، ۱۸۴، ۱۸۹، ۲۱۹، ۲۲۵، ۲۳۸، ۲۴۵، ۲۶۹، ۲۸۹، ۳۲۶، ۳۸۷، ۴۰۲، ۴۰۸، ۴۱۳، ۴۲۰، ۴۳۰، ۴۳۳۔
تنزیہ الانبیاء	۲۳۲
جوامع الجامع	۲۸۸
دائرۃ المعارف	۱۳۵
روضہ کافی	۳۸۸
سفینۃ البحار	۲۴۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۴۰۲۔
شواہد التنزیل	۵۳، ۲۵۶
صحیفۂ سجادیہ	۱۵۸
صواعق محرقہ	۵۳، ۵۷
علم الیقین	۴۲۸
عیون الاخبار	۵۳، ۲۱۸
کتاب المجالس	۴۰۸
کشف الغمہ	۵۷
لسان العرب	۷۹، ۲۴۸، ۴۱۴، ۴۱۵۔
لئالی الاخبار	۴۲۸
مجمع البحرین	۷۸
معانی الاخبار	۱۳۶
مفردات	۵۱، ۵۹، ۶۶، ۷۸، ۸۸، ۱۱۰، ۱۳۲، ۱۸۶، ۲۱۰، ۲۲۵، ۳۰۱، ۳۲۷، ۳۴۸، ۳۶۶، ۳۶۷، ۴۰۵۔
مناقب ابن مغازلی	۲۶۳
وسائل الشیعہ	۱۰۰، ۲۴۶
وسائل کتاب القضاء	۱۵۲
نہج البلاغہ	۳۴، ۱۳۹، ۱۵۸، ۱۵۹، ۲۲۵، ۲۴۹، ۲۹۷

نہج البلاغہ ۲۸۰، ۲۸۵، ۶۳، ۲۹۵ ۴۳۸۔

لُغات قرآن

آ

آناء۔ انا کی جمع ساعت وقت کی کچھ مقدار۔ ۲۱۷

ا

ابق۔ مادہ "اباق" غلام کا آقا کے پاس سے بھاگ جانا۔ ۱۴۲

احشروا: مادہ "حشر" میدان میں لانا ۵۱

اختلاق۔ مادہ "خلق" سابق کے بغیر ابداع واظہار۔ ۱۹۳

ارکض۔ مادہ "رکض" زمین پر پاؤں مارنا ۲۴۶

استفتھم۔ مادہ "استفتار" نئی خبروں کا مطالبہ ۴۵

اصفاد۔ صفد کی جمع وسیلۂ قید و بند، ہتھکڑیاں بیڑیاں۔ ۲۴۰

اغوا۔ مادہ "غی" جہالت ۵۸

افک۔ بڑا جھوٹ قبیح ترین جھوٹ ۹۶

الثقمہ۔ مادہ "التقام" نگل جانا ۱۴۳

آناب۔ سلامتی کے ساتھ پلٹنا ۲۲۵

انزال۔ مادہ "نزل" مہمان کی پذیرائی کے لیے پہلی چیز ۳۰۹

انطلق۔ مادہ انطلاق "تیزی سے باہر نکلنا۔ ۱۹۱

اوّاب۔ مادہ "اوب" اپنے اختیار سے کسی چیز کی طرف لوٹنا۔ ۲۰۶

اید۔ ہاتھ مراد قدرت، نعمت ۲۰۶

ایکہ۔ درخت ۲۰۱

ب

بارکنا۔ برکہ، برکت اور اس کی تفصیل۔ ۱۲۴، ۱۲۵

ت

تالیفات۔ مادہ "تلاوت" تالی کی جمع تلاوت کرنے والے۔ ۳۳

تختصمون۔ مادہ "اختصام" دو گروہوں کے درمیان نزاع وجدال ۳۵۷

تردین۔ مادہ "ارداء" بلندی سے گرنا ۷۲

تسوروا۔ مادہ "سور"۔ احاطہ مکان یا شہر۔ ۲۱۱

تشطط۔ مادہ "شطط" زیادہ دوری مراد ظلم۔ ۲۱۲

تلہ۔ مادہ "تل" اونچی جگہ۔ ۱۱۳

توفّٰی۔ قبض کرنا پورے طور پر پکڑنا ۳۸۰

ث

ثاقب، نفوذ یا سوراخ کرنے والا ۴۱

ج

جحیم۔ مادہ "جحم" (بروزن فہم) آگ بھڑکانا ۵۱

جیاد۔ جواد کی جمع تیز رفتار گھوڑے ۲۳۰

ح

حلیم۔ توانائی کے باوجود کسی کام میں

جلدی نہ کرنا، احساسات پر قابو رکھنا ۱۱۰
حمیم۔ کھولتا ہوا جلا ڈالنے والا پانی۔ ۸۱

خ

خرّ۔ مادہ "خریر" پانی کا آواز کے ساتھ بلندی سے گرنا، آبشار۔ ۲۱۳
خزنۃ۔ مادہ "خزن" خازن کی جمع نگہبان، محافظ ۴۳۶
خزی۔ ذلت، خواری، رسوائی ۳۵۱
خصم۔ نزاع، جھگڑا، جھگڑے کے طرفین۔ ۲۱۱
خطفۃ۔ کسی چیز کو جلدی اچک لینا۔ ۴۱
خلطاء۔ خلیط کی جمع ایک دوسرے سے مخلوط اشخاص۔ ۲۱۳
خول۔ مادہ "تخویل" عطا و بخشش ۳۹۲

د

داخر۔ "دخر" (بروزن "فخر") اور دخور کے معنی ذلت، حقارت ۴۹
دحورًا۔ مادہ "دحر" (بروزن "دہر") دھکیلنا، دور کرنا۔ ۴۰

ر

راغ۔ مادہ "روغ" بوسیدہ، توجہ میلان۔ ۹۸
رجیم۔ مادہ "رجم" سنگسار کرنا، نکالنا، بھگانا۔ ۲۸۰

ز

زاجرات۔ مادہ "زجر" بلند آواز سے ہانکنا، دھتکارنا، منع کرنا۔ ۳۳
زجرۃ۔ مادہ "زجر" دھتکارنا، بھگانا۔ ۴۹
زرع۔ کمزور تنے کا پودا ۳۲۹
زقوم۔ کڑوا، بدذائقہ، بدبودار پودا۔ ۲۸
زلفیٰ۔ مقام (بارگاہ الٰہی میں) قرب ۱۵۷

س

ساحۃ۔ گھر کا صحن، گھر کے اندر کی فضا۔ ۱۷۲
ساھمہ۔ مادہ "سہم" تیر ۹۱
سُرُر۔ سریر کی جمع محفل نشاط کے تخت۔ ۶۶
سواء۔ وسط، درمیان۔ ۷۲
سیق۔ مادہ "سوق" ہانکنا چلانا۔ ۴۳۶

ش

شقاق۔ مادہ "شق" شگاف ۱۳۲
شوب۔ وہ شے جو کسی دوسری شے سے مل جائے۔ ۸۱
شہاب۔ شعلہ ۴۱

ص

صافات۔ صافہ کی جمع، صف بستہ گروہ۔ ۳۳
صافنات۔ صافنہ کی جمع گھوڑے گھوڑیاں۔ ۲۳۰
صالی۔ مادہ "صلی" آگ جلانا، آگ میں داخل ہونا۔ ۱۶۳

صور۔ بروزن نور، صورت کی جمع ۳۷۰

ض

ضغث (بروزن حرص) مٹی بھر شاخیں ۲۴۷

ط

طبتم

مادہ "طیب" (بروزن صید) پاکیزگی

طرف۔ آنکھ کی پلکیں۔ نگاہ ۴۸، ۲۶۰

طلع۔ مادہ "طلوع" پہلا پھل کھجور کا شگوفہ ۸

ظ

ظلل۔ ظلۃ کی جمع، پردہ سائباں شامیانہ۔ ۳۲۷

ع

عدن۔ (بروزن عدل) ثبات و استقرار ۲۵۹

عزۃ۔ مادہ "عزاز" سخت محکم اور نفوذ ناپذیر زمین۔ ۱۸۶

عزتی۔ مادہ "عزت" غلبہ ۲۱۱

عوج۔ کجی، انحراف ۳۵۵

عین (بروزن مین) جمع عینار بڑی آنکھوں والی عورت۔ ۶۸

غ

غابر۔ مادہ "غبور" (بروزن عبور) کسی چیز کا باقی ماندہ حصہ قافلہ سے رہ جانے والا شخص غابر، باقی ماندہ خاک "غبار" پستان میں رہ جانے والا دودھ غبرۃ۔ ۱۳۸

غساق۔ مادہ "غسق" (بروزن رمق) تاریک رات۔ ۲۶۴

غلام۔ نوجوانی، بچپن اور بلوغت کا وسط، قرب بلوغت۔ ۱۱۰

غول۔ (بروزن قول) فساد ۶۷

ف

فائن۔ مادہ "فتنہ" اسم فاعل فتنہ گر گمراہ کرنے والا۔ ۱۶۳

فواق۔ دو مرتبہ دودھ دوہنے کا درمیانی فاصلہ۔ ۲۰۲

ق

قانت۔ مادہ "قنوت" خضوع کے ساتھ اطاعت گزاری۔ ۳۱۷

قِط۔ (بروزن جن) قطع کرنا ۲۰۳

ك

کاس۔ وہ ظرف جو پینے کی چیز سے بھرا ہوا ہو۔ ۶۶

کید۔ تدبیر ۱۰۵

ل

لا تقنطوا۔ قنوط اچھائی اور خیر سے مایوس ہونا۔ ۳۹۷

لازب۔ لازم ۴۵

لایتمعون۔ لایسمعون کے معنی میں ہے۔ ۴۰

م

مارد۔ مادہ "مرد" (بروزن سرد) سبزے سے خالی بلند زمین وہ ۳۸

مرد جو ہر قسم کی خیر و برکت سے عاری ہو ۳۸

متشاکسون۔ مادہ شکاسہ جھگڑا خصومت ۳۵۵

مثوٰی۔ مادہ "ثواء" دائمی قیام ہمیشگی دائمی۔ ۳۶۰

محراب۔ صدر مجلس نمایاں مقام معبد ۲۱۱

مدحض۔ مادہ "ادحاض" مغلوب کرنا۔ ۱۴۲

مدینون۔ مادہ "دین" جزا ۷۲

مرجا۔ مادہ "رحب" وسعت مکان (خوش آمدید) ۲۶۵

مستسلمون۔ مادہ استسلام سلامتی، سر تسلیم خم کرنا۔ ۵۴

مصطفین۔ مصطفٰے کی جمع برگزیدہ ۲۵۵

مطلعون۔ مادہ "اطلاع" سر اونچا کر کے جستجو کرنا۔ ۶۷

معین۔ مادہ معن (بروزن صحن) شراب طہور کے چشمے۔ ۶۶، ۶۷

مغتسل۔ نہانے کا پانی۔ ۲۴۶

مقالید۔ تقلید کی جمع چابی۔ ۴۱۵

مقتحم۔ مادہ "اقتحام" سخت اور خوفناک کام میں داخل ہونا۔ ۲۶۵

مقرنین۔ مادہ "قرن" مقاربت نزدیکی۔ ہاتھ پاؤں گردن کو زنجیر میں جمع کرنے کے معنی میں ہے۔ ۲۴۰

ملاء الاعلیٰ۔ فرشتے ۴۰

ملیم۔ مادہ "لوم" ملامت ۱۴۳

مناص۔ مادہ "نوس" پناہ گاہ، فریاد رس۔ ۱۸۷

منام۔ مادہ "نوم" نیند ۳۸۰

ن

نصب۔ بلاء مصیبت۔ ۲۴۴

نعجۃ، بھیڑ جنگلی یا پہاڑی بھیڑ کو بھی نعجہ کہتے ہیں۔ ۲۱۲

و

واصب۔ پرانی بیماریاں، دائم و مسلسل ۴۰

وقفوھم۔ مادہ "وقف" ٹھہرانا ۵۳

وکیل۔ کفیل، حافظ وغیرہ۔ ۴۱۴

ہ

ھدایت۔ مادہ "ہدیٰ" راہ مستقیم ۳۶۷

ی

یاحسرتا۔ مادہ "حسر" (بروزن حبس) پشیمانی برہنہ کرنا۔ ۴۰۵

یذفون۔ مادہ "زف" (بروزن کف) شتر مرغ کا تیز دوڑنا ۹۹

یقذفون۔ مادہ "قذف" پھینکنا تیر مارنا۔ ۴۰

ینابیع۔ مادہ "ینبع" ینبوع کی جمع زمین میں سے پانی کا جوش مارنا ۳۳۹

ینزفون۔ مادہ "نزف" (بروزن حذف) تدریجی صورت میں ختم کرنا۔ ۶۷

باقی رکھا۔ الیاس پر سلام ہو ۱۲۰ تا ۱۳۲

ان کی ہٹ دھرمی پر توجہ نہ دو

ان کے کام کو دیکھ، ایک روز وہ اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ ۱۷۳

اوّل المسلمین

آپؑ نہ صرف زمانے کے اعتبار سے پہلے مسلمان ہیں بلکہ ایمان، اخلاص، فداکاری، جہاد اور استقامت کے اعتبار سے بھی مسلم اوّل ہیں۔ ۳۲۶

اہلِ جنّت کی گفتگو

اہلِ جنت آپس میں گفتگو کریں گے پھر ایک ساتھی کا خیال آئے گا، جو جہنم میں ہے تو کہتا تھا ہم نہیں مریں گے ۵۰ تا ۵۷

اہل جنت کا دوزخیوں سے ربط

بہشتی جو اُوپر ہیں وہ اپنے سے نیچے کے جہنمیوں سے گفتگو کریں گے۔ ۵۴

اہم ترین مسئلہ! ہجرت

اگر دشمن کا دباؤ سخت ہو تو ہجرت کرو۔ اللہ کی زمین وسیع ہے۔ ۳۲۴

ایک آسمانی صیحہ کافی ہے

پہلی قوموں کی طرح جھٹلانے کا انجام عذاب ہے یا ایک آخری صیحہ کہ پھر پلٹنے کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ ۱۹۹ تا ۲۰۴

بدلہ تو صرف انجام عمل کا ملے گا

خدا انتقام جو نہیں ہے کہ اپنے پیغمبر کا بدلہ لے۔ بلکہ اعمالِ بد کی سزا ملے گی۔ ۶۲

بندگانِ خدا

طاغوت کی پیروی سے گریز، خدا کی طرف لوٹنا، بات غور سے سننا اچھی بات پر عمل کرنا۔ یہ ہدایت یافتہ اور عقل مند لوگ ہیں۔ ان کے لیے بشارت ہے۔ اہلِ تقویٰ جنت کے بالا خانوں میں۔ خدا کا وعدہ سچا ہے۔ ۳۳۰، ۳۳۲

بہت سے خداؤں کے بجائے ایک خدا

نئے نظریات کی بنا پر قریش کو توحید پر حیرت تھی۔ اسی وجہ سے انکار تھا ۱۹۰ تا ۱۹۴

پانی اور آگ اُس کے قبضہ میں ہے

نوحؑ کو پانی کے طوفان سے اور ابراہیمؑ کو آگ سے نجات دی۔ ۱۰۵، ۱۰۶

پراسرار نیند

نیند کے بارے میں دانش وران عالم کی

آرا اور فرمانِ خداوندی ۔ ۳۸۳

پرہیزگاروں کے لئے وعدہ
عمدہ مقام، باغاتِ بہشت، تکیہ دار تخت، قسم قسم کے پھل اور مشروبات، پاکیزہ بیویاں، دائمی رزق۔ ۲۵۸ تا ۲۶۱

پشیمانی بے کار ہے
عذابِ خدا کے سامنے گنہگار کی پشیمانی توبہ اور عمل صالح کے لیے دنیا میں واپسی کی آرزو۔ ۴۰۴ تا ۴۰۷

تقویٰ اور فجور ایک دوسرے کی ضد ہیں
تقویٰ انسان کے افرادی کمال اور فجور انسان کے انفرادی تنزل کی طرف اشارہ ہے۔ ۲۲۷، ۲۲۸

تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا
تم سب کو ایک نفس (آدم) سے پیدا کیا چوپاؤں کے آٹھ جوڑے پیدا کیے تمھیں بطنِ مادر میں تین پردوں کے اندر پیدا کیا، کفر کرو تو اللہ غنی ہے شکر کرو تو راضی ہے۔ وہ سینوں کے اندر کا راز جانتا ہے۔ ۳۰۸ تا ۳۱۲

تمہارے معبود مشکل حل کر سکتے ہیں
اگر خدا میرے لیے نقصان کا ارادہ کرے تو تمہارے معبود بچا سکتے ہیں یا مجھ پر نعمت نازل ہو اُسے روک سکتے ہیں ۳۷۴ تا ۳۷۷

توبہ کی راہ سب کے لیے کھلی ہے
گناہ کی زندگی ترک کر کے صدقِ دل سے توبہ کرے: رجوع الی اللہ اور اعمالِ صالح انجام دے۔ ۴۰۰، ۴۰۱

جنب اللہ میں کوتاہی
فرمانِ الٰہی کی بجا آوری، کتبِ آسمانی کی پیروی، انبیاء و اولیاء کی اقتداء میں کوتاہی پر مشتمل ہے۔ ۴۰۷، ۴۰۸

جہنم میں داخلہ
کافروں کو جہنم کی طرف ہنکایا جانا، درہائے جہنم کا کھلنا، فرشتوں کے سوالات، پھر جہنم میں داخلہ۔ ۴۳۵ تا ۴۳۸

جہنم میں مجرموں کی پذیرائی
کھانے کو بدذائقہ درخت (زقوم) اور پینے کو بدبودار پانی۔ ۷۷ تا ۸۱

جھوٹے دعوے

مشرکین کا یہ کہنا کہ ہم پر کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم مخلصین میں سے ہوتے — ۱۶۵،۱۶۲

چھ عظیم پیغمبرؑ

ابراہیم، اسحٰق، یعقوب علم و عمل کے کامل، اسماعیل، الیسع ذالکفل نیک لوگوں میں سے تھے۔ — ۲۵۷، ۲۵۳

چھوٹا سا شکست خوردہ لشکر

انھیں میری وحی کا یقین نہیں کیا قادر خدا کے خزانے ان کے پاس ہیں کہ جسے چاہیں دیں۔ آسمان پر چڑھ جائیں، نزول وحی کو روک دیں۔ — ۱۹۵ تا ۱۹۸

حبط اعمال

ایمان کے ساتھ دُنیا سے جانا قبولیت اعمال کے لیے شرط ہے۔ — ۴۲۲

"حج" ایک انسان ساز اہم عبادت

یہ عبادت حضرت ابراہیم و اسماعیل و ہاجرہ کی جدّوجہد اور جہاد کی گہری یاد سے وابستہ ہے۔ — ۱۲۱

حزب اللہ کامیاب ہے

اللہ نے پہلے سے مستحکم وعدہ کر لیا ہے کہ رسولوں کی مدد کرے گا، اللہ کی فوج ہی کامیاب ہوگی۔ — ۱۷۲-۱۶۷

حقیقت خسراں وزیاں

مال دنیا کا گنوا دینا، صحت و تندرستی کا ضائع ہونا، عقل و ایمان اور ثواب کا ضیاع خسران مبین ہے۔ — ۳۲۸

نہ صرف سرمایہ کھو دیا بلکہ اپنے لیے دردناک عذاب فراہم کر لیا۔ — ۳۲۹

خدا تمام گناہوں کو بخش دیگا

اپنے نفسوں پر ظلم اور اسراف کرنے والے رحمتِ خدا سے مایوس نہ ہوں خدا بخش دے گا۔ اس کی بارگاہ میں رجوع کرو، احکام کی پیروی کرو — ۲۹۶ تا ۴۰۰

خدا کافی ہے

قوی و قادر خدا کیا اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں؟ بندگان خدا بتوں سے خائف نہیں۔ — ۳۶۴ تا ۳۶۶

خدا کو اولاد کی ضرورت نہیں

وہ قادر مطلق ہے۔ زمین و آسمان کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ دن اور رات، سورج و چاند مدت معینہ تک اپنی حرکات جاری رکھتے ہوئے ہیں۔ — ۳۰۳ تا ۳۰۶

خدا کے نام سے گھبرانے والے

خدائے واحد کے نام سے کتراتے اور بتوں کے ذکر سے خوش ہوتے ہیں — ۳۸۶، ۳۸۷

خدا ہر چیز کا خالق ہے

تم بھی خدا کی مخلوق ہو اور یہ بت بھی جنھیں تم پوجتے ہو۔ (فرمان ابراہیمؑ) — ۱۰۷

خدا ہر چیز کا مالک و محافظ ہے

توحید خالقیت و توحید ربوبیت کی تشریح۔ عمل کی آزادی اعمال کی نسبت خدا کی طرف اور ہماری طرف ایک بحث۔ — ۴۱۳، ۴۱۵

داؤدؑ سے متعلق موجودہ توریت میں خرافاتی داستان

اور یاحتی کی بیوی پر عاشق ہونا اور اس کا حصول۔ — ۲۱۴ تا ۲۱۷

داؤد کی ایک آزمائش

شکایت کرنے والوں کا محراب کے اوپر سے آنا، شکایت، فیصلہ، توبہ و استغفار، قبولیت و مغفرت

داؤد کی زندگی سے سبق حاصل کرو

اے رسول مشرکین جو کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔ اور داؤد کے واقعات پر نظر رکھو۔ — ۲۰۵

دوزخ میں گمراہ پیشواؤں اور پیروکاروں کی گفتگو

ایک دوسرے پر الزام تراشیوں کی تفصیل۔ — ۵۳ تا ۵۶

دوزخیوں کی دشمنی

گمراہ سردار جن اہل جنت کو دنیا میں اشرار سمجھتے تھے۔ انھیں دوزخ میں تلاش کریں گے اور نہ پا کر خود کو مجرم سمجھیں گے۔ — ۲۶۷ تا ۲۶۸

دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے

خدا کے علاوہ اولیاء بنانا کہ ہمیں خدا سے نزدیک کردیں گے۔ خدا قیامت میں فیصلہ کردے گا۔ — ۲۹۶ تا ۳۰۲

ذبیح اللہ کون ہے

حضرت اسماعیل و اسحٰق کی قربانی کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف کی تفصیل۔ — ۱۱۶ تا ۱۱۸

روایات اسلامی سے نیند کی حقیقت

عالم ارواح کی طرف روح کی حرکت

کو نیند کہا گیا ہے، رُوح کی بدن میں واپسی حیات مجدد اور بیداری ہے۔ ۳۸۴

زمین پروردگار کے نور سے روشن ہوجائے گی

قیامت میں زمین کا روشن ہونا، مختلف تعبیرات، قیام قائم، عدالت، گواہ اور پیغمبروں کی حاضری۔ ۴۳۱ تا ۴۳۴

ستاروں بھری رات کی خوبصورتی

ستاروں کا ٹمٹمانا اور بلکیں جھپکانا۔ عشق الٰہی کے رازوں کو منکشف کرتا ہے۔ ۳۹

سرکشوں کی سزا

گمراہ اور ان کے پیروکاروں کا جہنم میں داخلہ، کھولتا ہوا پانی آگ کا بستر ہمیشہ کا ٹھکانا۔ ۲۶۵، ۲۶۶

سلیمان اپنی فوجی قوت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں

اعلیٰ نسل کے گھوڑوں سے رغبت، دیکھ کر خوش ہونا اور ان پر ہاتھ پھیرنا ۲۲۹ تا ۲۳۳

سلیمانؑ کا سخت امتحان اور وسیع حکومت

ترک اولیٰ، استغفار، وسیع حکومت، تسخیر ہوا، تسخیر جنات، پرندوں کی بولیاں سمجھنا وغیرہ۔ ۲۳۴، ۲۴۲

سنگین بوجھ والے

"وحشی" اور ایک کفن چور کی داستان پُر خلوص توبہ اور نجات۔ ۴۰۱ تا ۴۰۳

شرح صدر اور شقاوت قلب کے عوامل

خدا جس کی ہدایت چاہتا ہے سینہ کشادہ کرتا ہے۔ بعض فکر محدود ہوتی ہے۔ جو حقیقت سے متاثر نہیں ہوتی۔ ۳۴۲، ۳۴۴

شہاب ثاقب کا شیاطین کو بھگانا

جب شیاطین خبریں سننے کو آسمان کے قریب ہوتے ہیں تو شہاب پیچھا کرتے ہیں۔ ۴۱

شیطٰن کے نفوذ سے آسمان کی حفاظت

شیاطین کا آسمان کی طرف صعود کرنا اور فرشتوں کا شہاب کے ذریعہ پیچھا کرنا۔ ۴۰

شیطٰن کے وجود کا فلسفہ

تکامل کے لیے مقابلہ و مجاہدہ بعید

ضروری ہے۔ اس مقابلہ سے ایمان بخشہ ہوتا ہے۔ ۲۸۲ تا ۲۸۴

صبر ایوبؑ

اپنے رب کو پکارا، مجھے شیطان نے اذیت دی ہے۔ ٹھنڈے پانی کا چشمہ، قسم کے لیے سٹھی بھر شاخیں۔ ۲۴۳، ۲۵۰

صور اسرافیل کیا ہے کتنی مرتبہ پھونکا جائے گا

مسلمانوں کا عقیدہ دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ صور اسرافیل کی حقیقت پر ائمہ کے ارشادات۔ ۴۲۶ تا ۴۲۸

صور پھونکا جانا

صُور پھونکا جائے گا تو سب مر جائیں گے سوائے ان کے جنہیں خدا چاہے گا، دوسرے صُور پر سب زندہ ہو جائیں گے۔ ۴۲۵

عذاب اکبر

آخرت کا عذاب تو شدید ہے اگر وہ جانتے۔ ۲۵۰

عظیم پیغمبروں کی اوّاب کے لفظ سے توصیف

اپنے خدا سے رجوع و بازگشت "اوّاب" صیغۂ مبالغہ کے ساتھ سب سے بڑی توصیف۔ ۲۵۱-۲۵۲

غرور کی آگ سب کچھ جلا دیتی ہے

تکبر اور ہٹ دھرمی نے ہی شیطان کو تعرّذلت میں پھینک دیا۔ وہ شیطان نہیں پیدا کیا گیا تھا۔ ۲۸۴، ۲۸۵

قبیح تہمتیں

نعوذ باللہ! فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور جن شریک کار ہیں۔ ۱۵۳ تا ۱۶۰

قسم کھانے والی اشیاء

جن کی قسم کھائی گئی۔ وجوہات قسم کی تشریح۔ ۳۵

قلب سلیم

قلبِ سلیم تشریح ۹۴

قوم لوطؑ کی برباد سرزمین

ہم نے لوطؑ کے خاندان کو سوائے ایک بڑھیا کے نجات دی باقی

سب قوم کو تباہ کر دیا۔ ۱۳۷ تا ۱۳۹

کلام خدا کی تصدیق کرنیوالے

سچ بات سے انحراف، ظلم اور تصدیق ایمان، رسول پاک پر ایمان لانے والے صدیق اوّل۔ ۳۵۹، ۳۶۳

کیا دونوں نفخہ ناگہانی ہونگے

لوگ کاروبار میں مصروف ہوں گے پہلے نفخہ سے مر جائیں گے۔ دوسرے نفخہ کا وقوع سب کو زندہ کر دیگا دونوں ہی نفخہ اچانک ہوں گے۔ ۴۲۹، ۴۳۰

کیا روئے زمین کے سب افراد نوحؑ کی اولاد ہیں

مؤرخین کے مطابق ساری دُنیا کے لوگ، نوح کے بیٹوں سام، حام اور یافث کی اولاد ہیں۔ ۹۰، ۹۱

کیا عالم و جاہل برابر ہیں؟

مصیبت میں یادِ خدا، رفع مشکل پر خدا کو بھلانا، تو آخر جہنمی ہے، کوئی قدر و قیمت نہیں۔ جو اللہ سے ڈرتا ہے رحمت کا امیدوار ہے، علم والے اور جاہل برابر نہیں ہیں۔ ۳۱۴-۳۱۸

کیا مومنوں نے خدا کو پہچان لیا ہے

ایمان کے درجے ہیں، پہلے درجہ میں ہر مومن نے خدا کو بطور لاشریک پہچانا ہے۔ ۴۲۲، ۴۲۳

گزشتہ گمراہ اقوام

ان سے پہلے بہت لوگ گمراہ ہو گئے ۸۳

گمراہ پیشوا اور پیروکار

جب ان سے کہتے ہو کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ وہ تکبّر کرتے تھے۔ ۵۹

لُطف خدا کا ذکر

انسان حوادث کے سامنے تنکے کی مانند ہے۔ لیکن یہ تنکا اگر پہاڑ سے جڑ جائے تو پناہ مل جائے ۳۷۳

متقیوں کا ورود جنت

جنت کی طرف لے جانا۔ درجنت پر دو چشموں سے پانی پینا۔ باطن و ظاہر کا پاکیزہ ہونا، فرشتوں کا اشتیاق سے سلام و درود پڑھنا ورود جنت اور دائمی قیام۔ ۴۳۹ تا ۴۴۳

مفسرین کا اختلاف رائے

شان نزول آیات پر بحث ۷۴، ۷۵

موت اور نیند

موت اور نیند کے وقت ارواح قبض کی جاتی ہے، کچھ کو معینہ مدت کے لیے واپس کر دیا جاتا ہے۔ اس میں صاحبانِ فکر کے لیے واضح نشانیاں ہیں۔ ۳۷۸، ۳۸۲

موت سے مستثنیٰ افراد

چار معزز فرشتے! حاملان عرش اور ارواح شہداء۔ بالآخر سب مر جائیں گے۔ ۴۲۹

نعمات خداوندی حاصل کرنے کی کوشش

اپنی اس مختصر زندگی میں خدا کی خوشنودی و رضا حاصل کریں۔ ۷۵، ۷۶

وقت نجات گزر چکا

ہاں انسان کی بدبختی کا اصل سبب غفلت ہے۔ اب دیر ہو چکی۔ نجات کا وقت گزر گیا۔ ۱۸۳ تا ۱۸۷

ولایت علی کے بارے میں سوال ہو چکا

اس موضوع پر سنی شیعہ مفسرین و مورخین کے اعترافات۔ ۵۶، ۵۷

ہدایت و ضلالت خدا کی طرف سے ہے

ہدایت اللہ کا انعام اور ضلالت اعمال بد کی سزا ہے۔ مسئلہ جبر و اختیار، ہدایت و گمراہی کے اسباب اور بحث۔ ۳۰۷ تا ۳۷۲

ہر کام کے آخر میں غور و فکر

ہر محفل و مجلس کے اختتام پر کہے، سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون۔ اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرے۔ ۱۷۶، ۱۷۷

یونسؑ کی مختصر تاریخ

آپ کا لقب ذوالنون ہے۔ آپ عراق کے علاقہ نینوا میں ایک قوم پر مبعوث ہوئے۔ ۱۴۸

یہ آیات کس کے بارے میں ہیں

"الذین امنوا وعملوا

الصالحات" حضرت علیؑ اور مفسدین فی الارض ان کے دشمنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ (متعدد مفسرین) ۲۲۸

مقامات

بعلبک

بعل بمعنی بت اور بک بمعنی شہر یعنی بت والا شہر شام کی سرحد پر واقع لبنان کا حصہ ہے۔ ۱۳۱

زم زم

وہ چشمہ جو نوزائیدہ اسمٰعیل علیہ السلام کے پاؤں کے نیچے سے پھوٹا تھا ۱۲۲

مروہ

مکہ میں ایک پہاڑی ہے۔ صفا و مروہ کے درمیان حاجی سعی کرتے ہیں۔ ۱۲۲

صفاء

(دیکھیے مروہ) ۱۲۳

منیٰ

خشک اور جلا ڈالنے والے پہاڑوں کے درمیان ایک جگہ۔ ۱۱۳

منیٰ میں تکبیرات کا فلسفہ۔ ۱۲۰